

ایڈیٹر



پاکستان  
ایڈیٹر  
ایڈیٹر  
ایڈیٹر



FLAVORS &  
FRAGRANCES

More than  
1000 flavors  
available  
in market





## خلش

11

ایک ایسے شخص کی کہانی جو انسانی مخلوق ہوتے ہوئے کسی اور ستارے کی مخلوق تھا

## قیمت

50

ایک بے کس عورت کا احوال، اس کے پاس فروخت کرنے کے لیے کچھ بھی نہ بچا تھا

نیلیم خاتون

شاعر علی شاعر

## غرور کا سر نیچا

61

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ "غرور کا سر نیچا ہوتا ہے"

## بلا عنوان

65

ایک نئے لکھاری کے قلم سے ایک خوبصورت کہانی

اویس احمد پرویز

ایم اے راحت

## بے بدن

68

زندگی کے نا آسودہ خوابوں کی تعمیر ایک انوکھی آپ بیتی

## معبہ

101

انتقام کی آگ میں جھلنے والی روشیرہ کا قصہ جس کی زندگی کا مقصد صرف انتقام تھا

سنجیدہ خاتون

## مریم

140

ایک معصوم لڑکی کی داستان جو کسی سفاک کی ہوس کا شکار ہو گئی

## "ہین کو اکب کچھ"

146

ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ دیتے ہیں یہ باز مگر دھوکا کھلا

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

ایس امتیاز احمد

## بغیر اجازت

148

اُس یوم حساب کی کہانی جو بعض اوقات زمین ہی پر برپا ہو جاتا ہے۔ سمندر پار سے ہنری سلاسر کی ایک خوبصورت تحریر

## پیاسی آتما

153

بھٹکتی ہوئی آتما کی داستان جس کے مقتدر میں ہمیشہ بھٹکتا لکھا تھا

نوازش علی

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

## بھولی صورتوں کے کھوٹے

188

اس نوجوان کا قصہ جو اپنے ہی جال میں پھنس گیا تھا

## پناہ گاہ

191

تحریر تجسس اور سسپنس سے مھر پورنی سلیے وار کہانی

ڈاکٹر عبدالروب بھٹی



# رابطہ

قارئین کرام! السلام علیکم!

امید ہے کہ آپ سب لوگ بخیریت ہو گئے، اپریل کے مہینے میں پے در پے ہونے والے سانحات نے پورے ملک کی نفا کو سوگوار کر دیا۔ گیارہ سیکٹر میں برقی توانی توڑے تلے فوجی جوانوں کی زندگی کی امید کم سے کم ہوتی جا رہی ہے اور ان کے اہل خانہ شائد اب کسی معجزے کے منتظر ہیں۔ ابھی اس سانحے کے دلخراش اثرات ختم نہ ہوئے تھے کہ بھوجا ایرلائن کے حادثے نے 127 گھرانوں کے چراغ گل کر دیے۔ ذمہ داران حکومت کی غفلت و نااہلی کے باعث ہونے والے اس حادثے کی خبر سنتے ہی ملک کے طول و عرض میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی، سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس طرح کے حادثات دنیا کے دوسرے ممالک میں کیوں نہیں ہوتے؟ لیکن شائد ہم سوچتے ہی نہیں۔ بہر حال آدم برسر مطلب، بات کرتے ہیں رسالے کے مندرجات کی۔ آپ کے بھیجے گئے خطوط اور ان میں دیے گئے مشوروں کی روشنی میں ہم رسالے کے معیار کو مزید بہتر بنانے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس شمارے میں خاص طور پر چند کہانیاں منتخب کی گئی ہیں، امید ہے کہ یہ آپ کے ذوق مطالعہ پر پوری اتریں گی، انہیں پڑھیے اور ہاں ہمیں اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ آپ کی رائے کے منتظر

کھ افضل منگی حیدر آباد سے لکھتے ہیں۔

محترم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم۔ امید کرتا ہوں کہ آپ اور ادارے کے دیگر ارکان خیریت سے ہوں گے۔ اترسیاسی حالات اور پے در پے ہونے والے سانحات نے تو جیسے جیسے کی امنگ ہی چین لی ایسے میں اپنے پسندیدہ رسالے کا ملنا ہوا کے تازہ جھوٹے کی مانند تھا، اپریل کے شمارے میں ساری کہانیاں ہی بہترین تھیں، خاص طور پر شکاری بے حد حساس موضوع پر لکھی گئی کہانی تھی، جس نے قارئین کو یقیناً سوچنے پر مجبور کیا ہوگا۔ مستقل سلسلے کی کہانیاں معجلہ اور پیاسی آتما بھی پہلے سے بہتر ہو گئی ہیں، مختصر کہانیوں میں آئینہ اور نساء پسند آئیں۔ مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اگر میں آپ کو کوئی کہانی بھیجتا چاہوں تو اس کے لیے کیا طریقہ کار ہوگا، جواب ضرور دیجیے گا، اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

کھ شہزادہ خان کوہاٹ سے لکھتے ہیں۔

محترم و قابل احترام ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! اپریل کا شمارہ ملا، سب سے پہلے سلسلہ دار کہانیوں کی طرف لپکے، پیاسی آتما اور معجلہ دونوں ہی اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہیں جبکہ اس ماہ پناہ گاہ اپنی دلچسپی قائم نہ رکھ سکی، سرورق کی حسینہ ایک انوکھے روپ میں جلوہ گر تھی، شکر ہے کہ آپ نے سرورق پر بھی توجہ دی اور اب سرورق کا معیار خاصا بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ باقی اور کیا لکھوں، مختصر کہانیوں میں پروف ریڈر، آئینہ کچھ بہتر تھیں، جبکہ شہناز شورو کی لکھی ہوئی کہانی میں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آشنائی ہوئی۔ باقی کہانیاں بھی بہتر تھیں، آپ کی کہانی نساء

نے تو ہماری آنکھیں کھول دیں، واقعی دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔ اگلے شمارے کا بے چینی سے منتظر ہوں۔ اجازت چاہوں گا، اللہ حافظ۔

کھ ذیشان علی کراچی سے رقم طراز ہوئے ہیں۔

عزیز ایڈیٹر صاحب! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے، آپ اور آپ کا ادارہ ایک معیاری ماہنامے کو ہم تک پہنچانے کے لیے جتنی سعی و کوشش کر رہا ہے یقیناً اس کے لیے آپ سب مبارکباد کے مستحق ہیں، ایڈیٹر کا اپریل کا شمارہ کچھ دیر سے ملا، لیکن سرورق پر کئی حسینہ کی مسکراتی تصویر نے جیسے انتظار کی کوفت کا ازالہ کر دیا۔ امید کرتا ہوں کہ آپ کہانیوں کے ساتھ ساتھ سرورق کے معیار کو بھی بہتر کرتے رہیں گے، سب سے پہلے اپنی پسندیدہ کہانی پناہ گاہ پڑھی، کہانی بہت خوبصورتی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس ماہ معجلہ اور پیاسی آتما کی قطع بھی کافی بہتر تھی۔ دیگر کہانیوں میں گریملٹو، عظیم دوست بھی اچھی تھیں۔ لیکن شہناز شورو اور عبدالمعجود صدیقی کی کہانیوں نے تو جیسے ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بلاشبہ ایسی کہانیوں کے ذریعے آپ نے معاشرے کی چھپی ہوئی سچائیوں کو بے غائب کیا ہے، آئینہ زیادہ پسند نہیں آئی، پروف ریڈر بھی ایک اوسط درجے کی کہانی تھی، امید ہے کہ آپ کو میری تنقید ناگوار نہیں گزرے گی کیونکہ یہ تنقید بھی اپنے رسالے کو بہتر بنانے کے لیے ہی کی جاتی ہے، امید کرتا ہوں کہ ماہنامہ ایڈیٹر اسی طرح ہماری زندگیوں میں ایڈیٹر لائبریریاں بنے گا، آپ کا بہت وقت لے لیا اب اجازت چاہتا ہوں، اگلے شمارے کا انتظار رہے گا۔ خدا حافظ

کھ عرفان علی اسلام آباد سے لکھتے ہیں۔

عزیز ایڈیٹر! السلام علیکم۔ ماہنامہ ایڈیٹر کا پرانا قاری ہوں اور ہر مہینے خط کے ذریعے آپ سے آدمی ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔ اپریل کا شمارہ کچھ تاخیر سے ملا لیکن سرورق دیکھ کر سارا غصہ جاتا رہا۔ سلسلے دار کہانیاں اب کچھ دور ہوتی جا رہی ہیں البتہ اپریل کے مہینے میں شکاری بے حد پسند آئی، مختصر کہانیوں میں عظیم دوست، آئینہ، نساء نے بھی خوب رنگ جمایا جبکہ پروف ریڈر کا موضوع کوکہ پرانا تھا لیکن کہانی دلچسپ ہوائے میں لکھی گئی تھی، پیاسی آتما اور معجلہ میں کوئی نیا پن محسوس نہیں ہوا، یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ کہانیاں اب یکسانیت کا شکار ہوتی جا رہی ہیں۔ میرا ایک مشورہ ہے کہ آپ ہر ماہ کوئی فصاحت آموز کہانی بھی شائع کیا کریں۔ اس سے قارئین کی دلچسپی میں حریف اضافہ ہوگا، میرا خیال ہے کہ میں نے تفصیلی تبصرہ کر دیا ہے، امید ہے کہ آپ میرے مشوروں پر غور کریں گے، اگلے مہینے کے شمارے میں اپنے جواب کا شکر رہوں گا۔

کھ شہروز خان ایبٹ آباد سے لکھتے ہیں۔

قابل احترام ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ کوکہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے خطوط کی محفل میں کبھی کبھار ہی شرکت کر پاتا ہوں، لیکن ایڈیٹر کا قاعدگی سے پڑھتا ہوں، اپنی مصروفیت کے باعث ابھی تک اپریل کے شمارے کو مکمل طور پر نہیں پڑھ پایا۔ لیکن مختصر کہانیوں میں آئینہ، نساء اور واقعہ بے حد پسند آئیں تینوں ہی کہانیاں ہمارے آج کے معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کر رہی تھیں، ہم میں سے ہر ایک کی زندگی میں واقعہ جیسا کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور پیش آیا ہے اور یہی شائد ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ ہے، خیر ہم بات کر رہے تھے ایڈیٹر کی، سرورق کا معیار تو اب خاصا بہتر ہو گیا ہے لیکن کہانیوں کے معیار کی طرف توجہ دینے



# خلافت

## شہاب شیخ

ایک ایک ایسے شخص کی کہانی جو انسانی مخلوق ہوتے ہوئے کسی اور ستارے کی مخلوق تھا

کی ضرورت ہے، مستقل سلسلے معجلہ اور پیاسی آتما یکسانیت کا شکار ہو رہے ہیں، لیکن اس سب کے باوجود ایڈوئجر سے ہمارا ناٹھ برقرار ہے، دعا گو ہوں کہ ہمارا پسندیدہ رسالہ کامیابی اور کامرانی کی نئی منزلیں سر کرے، اگلے شمارے کا بے چینی سے منتظر ہوں۔

کچھ زاہد بنت جہلم سے لکھتے ہیں۔

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! اسلام علیکم۔ اپریل کا شمارہ کافی تاخیر سے موصول ہوا، لیکن سرورق پر نظر پڑتے ہی انتظار کی ساری کوفت کا خاتمہ ہو گیا، سب سے پہلے سلسلہ دار کہانیاں پناہ گاہ اور معجلہ پڑھیں، دونوں کہانیاں بہت خوبصورتی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ محمد یعقوب بھٹی کی کہانی شکاری میں اس مرتبہ جس جرم کی نشاندہی کی گئی ہے واقعی وہ ایک بھیا تک جرم ہے اور اس کے لیے جو بھی سزا دی جائے وہ کم ہے، مختصر کہانیوں میں آئینہ نساء، عظیم دوست اور جیت بے حد پسند آئیں۔ صالحہ کریم کے سننے کا رتاے کا بے چینی سے انتظار ہے، امید ہے کہ آپ میری درخواست پر غور کریں گے، باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں اس لیے ان پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں، مجموعی طور پر رسالے کا معیار پہلے سے بہتر ہوتا جا رہا ہے، امید کرتا ہوں کہ آپ آئندہ شماروں میں بھی اس معیار کو برقرار رکھیں گے۔ آپ کا خیر اندیش۔

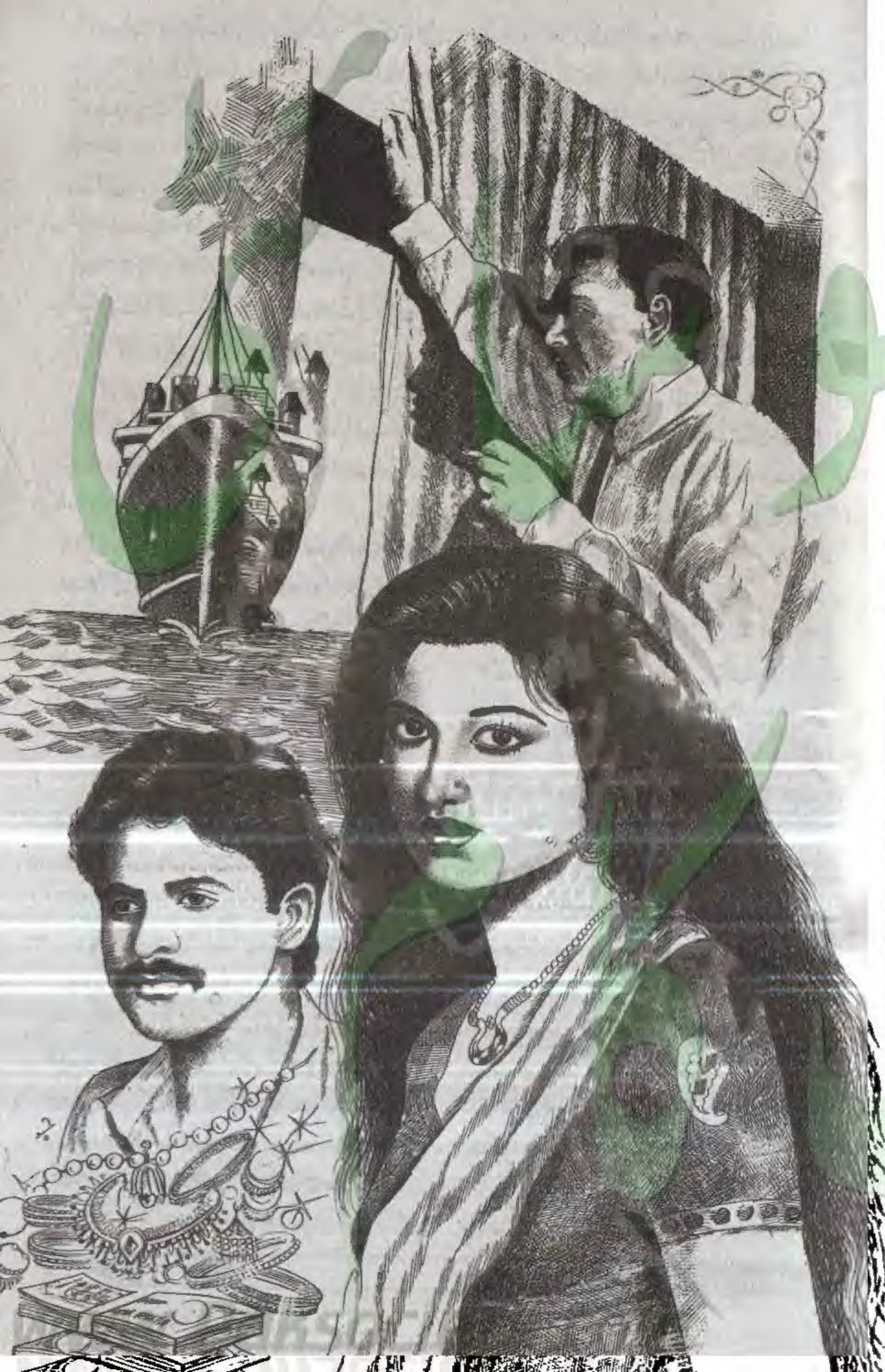
کچھ عدیل لغاری کراچی سے لکھتے ہیں۔

محترم جناب ایڈیٹر صاحب! اسلام علیکم۔ ایڈوئجر کا پرانا ساتھی ہوں لیکن آج سے پہلے کبھی خط لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، کراچی شہر کے حالات تو جوں کے توں ہیں، شہر کی فضا میں خوف و ہراس چھایا رہا، ایسے میں اپنے پسندیدہ ماہنامے کو پا کر بے اندازہ خوشی ہوئی، سرورق پر دلکش اور طرہ دار حسینہ کی حکمرانی تھی، سرورق سے آگے بڑھے تو سب سے پہلے مستقل کہانیوں کی طرف چھلانگ لگائی۔ پیاسی آتما ہوں یا معجلہ اور پناہ گاہ تینوں ہی اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہیں خصوصاً معجلہ کی اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے، صالحہ کریم کا کوئی کارنامہ آپ نے کافی عرصے سے شائع نہیں کیا، ان کی غیر حاضری کچھ لمبی ہو گئی ہے۔ مختصر کہانیوں میں ابھی تک صرف گریملٹو، عظیم دوست اور پردف ریڈر نظر سے گزری ہیں لیکن لیے باقی کہانیوں پر تبصرہ کرے گا۔ قاصر ہوں، ایڈوئجر کا معیار اب پہلے سے کافی بہتر ہو گیا ہے، امید کرتا ہوں کہ رسالے کا یہ معیار قائم رہے گا۔ اگلے شمارے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ اللہ حافظ

یہ تھے قارئین کے خطوط اب اگلے ماہ تک کے لیے اجازت

فہمیدہ





شہاب شیع

اس مصور کی کہانی جو ایک مصورہ سے جلیں تھا۔  
اس مصورہ کی کہانی جو کسی اور ستارہ کی  
مخلوق تھی۔  
وہ مصورہ اسے بھی اپنے ستارہ کی مخلوق بنانے پر نہ  
صرف بضد تھی بلکہ وہ اسے  
اپنے ستارے سے لینے کے لیے زمین پر اتری تھی۔  
سائنس فکشن پڑھنے والوں کے لیے تحفہ خاص۔

ایک ایسے شخص کی کہانی جو انسانی مخلوق ہوتے ہوئے کسی اور ستارے کی مخلوق تھا

”ہوں۔“ میں نے نفرت سے سر جھٹکا۔ ”میڈیا اس کو  
خواہ خواہ چار ہا ہے۔“

”جی ہاں سہ!“ کلکشن نے میری ہاں میں ہاں ملائے  
ہوئے کہا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ ایک پوری لابی اسے  
اشکبلاش کرنے کے لیے سرگرم ہے۔“

”ہاں بالکل۔“ میں نے ورق پلٹتے ہوئے کہا۔ یہ  
امریکہ اور یورپ کی پالیسی ہے کہ وہ اپنی ہر چیز کو دنیا بھر  
کے سامنے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔“

”یہ تو بالکل درست بات ہے سہ!۔۔۔۔۔ واقعی یہ ان کی  
پالیسی ہے۔ اب یہ جو لیٹ کا معاملہ ہی دیکھ لیں! حالاں  
کہ یہ کوئی ایسی خاص تصویریں نہیں بنا رہی ہے بس عام سی  
ہیں لیکن اسے اتنا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے اور اس  
میگزین نے تو انتہائی کردی ہے یعنی یہ کہہ دیا کہ اس نے  
کچھ ہی عرصے میں دنیا بھر کے مصوروں کو پیچھے چھوڑ دیا  
ہے۔“ کلکشن بولا۔

”جاؤ۔۔۔۔۔ ایک ہول نکال لاؤ فریج میں سے۔“ میں  
نے اُس سے کہا۔

”یس سہ!“ کیا کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔  
میں میگزین میں جو لیٹ کا مضمون پڑھنے لگا۔ ویسے تو  
میں بظاہر پروفیشنل جیلیسی کی وجہ سے اُس کے خلاف  
ریماڈکس دیتا رہتا تھا لیکن درحقیقت میں اُس سے بہت

دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے اپنے سامنے موجود  
زیر تکمیل تصویر پر سے نظریں ہٹائے بغیر ”یس“ کہا۔  
ذرا ہی دیر بعد میرا سیکریٹری کلکشن کھٹکھٹاتا ہوا اندر  
آ گیا۔ میں نے اب بھی اس پر نظریں نہیں ڈالیں اور  
تصویر پر برش چلاتا رہا۔ وہ میرے قریب آن کھڑا ہوا۔  
”کیا بات ہے؟“ میں نے بدستور اپنے کام پر نظریں  
رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”سہ! یہ نیویارک کا ایک اور میگزین میرے ہاتھ آیا ہے  
اس میں بھی جو لیٹ کی تصاویر اور اس کے بارے میں  
بہت کچھ شائع ہوا ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ میں نے  
جو لیٹ کے نام پر ہاتھ روک کر اُس کی جانب دیکھا اور  
اُس نے ہاتھ میں موجود میگزین پر ناگواری سے نظریں  
ڈالیں۔ ناگواری کی وجہ یہ تھی کہ میں جو لیٹ نامی اس  
مصورہ کو پسند نہیں کرتا تھا اور میری ناپسندیدگی کی وجہ  
پروفیشنل جیلیسی تھی۔

میں نے ایزل اور برش قریب ہی موجود اسٹول پر رکھ  
دئے اور کلکشن کے ہاتھ سے میگزین لے کر اُس کے  
ٹائٹل پر نظر ڈالی۔ دیگر موضوعات کے علاوہ جو لیٹ کی  
تصویر بھی لگائی گئی تھی اور اُس کے بارے میں لکھا تھا۔  
”کچھ ہی عرصے میں دنیا بھر کے مصوروں کو پیچھے چھوڑ  
دینے والی مصورہ۔“



مرعوب تھا۔ اس کی تصاویر میں واقعی ایسی کشش تھی جو اپنی جانب متوجہ کر لیتی تھی۔ میں نے اس کی تصویروں کا بہت غور سے جائزہ بھی لیا تھا کہ آخر ان میں ایسی کون سی خاصیت ہے جو لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے۔ میں نے اُس کے رنگوں کے انتخاب اُس کے اینگلس کے موضوعات کے انتخاب اور نہ جانے کس کس پہلو سے غور کیا تھا لیکن میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ آخر وہ کیا وجہ ہے۔ حتیٰ کہ میں نے اُسی کے انداز میں تصاویر بنانے کی کوشش بھی کی تھی لیکن ان میں وہ کشش پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد لکشمین میرے لیے دہسکی کی بوتل لے کر آ گیا۔ اسٹول پر میرا گلاس رکھا ہوا تھا اُس نے اُس میں تھوڑی سی دہسکی انڈیل دی اور بوتل کا منہ بند کر کے اُسے بھی اسٹول پر رکھ دیا۔

میں نے میگزین نیچے قالین پر رکھ دیا اور اسٹول پر سے دہسکی کا گلاس اٹھانے کے بعد دو گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے کے بعد میں نے سر اٹھا کر لکشمین کی طرف دیکھا جواب تک کھڑا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ ہی پڑے اسٹول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

وہ بیٹھ گیا۔ میں نے دہسکی کا ایک اور گھونٹ لینے کے بعد اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”آج میں تمہارے سامنے ایک حقیقت کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیسی حقیقت سر؟“ لکشمین کچھ پریشان ہو کر جلدی سے بولا۔

”دیکھو!..... میں نے محسوس کیا ہے کہ میں اندر سے ایک سچا فنکار ہوں اور جو اس طرح کا سچا فنکار ہوتا ہے وہ شاید دوسرے کسی فنکار کی یعنی اپنے سے زیادہ اچھے فنکار کی زیادہ دیر مخالفت نہیں کر سکتا اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس کا ضمیر اسے چین نہیں لینے دیتا میرا بھی یہی حال ہے۔ میں نے اب تک جولیٹ کی بہت مخالفت کی اور اب بھی میں

چاہتا تھا کہ اُس کی مخالفت کرتا رہوں لیکن اب میں نے سوچا ہے کہ نہیں..... مجھے اُس کی صلاحیتوں کو تسلیم کر لینا چاہیے اور میں یہی اعتراف تمہارے سامنے کر رہا ہوں کہ میں اُسے ایک بڑی مصورہ تسلیم کرتا ہوں۔“

میری باتیں سن کر لکشمین کے چہرے پر الجھن اور بے یقینی کے تاثرات پھیل گئے تھے۔ وہ مردہ سی آواز میں بولا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں لکشمین؟“ میں نے جولیٹ کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ ”جولیٹ میں واقعی کوئی ایسی بات ضرور ہے جس کی وجہ سے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تم نے دیکھا کہ میں نے اُسی کی طرح کی تصویریں بنائیں لیکن ان میں وہ بات نہ آ سکی جو جولیٹ کی تصویروں میں ہوتی ہیں۔ واقعی..... واقعی اس کی تصویروں میں ایسی کشش ہے کہ جو لوگوں کو متاثر کر دیتی ہے۔ اچھا تم خود ہی سچے دل کے ساتھ بتاؤ کہ کیا تم اس سے متاثر نہیں ہو؟“ میں نے اُس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ کچھ پریشان ہو گیا اور جھپٹتے ہوئے بولا۔

”یہ..... یہ بات تو درست ہے سر!..... اس کی تصویروں میں کوئی کشش ہے جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔“

”ہاں دیکھنا..... تم بھی اپنے دل میں اُس سے متاثر ہو..... ہم دونوں ہی اب تک خواہ مخواہ اس کی مخالفت کرتے رہے ہیں لیکن چلو خیر..... یہ اچھا ہی ہے کہ آج ہم نے اس کی مخالفت ترک کر دی ہے اس کا

سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ اب ہم اس کے مثبت پہلوؤں پر بات کیا کریں گے اور اس طرح کی گفتگو سے کسی نہ کسی طور اچھے نتائج ہی حاصل ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”جی ہاں سر!..... یہ بات تو ہے۔“ اس نے حسبِ عادت میری تائید کی۔

میں نے گلاس میں موجود ساری دہسکی حلق میں اٹھیلنے کے بعد گلاس اسٹول پر رکھ دیا پھر ایزل اور برش اٹھا کر میں ایک بار پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جولیٹ کا نام گزشتہ چھ ماہ قبل منظر عام پر آیا تھا۔ اُس وقت امریکہ کے ایک اخبار نے اس کا تعریفی مضمون شائع کیا تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ اخبار نے کسی وجہ سے بڑھا چڑھا کر اُس کی تعریفیں کی ہیں لیکن بعد میں تو آئے دن دنیا بھر کے اخبارات و جرائد میں اس کی تعریفیں جھپٹے لگیں اور یوں مجھے اس سے جیسی ہونے لگی۔ لکشمین گزشتہ سات سال سے میرے سیکریری کے فرائض انجام دے رہا ہے اس لیے وہ بھی مجھے خوش رکھنے کے لیے جولیٹ کے خلاف بولتا رہتا تھا جب کہ آج اس نے بھی یہ قبول کر لیا تھا کہ وہ بھی جولیٹ کے کام سے متاثر ہے۔

☆

ایک ماہ گزر گیا۔ یہ مہینہ لکشمین اور میں نے جولیٹ کو سراہتے ہوئے گزارا تھا۔ ادھر جولیٹ کامیابیوں کے جھنڈے کا ڈر رہی تھی۔

اس وقت میں اسٹینڈ پر کینوس سیٹ کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ”ہیں“ کہا تو لکشمین دروازہ کھول کر آ گیا۔ میں نے حسبِ عادت اس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ میرے قریب آ کر بولا۔

”سر!..... ایک اہم اطلاع ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”یہ دیکھئے!..... اس اخبار میں لکھا ہے کہ جولیٹ اگلے ہفتے انڈیا کا دورہ کر رہی ہے۔“ اُس نے اخبار میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میرے لیے اُس کی بات بہت اہم تھی اس لیے میں نے فوراً اس سے اخبار لے لیا اور اسے اپنی نظروں کے سامنے کر لیا۔ لکشمین نے اس پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ دیکھیں..... یہ رہی وہ خبر۔“

میں نے خبر پر نظر ڈالی۔ پھر اخبار اُسے واپس کرتے

ہوئے کہا۔ ”یہ تو بہت اہم خبر ہے میں اُس سے ضرور ملاقات کروں گا۔“

”مجھے بھی اس سے ملنے کا بہت اشتیاق ہو گیا ہے سر!“ وہ بولا۔

”ہاں ہاں میں تمہاری ملاقات بھی کرواؤں گا۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”بس تم اب اخبارات پر پوری طرح نظر رکھنا۔ وہ کب پہنچ رہی ہے۔ کہاں کہاں قیام کرے گی اور کہاں کہاں اس کی ایگزیٹیشنز لگیں گی۔“

”آپ فکر نہ کریں سر!“ وہ بولا۔ ”میں پوری طرح نظر رکھوں گا۔“

☆

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران ہمیں اخبارات کے ذریعے پتہ چلتا رہا تھا کہ جولیٹ کہاں کہاں قیام کرے گی۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ وہ ہمارے شہر دہلی بھی ضرور آئے گی کیوں کہ انڈیا کے اس اہم اور بڑے شہر میں اگر وہ نہ آئی تو اُس کے دورے کو نامکمل ہی کہا جاتا جس مجھے یہ فکر تھی کہ وہ یہاں کس تاریخ کو قیام کرے گی اور یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ دس دسمبر کو یہاں آئے گی اور یہاں اس کا قیام دو دن کے لیے ہوگا۔ اس دوران شہر کی معروف آرٹ گیلریز میں اُس کی تصاویر کی نمائش بھی ہوگی۔

آج دسمبر کی دس تاریخ تھی۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ میں گھر میں ناشتہ کر رہا تھا۔ میں جب سے اٹھا تھا۔ بہت بے چین تھا۔ آج جولیٹ نے دہلی پہنچنا تھا۔ میرا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ میں اُسے ریسیو کرنے ایئر پورٹ جاؤں لیکن میں اس میں اپنی ہنک محسوس کر رہا تھا کیوں کہ میں بھی اپنے ملک کا ایک بڑا مصور تھا اور میرا ایک اہم مقام تھا اُسے ریسیو کرنے کے لیے جانے کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اُسے خود سے بڑا تسلیم کر لیا۔ میڈیا والوں سے میں بہت خوف زدہ رہتا تھا کیوں کہ وہ لوگ خبر کی تلاش میں رہتے تھے۔ اکثر اخبار والے مجھے پچھانتے تھے۔ وہ اگر مجھ سے ایئر پورٹ آنے کا مقصد پوچھتے اور



میں کوئی بھی جواب دیتا لیکن مجھے غصہ تھا کہ کوئی بھی اختیار والا میرے متعلق کوئی بھی خبر شائع کر سکتا ہے۔

”کر لیا آپ نے ناشتہ؟“ میری چچی رادھا نے میرے پاس آ کر اپنے روایتی سخت لہجے میں مجھ سے کہا۔

”کیوں! تمہیں کیا تکلیف ہے؟“ میں نے بھی اپنا خاص جارحانہ انداز اختیار کیا۔

”کچھ سامان لانا ہے بازار سے۔“ وہ بولی۔

”تو کیا میں لاؤں گا؟“ میں نے تک کر کہا۔

”ہاں!۔۔۔ آج شلیپا چھٹی پر۔ تم ہی جاؤ گے۔“ وہ بولی۔ شلیپا ہماری ملازمہ کا نام تھا۔

”تم خود جاؤ میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ میں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ایسا کون سا ضروری کام ہے؟“ وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

”یہ بتانا ضروری نہیں ہے اور تم بک بک نہ کرو۔ سیدھی طرح یہاں سے چلی جاؤ۔“ میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔

”کالی چھوڑ دو کچھ ہلچے چلنے کا کام بھی کر لیا کرو۔“ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ”دن رات تصویریں ہی بتاتے رہتے ہو اس کے علاوہ بھی کوئی کام آتا ہے تمہیں؟“

”میں نے کہا تھا تم سے کہ یہاں سے چلی جاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ فوراً یہاں سے نکلو ورنہ یہ چائے کا کپ تمہارے سر پر دے ماروں گا۔“ میں نے کپ ذرا اوپر کرتے ہوئے کہا۔

”پتہ نہیں کون سی بڑی گھڑی تھی جب میں تمہارے پلے باغ دی گئی تھی۔“ اس نے کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

میری شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے لیکن ابھی تک ہمارے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ رادھا اور میں نے میڈیکل چیک اپ کر دیا تھا اور ہم دونوں ہی فٹ تھے لیکن شاید بھگوان ہی کی مرضی تھی کہ اس نے اب تک ہمیں

اولاد سے محروم رکھا تھا۔

میں ناشتہ کرنے کے بعد اٹھا اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارنے لگا۔ ساتھ ہی میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس وقت رادھا آ کر مجھے دیکھ لے تو میرے اس انہماک سے بال سنوارنے پر ایک لمبی چوڑی تقریر کر ڈالے گی۔

میں نے کمرے سے باہر آ کر دیکھا رادھا لان میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ میں مین گیٹ کی طرف بڑھا اور پھر رادھا کے قریب سے گزرتے ہوئے رک کر اس سے بولا۔ ”میں جارہا ہوں دروازہ بند کر لو۔“

”جاؤ کر لوں گی۔“ وہ زبردستی لہجے میں بولی۔

”میں چل پڑا اور پھر میں کمرے سے باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

میں اپنے اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ حسب معمول لکشن پہلے سے وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مسکنا کر بولا۔ ”سر!۔۔۔ تو آج وہ دن آئی کیا جس کا ہمیں بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔“

”ہاں۔۔۔ آج وہ آ رہی ہے۔“ میں نے بھی مسکرا کر کہا۔

لکشن اور میں چلتے ہوئے روم میں آ گئے۔

”سر!۔۔۔ کیا پتا پسند کریں گے؟“ لکشن نے مجھ سے کہا۔ وہ روز ہی میرے آنے پر مجھ سے یہ سوال کرتا تھا اور میں اپنے موڈ کے حساب سے اسے جواب دیتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”میں آج ویسے ہی بہت خوش اور پر جوش ہوں اس لیے وہ سبکی کی ضرورت نہیں ہے اور ویسے ہی میں آج نہیں پینا چاہتا کیوں کہ جب میں پیتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں صرف چمچ ہی رہوں ایسے میں میں زیادہ سے زیادہ تصویر بنائی بنا سکتا ہوں اس لیے شراب تو نہیں پیوں گا ہاں تم کتنے آؤ۔“

”او کے سر!۔۔۔ ابھی لے کر آتا ہوں۔“ وہ روم سے

باہر چلا گیا اور میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے جیب سے سگار اور لائٹر نکال کر سگار سلگا لیا اور لائٹر کو آہستہ آہستہ اچھالنے لگا۔

کچھ دیر بعد لکشن کافی لے کر آ گیا اور صوفے پر بیٹھ کر اس نے فرے سینئر ٹیبل پر رکھ دی اور ٹرے میں سے ایک سگار اٹھا کر مجھے تمنا دیا۔

”آج ہم شام پانچ بجے یہاں سے نکل جائیں گے۔ جولیٹ کی انگریزی ٹیشن سات بجے ہونا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ ہم جلد ہی وہاں پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔“ میں نے لکشن سے کہا۔

”ٹھیک ہے سر! جیسی آپ کی مرضی۔“ وہ بولا۔

☆

شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں اور لکشن اپنی کار سے اترنے کے بعد آرٹ گیلری کے اندر پہنچ گئے۔ یہاں کافی کہا گیا تھی۔

”ارے پرکاش!۔۔۔ کیسے ہو بھئی؟“ میرے ایک مصور دوست شری کانت نے تیزی سے میری طرف آتے ہوئے کہا اور پھر مجھ سے اور لکشن سے ہاتھ ملانے کے بعد بولا۔ ”مجھے تو جولیٹ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی اسی لیے وقت سے بہت پہلے یہاں آ گیا ہوں۔“

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم بھی اسی بیماری کا شکار ہو جس کا میں ہوں یعنی جولیٹ سے ملنے کے اشتیاق کی بیماری۔“

شری کانت نے بھی قہقہہ لگایا اور ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”آؤ۔۔۔ وہاں کیفے ٹیریا میں بیٹھتے ہیں ابھی قریب شروع ہونے میں کافی دیر ہے۔“

ہم لوگ کیفے ٹیریا میں آ کر بیٹھ گئے۔ شری کانت نے کولڈ ڈرنک اور سو سے منگوا لیے۔

”یار شری کانت!۔۔۔ میں نے تو جولیٹ کی تصویروں میں عجیب سی کشش محسوس کی ہے اور میں یہ کہنے میں کوئی مار محسوس نہیں کرتا کہ میں اس کا فین ہوں۔“ میں نے

کہا۔

”بالکل یہی جذبات میرے بھی ہیں۔“ شری کانت بلا توقف بولا اور اسٹرا ہونٹوں میں دہالی۔

”ایک بات پوچھوں تم سے؟“ میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”ہاں ہاں پوچھو؟“ وہ بھوس بھوس کر بولا۔

”یہ بتاؤ کہ۔۔۔ جولیٹ کی تصویروں میں وہ کون سی خوبی ہے کون سی خاصیت ہے جو لوگوں کو متاثر کر دیتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ذرا سوچنے کے بعد بولا۔ ”بج بتاؤں تمہیں؟“

”ہاں۔۔۔ بتاؤ؟“

”میں اب تک وہ راز نہیں پاسکا ہوں۔“

میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور بولا۔ ”یہی میرا حال ہے۔ میں نے پہلے تو اس کی تصویروں کو غور سے دیکھا اور ان میں اس خاصیت کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور جب کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا تو میں نے اس کی کاپی کی بالکل وہی کراستمال کیے۔ وہی اینگلو رکھے لیکن وہ کشش نہ پیدا ہو سکی جو جولیٹ کی تصویروں میں ہوتی ہے اور اب تم بھی بتا رہے ہو کہ تم بھی اس راز کو نہیں پاسکتے ہو۔“

”ہاں بالکل۔“ شری کانت بولا۔ ”جو کچھ تم نے کیا میں نے بھی وہی کچھ کیا لیکن میری تصویروں میں بھی جولیٹ کی تصویروں والی کشش نہ آ سکی۔ اس کی تصویروں میں تو جیسے کوئی جادو ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے پیٹ کے ہوئے لوگ ابھی بول پڑیں گے اور اس کا بنایا ہوا منظر زندہ ہو جائے گا۔“

”اور میں اس سے یہ راز پوچھ کر رہوں گا۔“ میں نے کہا۔

”وہ کہاں بتائے گی؟۔۔۔ بھلا کوئی آرٹسٹ اپنا راز دیتا ہے؟“ شری کانت بولا۔

”کچھ بھی ہو جائے میں اس سے یہ راز معلوم کر کے



رہوں گا۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا۔  
 "کیا زبردستی کرو گے؟" شری کانت طہریہ انداز میں  
 ہنس کر بولا۔

"میں اپنی ہی پوری کوشش کروں گا۔"  
 "اسکی ہر کوشش ناکام ہوگی۔"  
 "دیکھا جائے گا۔"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔" شری کانت نے بوسٹل ٹیبل  
 پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ اس مرتبہ تم دعویٰ کی انگری  
 بیشن میں حصہ لو گے؟"

"نہیں بتاؤں۔۔۔۔۔ جب سے میں نے جولیٹ کا اثر قبول  
 کیا ہے تب سے میرا تودل ہی نہیں کرتا تصویریں بنانے  
 کو۔۔۔۔۔ یہ میرا ایک نفسیاتی مسئلہ ہے یعنی میں نے کسی کو  
 اپنے سے بڑا آرٹسٹ تسلیم کر لیا ہے گویا اپنی شکست تسلیم  
 کر لی ہے اور جو شخص شکست تسلیم کرے تم خود سوچو کہ  
 اس کا کیلئے کو کیا دل کرے گا؟" میں نے کہا۔

وہ خفیف مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "تم کچھ مایوس  
 مایوس سے دکھائی دے رہے ہو؟"

"ہاں۔۔۔۔۔ کچھ نہیں بلکہ میں تو بالکل ہی مایوس ہو گیا  
 ہوں۔ جولیٹ کے ایسے سحر انگیز فن پارے دیکھنے کے بعد  
 تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے زندگی بھر جھک ماری  
 ہے۔" میں نے کہا۔

"ارے نہیں یار! وہ کوٹ کی سائینڈ میں ہاتھ ڈالتے  
 ہوئے بولا۔ "اسکی بات نہیں ہے۔ اگر کوئی اچھی تصویریں  
 بنالے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی دوسرا اچھی  
 تصویریں بن نہیں سکتا۔ تم بھی جہت اپنی تصویریں بناتے  
 ہو تمہارے بھی بہت چاہئے۔" میں نے کہا۔

"ہیں نہیں تھے۔۔۔۔۔ وہ سب جولیٹ کے فن بن  
 چکے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ادھو۔" اس نے وہ سگریٹ منہ سے نکال لیا جو اس  
 نے ابھی ابھی ہونٹوں میں دبایا تھا۔ "تم تو جولیٹ سے  
 کچھ زیادہ ہی متاثر ہوئے ہو بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تمہیں

جولیٹ فوہیا ہو گیا ہے۔"

میں دھیرے سے ہنس دیا اور اس نے سگریٹ ہونٹوں  
 میں دبا کر سلگ لیا۔ پھر وہ ناک اور منہ سے دھواں اگلے  
 ہوئے بولا۔ "میرے یار!۔۔۔۔۔ مان لیا کہ جولیٹ بہت  
 اچھی تصویریں بناتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ  
 ہم اُسے اپنے حواس پر سوار کر لیں۔ میں بھی اس سے متاثر  
 ہوں لیکن میں نے اُسے اپنے حواس پر طاری نہیں کیا ہاں  
 یہ ارادہ ضرور کیا ہے کہ آج نہیں تو کل اس سے اچھی  
 تصویریں بنادوں گا۔"

"نہیں بنا سکتے۔" میں نے بلاتوقف کہا۔

"کیوں؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف  
 دیکھا۔

"اس لیے کہ تم اُس جیسی کشش نہیں لاسکو گے۔ میں  
 نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اُس جیسی کشش دنیا کا کوئی  
 آرٹسٹ لایا ہی نہیں سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ ہنس کر بولا۔ "بھئی میرے تو بس کی بات نہیں کہ  
 تمہارے ذہن پر سے جولیٹ کا بھوت اُتار سکوں۔"

"ایک وقت آئے گا جب تم بھی میری طرح اُسے مکمل  
 طور پر تسلیم کر لو گے۔" میں نے کہا۔

"اچھا!!۔۔۔۔۔ مان لیا کہ ایسا ہی ہو گا۔" وہ ہنس کر  
 بولا۔ "لیکن۔۔۔۔۔ ابھی تو نہیں مانا ہے ناں۔۔۔۔۔ اچھا

سنو!۔۔۔۔۔ میں دعویٰ کی انگری بیشن کے لیے تیاری کر  
 چکا ہوں لیکن اگر تم بھی وہاں جاؤ گے تو میں جاؤں گا  
 ورنہ نہیں جاؤں گا۔"

"یار!۔۔۔۔۔ میرا ابھی کوئی خاص ارادہ نہیں ہے ہو سکتا  
 ہے کہ میں چلا جاؤں اور ہو سکتا ہے کہ نہ جاؤں۔" میں  
 نے کہا۔

"ابھی تو اس انگری بیشن میں تین ماہ باقی ہیں۔ تم  
 کچھ دنوں میں سوچ کر مجھے اپنا فائنل فیصلہ بتا دینا۔ اگر  
 جاؤ گے تو میں بھی تیار رہوں گا ورنہ دوسرے کام کروں  
 گا۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے میں بتا دوں گا۔" میں نے کہا اور جیب  
 سے سگار نکال کر سلگ لیا۔

سات بجے تک ہم لوگ وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے  
 میں نے جان بوجھ کر جولیٹ کا تذکرہ کم کیا تھا کیوں کہ  
 میں نے محسوس کر لیا تھا کہ شری کانت اُس کی باتوں میں  
 دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ پھر ہم اٹھ کر ہال میں آ گئے۔  
 یہاں اب لوگوں کی بڑی تعداد جمع ہو چکی تھی۔ بہت سے  
 لوگ کرسیوں پر بیٹھے تھے اور پھر ڈانس پر ایک آدمی  
 آ گیا۔ اُس نے مائیک میں کہنا شروع کیا۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ہم آپ کو خوش آمدید کہتے  
 ہیں۔ اب سے کچھ دیر بعد دنیا کی عظیم مصورہ مس جولیٹ  
 یہاں پہنچنے والی ہیں۔ ان کے آنے کے فوراً بعد ان کے  
 اعزاز میں دی جانے والی اس تقریب کا آغاز کر دیا جائے  
 گا۔ آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ نشستوں پر تشریف  
 رکھیں۔ شکریہ!"

اس اعلان کے بعد بہت سے لوگ کرسیوں پر بیٹھ  
 گئے۔

تقریباً پانچ منٹ بعد پھر وہی آدمی مائیک پر آ گیا اور  
 بولا۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! آپ کی پسندیدہ مصورہ مس  
 جولیٹ بس چند منٹ بعد ہی یہاں پہنچنے والی ہیں۔ جو  
 معزز مہمان ادھر ادھر کھڑے ہیں ان سے درخواست ہے  
 کہ نشستوں پر تشریف رکھیں تاکہ معزز مہمان کے آنے  
 کے بعد تقریب کا آغاز کر دیا جائے۔ شکریہ!"

اس اعلان کے بعد مزید کئی لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔  
 "کیا خیال ہے ہم لوگ بھی بیٹھ جائیں؟" شری کانت  
 مجھ سے بولا۔

"ایسا کرو تم بیٹھو ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔" میں نے  
 کہا۔

"ٹھیک ہے بھئی۔۔۔۔۔ جیسی تمہاری مرضی۔" شری کانت  
 نے کندھے اُچکا کر کہا اور کرسیوں کی جانب چل پڑا۔  
 میں بلا ارادہ بار بار اپنی رست و اوج کی طرف دیکھ

جار رہا تھا۔ چوں کہ جولیٹ کے بارے میں یہ اعلان کیا گیا  
 تھا کہ وہ چند منٹ بعد پہنچ رہی ہے اور میں گھڑی میں دیکھ  
 رہا تھا کہ کتنے منٹ گزر گئے ہیں۔

اور پھر گیلری کے مین گیٹ سے ایک بلیک کلاڑی گاڑی  
 اندر داخل ہوئی جو ہم سے ڈرا دور آ کر رُک گئی۔ پریس  
 فوٹو گرافرز اور دیگر کچھ لوگ اسی کی جانب لپکے تو مجھے خیال  
 آیا کہ یہی جولیٹ کی گاڑی ہو سکتی ہے۔ میں نے کشمن کی  
 طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "آؤ دیکھیں شاید  
 جولیٹ اسی میں آئی ہے۔"

چند لمحوں بعد ہی ہم دونوں اس گاڑی کے قریب پہنچ  
 گئے۔ اب وہاں خاصہ جھوم لگ چکا تھا اور گاڑی کا بالکل  
 قریب جانا مجھے ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔

"راستہ دے دیں راستہ دے دیں۔ میڈم کو جانے  
 کے لیے جگہ دیں۔" ایک بھاری بھر کم آدمی نے لوگوں کو  
 ادھر ادھر ہٹاتے ہوئے کہا۔ لوگوں نے جگہ چھوڑی تو مجھے  
 گاڑی کا دروازہ نظر آنے لگا۔ ایک آدمی نے اُسے کھولا  
 اور اس میں سے جولیٹ اُتری۔ میں اُسے دیکھ کر سحر زدہ  
 رہ گیا۔ وہ تصویروں میں جتنی خوب صورت دکھائی دیتی تھی  
 حقیقت میں اس سے کہیں زیادہ خوب صورت اور پُر  
 کشش تھی۔ لوگ اس سے ہاتھ ملانے اور آٹو گراف لینے  
 لگے جب کہ ٹی وی کے لوگ اس کی عکس بندی کر رہے تھے  
 اور پریس فوٹو گرافرز تصویریں بنا رہے تھے۔ اس طرح  
 جولیٹ بالآخر اسٹیج تک پہنچ گئی۔

"لیڈیز اینڈ جنٹلمین!۔۔۔۔۔ میں بعد مسرت یہ اعلان  
 کر رہا ہوں کہ ہماری پسندیدہ مصورہ مس جولیٹ اس  
 وقت تشریف لا چکی ہیں۔" اس آدمی نے مائیک پر  
 اتناؤ سمٹ کی اور پھر اس نے لوگوں سے درخواست کی کہ  
 وہ اب کرسیوں پر بیٹھ جائیں تاکہ تقریب کا باقاعدہ آغاز  
 کیا جاسکے اس کے علاوہ اس نے دیگر کچھ مہمانوں کو بھی  
 اسٹیج پر بلا لیا۔ مقررین نے جولیٹ کے فن اور شخصیت کے  
 حوالے سے تقریریں کرنی شروع کر دیں۔



”اور اب میں اپنی معزز مہمان مس جوئیٹ سے درخواست کروں گا کہ وہ تشریف لائیں اور اپنے خیالات کا اظہار کریں۔“ اناؤنسمنٹ کرنے والے آدمی نے انگریزی میں کہا۔

جوئیٹ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نہ جانے کیوں میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ وہ ڈانس پر پہنچ گئی اور اس نے مائیک کو اپنے لیوں کے قریب کرنے کے بعد انگریزی میں کہا۔ ”لیڈیز اینڈ جنٹلمین!“ اس کی آواز بے حد متزن تھی۔ ”آج میں اپنے آپ کو آپ لوگوں کے درمیان پا کر بے حد خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ یہ میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہے کہ آپ لوگ میرے فن کے چاہنے والے ہیں۔ مجھے جب یہ پتہ چلا تھا کہ انڈیا میں میرے بہت سے فن ہیں تو میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ان سے ضرور ملاقات کروں گی اور آپ کی بھی محبت مجھے یہاں سمجھنے لائی ہے۔ میں آپ لوگوں کی محبتوں کی بہت بہت شکر گزار ہوں۔ میں آپ لوگوں کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ شکریہ؟“ اس مختصر سے خطاب کے بعد جوئیٹ ڈانس سے ہٹ گئی اور اناؤنسمنٹ پر آ کر بولا۔

”لیڈیز اینڈ جنٹلمین!..... آپ نے مس جوئیٹ کی محبت بھری باتیں سنیں..... اب آئیے ہم گیلری نمبر دو کی طرف چلتے ہیں اور مس جوئیٹ کے فن پارے دیکھتے ہیں۔“

کچھ ہی دیر بعد سب لوگ گیلری نمبر دو میں پہنچ گئے جہاں دیواروں پر جوئیٹ کی تصاویر آویزاں تھیں۔ جوئیٹ کو عام لوگوں اور میڈیا والوں نے گھیر لیا تھا۔ ”لکشمین!“ میں نے لکشمین کو مخاطب کیا جو اسٹیج کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”یس سر؟“

”بھئی کسی طرح جگہ بناؤ..... جوئیٹ تک پہنچنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوکے سر!..... آپ میرے ساتھ آئیں۔“ اس نے

میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا اور پھر ہم دونوں چل پڑے۔ اس نے جوئیٹ کے پاس لگے جھوم میں جگہ بنانا شروع کر دی۔ بلاآخر کچھ دیر کی تک دو دو کے بعد ہم جوئیٹ تک پہنچ گئے۔

”میں جیب سے پہلے ہی چھوٹا سالیئر پیڈ اور قلم نکال چکا تھا۔ میں نے وہ دونوں چیزیں جوئیٹ کی طرف بڑھاتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ ”میڈم!..... مجھے آٹو گراف چاہیے میں خود بھی ایک آرٹسٹ ہوں۔“

”اوکے اوکے!“ اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا ”لیئر پیڈ اور قلم میرے ہاتھ سے لینے کے بعد اس نے کچھ لکھا اور دونوں چیزیں مجھے واپس کر دیں۔ اسی وقت ایک اور آدمی مجھے ایک طرف دھکیلنے کے بعد جوئیٹ تک پہنچ گیا۔

”میں اور لکشمین جھوم میں سے نکل آئے۔ جب میں نے اپنے لیئر پیڈ پر نظر ڈالی جوئیٹ نے انگریزی میں لکھا تھا۔ ”عام تصویریں عام لوگ بناتے ہیں اور خاص تصویریں خاص لوگ“ میں اس کے مفہوم پر غور کرنے لگا لیکن مجھے کچھ سمجھ نہ آیا۔

”یہ کیا لکھ دیا ہے سر اس نے۔“ لکشمین نے جوئیٹ کی تحریر پڑھنے کے بعد میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”اس کا کیا مطلب ہے؟“ اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”میں خود اس کا مطلب نہیں سمجھا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس میں تو غرور کی بو آ رہی ہے۔“ وہ بولا۔ ”لیکن وہ مغرور تو نہیں ہے۔“ میں نے اس کی لٹی کی۔ ”جملہ غرور سے بھرا ہوا ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”تم غلط سوچ رہے ہو۔ جو انسان مغرور ہوتا ہے اس کا ہر عمل غرور میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے جب کہ جوئیٹ تو بہت بااخلاق عورت لگتی ہے۔ میں تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ وہ مغرور ہے اور خود کو عام انسانوں سے ہٹ کر خاص انسان سمجھتی ہے۔“

”تو پھر اس جملے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے سر؟“ اس نے ابھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ذرا سوچ کر کہا۔ ”دیکھو!..... وہ ایک بڑی مصورہ ہے۔ اس کے تخیل کی پرواز بہت اونچی ہے اس نے یہ جو جملہ لکھا ہے یقیناً اس میں کوئی نہ کوئی اہم مطلب پوشیدہ ہے جو میں اور تم ابھی تک سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔“ وہ اپنا ہاتھ کھجاتے ہوئے بولا۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں اس پر کافی غور کرنا پڑے گا۔“

ذرا دیر بعد شری کانت ہمارے پاس آ گیا اور مجھ سے بولا۔ ”میں نے دیکھا تھا تمہیں جوئیٹ کے پاس جاتے ہوئے۔“

”ہاں..... یہ دیکھو یہ اس نے آٹو گراف دیا ہے۔“ میں نے لیئر پیڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے پیڈ پر نظر ڈالی اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”یہ تو عجیب و غریب جملہ ہے۔“

”تم اس کا کیا مطلب لیتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”اس نے اپنے آپ کو خاص کہا ہے۔ یعنی وہ خود کو ایک خاص مصورہ سمجھتی ہے۔ یہ اس کے پراؤڈ ہونے کا ثبوت ہے۔“

”اوہ۔“ میں نے کہا۔ ”لکشمین نے بھی اس کا یہی مطلب نکالا تھا لیکن تم خود سوچو کیا وہ پراؤڈ ہے؟“

”یقیناً۔“ وہ بولا۔ ”تم نے اس کا ایسا کون عمل دیکھا ہے کہ جس سے تم اپنی بات ثابت کر سکتے ہو؟“ میں نے بھوس بھوس کر کہا۔ ”وہ چالاک عورت ہے۔ مصورہ سے زیادہ تو وہ مجھے سیاست دان لگتی ہے اپنے غل سے بالکل ظاہر نہیں ہونے دے رہی ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ ویسے بھی اگر وہ غرور کا مظاہرہ شروع کر دے گی تو اس کے مداح اس سے دور ہونے لگیں گے اور یہ جو اس نے تمہیں آٹو گراف دیا ہے یہ بھی بڑا معنی خیز ہے۔ اگر جوئیٹ سے اس کی وضاحت طلب کی جائے تو یقیناً وہ بھی کہے گی کہ اس

نے ایک عام سی بات کی ہے لیکن اس کی گہرائی میں بہر حال بھی مطلب پوشیدہ ہے کہ وہ خود کو خاص انسان تصور کر رہی ہے۔“

”تم اس سے خاصے جیسے نظر آتے ہو۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ بولا۔ ”میں ہر غیر ملکی آرٹسٹ سے جیسے رہتا ہوں۔ مجھے صرف اپنے ملک کے آرٹسٹ پسند ہیں۔ مجھے تو تم سب سے زیادہ اچھے لگتے ہو اور..... میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ہر انسان کے اندر جو ایک بچہ چھپا ہوا ہوتا ہے وہ بچہ تمہاری اس جوانی پر حاوی ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہ نہیں کر بولا۔“ میں ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔ تم بچوں جیسی حرکتیں ہی تو کر رہے ہو۔ تم انڈیا کے ایک بہت بڑے آرٹسٹ ہو دنیا بھر میں تمہارا نام ہے اور تم ایک غیر ملکی آرٹسٹ کے پیچھے اس طرح لگے ہوئے ہو جیسے تم کوئی عام شہری ہو جس کی خواہش ہو کہ وہ دنیا کی مشہور مصورہ کی ایک جھلک دیکھ لے اس سے آٹو گراف لے لے۔ یہ سب کیا ہے پرکاش تم خود سوچنا؟“

اس کی باتیں درست تھیں۔ میں کچھ شرمندہ ہو گیا تھا۔ اس نے حریف کہا۔ ”دیکھو!..... اگر تمہیں جوئیٹ سے ملنے کی اتنی ہی خواہش تھی تو تم اپنے ذرائع استعمال کر کے اس سے اس ہوٹل میں بھی مل سکتے تھے جہاں وہ ٹھہری ہوئی ہے لیکن تم یہاں بے صبری اور بچپن کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ مجھے غلط مت سمجھو۔ میں تمہارا دوست ہوں اور میں تمہاری عزت کا خیال ہے۔ تم خود سوچو اگر میڈیا والوں کو تمہاری ان باتوں کا پتہ چل جائے تو وہ کیسی کیسی ہتھکڑے دار خبریں چلائیں گے اور اس طرح تمہاری ساکھ متاثر ہو سکتی ہے اس لیے میرا اخلصانہ مشورہ ہے کہ تم کچھ احتیاط کرو۔“



**We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers**

**If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com**

**or  
send message at  
0336-5557121**

میں نے سحرزدہ انداز میں اُس سے ہاتھ ملایا۔

”کیا تم مجھے کچھ وقت دے سکتے ہو؟“

”میں؟“ اُس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا تھا۔

”جی ہاں آپ۔“ وہ بولی۔

”میں حاضر ہوں لیکن میں ناچیز تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

”میں چاہتی ہوں کہ تم سے ایک نشست رکھوں تم مجھے کوئی وقت دو؟“ وہ بولی۔

”وقت؟“ میں تو جیسے ہواؤں میں اڑنے لگا۔

”ہاں..... دیے اگر تمہارے پاس فرصت ہو تو کل صبح میرے ہوٹل آ جاؤ“ میں ہوٹل پلازا میں ٹھہری ہوں۔“ اُس نے کہا۔

”میرے پاس تو وقت ہی وقت ہے۔ میں کل صبح آ جاؤں گا۔ گیارہ بجے تک آ جاؤں؟“

”ہاں ٹھیک ہے یہ مناسب وقت رہے گا۔“

”میں پہنچ جاؤں گا۔“

”اوکے!..... میں ویٹ کروں گی۔“ اُس نے ایک بار پھر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اُس سے ہاتھ ملایا۔ وہ بولی۔ ”مجھے ذرا کچھ اور دوستوں سے ملنا ہے تو پھر کل ملاقات ہو رہی ہے ناں؟“

”ہاں بالکل ہو رہی ہے۔“

”اوکے!“ اس نے گرم جوشی سے میرے ہاتھ کو جھٹکا دیا، مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک جانب چلی گئی۔

میں مہجوت کھڑا تھا۔ مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو لیٹ واقعی مجھ سے مل کر گئی ہے۔ میں اسے ایک حسین خواب سمجھ رہا تھا۔

”سر!..... یہ تو ان ہونی ہوگئی۔“ لکشمی نے کہا تو میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ میں نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے

”میں تمہاری بات مانتا ہوں۔“ میں نے اقرار کیا۔

”واقعی تم درست کہہ رہے ہو لیکن میں کیا کروں اکثر ایسے

معاملات میں میں خود پر قابو نہیں رکھ سکتا عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے اور میرے جی میں جو بھی آتا ہے وہ میں کرتا ہوں۔“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”یعنی میری بات درست ہے ناں کہ تمہارے اندر جو بچہ موجود ہے وہ ایسے مواقع پر تمہاری اس جوانی پر حاوی آ جاتا ہے؟“

”ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”شاید تم درست کہہ رہے ہو۔“

”اس لیے میرے دوست اپنی ساکھ کا خیال رکھو۔“ اس نے میرا شانہ چھپھپھاتے ہوئے کہا۔

”تمہارے غلغلہ مشوروں کا شکریہ!“ میں نے کہا۔

”اوکے!..... تم ذرا تصویریں دیکھو میں اپنے ایک دوست سے مل کر آ رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ ایک جانب چلا گیا۔ میں نے لکشمی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ جو لیٹ سے اس کے ہوٹل میں ملاقات کی جائے۔“

”بہتر ہے سر!..... حکم کیجیے کہ میں کیا کروں؟“ اُس نے دبے انداز میں کہا۔

میں سوچنے لگا اور اس وقت میں نے جو لیٹ کو کچھ لوگوں کا ساتھ اپنی طرف آتے دیکھا۔ میرے ہاتھ پیر جیسے پھولنے لگے۔ میں نے ندوں ہو کر لکشمی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

”دیکھو جو لیٹ اس طرف آرہی ہے۔“

لکشمی نے پلٹ کر دیکھا۔

”ایکسیکوی زی!..... مسٹر پرکاش! تم نے مجھ سے اپنا پورا تعارف نہیں کروایا تھا۔“ جو لیٹ نے میرے قریب آ کر میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔



میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔“  
 ”بات تو خواب جیسی ہی ہے سر!“ وہ مسکرا کر بولا۔  
 ”کہاں تو آپ اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہے  
 تھے اور کہاں یہ کہ وہ خود ہی آپ کے پاس آگئی۔“  
 ”بس آج تو بھگوان بڑا مہربان لگتا ہے۔“ میں نے  
 کہا۔

”جی بالکل سر..... ایسا ہی ہے۔“ وہ بولا۔  
 تقریب کے اختتام کے بعد چائے پارٹی کا اہتمام کیا  
 گیا۔ اس دوران جولیٹ لوگوں میں گہری رہی اور میں  
 نے بھی اس کے پاس جانے کی کوشش نہیں کی مجھے یہ  
 دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ کسی وجہ سے مجھ سے ملاقات کا  
 پروگرام ہی کنسل ہی نہ کر دے۔  
 تقریب ختم ہوئی تو وہ اپنی گاڑی میں چلی گئی۔ میں اور  
 لکشمی بھی اپنی گاڑی میں روانہ ہو گئے۔  
 ”لکشمی!“ میں نے کہا۔  
 ”یس سر؟“ وہ فوراً بولا۔  
 ”یار آج میں بہت خوش ہوں۔“  
 ”جولیٹ کی وجہ سے؟“  
 ”ہاں یار!“  
 ”بات تو بے حد خوشی کی ہے سر!“  
 ”ہاں..... اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس خوشی  
 میں مجھے آج رات نیند نہیں آئے گی۔“  
 ”یقیناً ایسا ہو سکتا ہے سر!“  
 ”چلو..... اب چل کر میں اس خوشی میں پوری ایک  
 بوتل پیوں گا۔“  
 ”ٹھیک ہے سر!..... جیسی آپ کی مرضی۔“ وہ میرے  
 سے ہنس کر بولا۔  
 ”ہم اسٹوڈیو پہنچ گئے۔ میں نے لکشمی کو دسکی لانے کا  
 کہہ دیا۔“

☆  
 صبح میں دس بجے اسٹوڈیو پہنچ گیا۔ لکشمی حسب معمول

پہلے سے پہنچا ہوا تھا۔ میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔  
 ”دیکھو لکشمی! کیا لگ رہا ہوں میں۔ کیسی ہے  
 ڈریسنگ؟“  
 ”زیروست..... اے دن سرا“ وہ میرا جائزہ لیتے  
 ہوئے بولا۔

”دیکھو بھی!..... اگر کوئی کئی کوئی خامی محسوس ہو رہی  
 ہے تو بتاؤ خواہ مخواہ مسکے لگانے کی ضرورت نہیں ہے میں  
 نہیں چاہتا کہ جولیٹ پر میرا کسی بھی قسم کا غلط اثر پڑے۔“  
 میں نے کہا۔  
 ”نہیں سر!..... سب کچھ ایک دم اے دن ہے۔“ وہ  
 بولا۔

”اوکے!..... اب تم ایک کپ کافی لے آؤ۔ میں کافی  
 پی کر روانہ ہو جاؤں گا“ میں اس کے پاس بالکل وقت پر  
 پہنچنا چاہتا ہوں۔“  
 ”نہیں سر!..... آپ تشریف رکھیں میں ابھی لے کر  
 حاضر ہو رہا ہوں۔“

وہ میرے روم سے باہر چلا گیا اور میں صوفے پر بیٹھ کر  
 جولیٹ کے بارے میں سوچنے لگا۔  
 تھوڑی دیر بعد لکشمی کافی لے کر آ گیا۔ کافی پینے کے  
 بعد میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اچھا لکشمی! اب میں  
 جا رہا ہوں۔“  
 ”ٹھیک ہے سر!“ وہ بولا۔

”یار!..... میں ایک وجہ سے پریشان ہوں کیا تم اس  
 سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟“ میں نے کہا تو اس  
 نے بھوئی نکین کر مجھ سے کہا۔  
 ”فرمائیں سر کیا مسئلہ ہے؟“  
 ”یار! میں نے گال کھجایا۔“ میں کل سے اب تک  
 سوچتا رہا ہوں کہ جولیٹ مجھ سے کس موضوع پر بات کرنا  
 چاہتی ہے۔“  
 ”ظاہر ہے مردہ مصوری کے حوالے سے ہی آپ سے  
 بات کرنا چاہے گی۔“ وہ بولا۔

”نہیں..... میں نے بلا توقف کہا۔“ مجھے ایسا نہیں لگتا  
 کہ میں اس سے بڑا آرٹسٹ نہیں ہوں اس لیے وہ  
 مجھ سے متاثر بھی نہیں ہوگی پھر بھلا وہ مجھ سے اس موضوع  
 پر بات کرے گی؟ ہاں اگر میں اس سے بڑا آرٹسٹ ہوتا  
 تو بات سمجھ میں آ سکتی تھی کہ وہ مجھ سے مصوری کے  
 اے دن سے بات کرنا چاہتی ہے۔“ میں نے لکشمی کی  
 رائے طلب نہ کیا ہوں سے دیکھا۔

وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”یہ بات تو آپ ٹھیک کہہ رہا  
 ہیں..... لیکن پھر آخراً ایسا کون سا موضوع ہو سکتا ہے کہ  
 اس پر وہ آپ سے بات کرے؟“  
 ”بس اسی الجھن کا تو شکار ہوں میں۔“ میں نے کہا۔  
 بہر حال..... میں جانتا ہوں دیکھتا ہوں کہ وہ کیا بات  
 کرنا چاہتی ہے۔“  
 ”ٹھیک ہے سر!“ وہ بولا۔

ذرا دیر بعد میں اپنی کار میں روانہ ہو گیا پھر مطلوبہ ہوٹل  
 پہنچ کر میں نے اپنی کار پارکنگ لائٹ میں کھڑی کر دی  
 اس سے اترنے کے بعد اسے لاک کر کے داخلی  
 دالے پر پہنچ گیا۔ یہاں موجود سیکورٹی گارڈز نے  
 ہیکلر سے مجھے چیک کیا اور پھر میں اسکنر کے سامنے  
 سے گزرنے کے بعد ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ میں استقبال  
 پہنچ گیا۔ یہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ میں نے ان میں  
 سے ایک نوجوان لڑکے سے کہا۔

”ایکسیکویڑی!..... میں میں جولیٹ سے ملنا چاہتا  
 ہوں۔“  
 ”مس جولیٹ سے؟“ اس نے میرا جائزہ لیتے ہوئے  
 کہا۔ ”کیا اپائنٹمنٹ ہے آپ کا؟“  
 ”جی ہاں! آپ انہیں انعام کرویں میرا نام پرکاش  
 ہے۔“

”میں انعام کرتا ہوں۔“ کہتے ہوئے اس نے انعام  
 کارڈ سیدھا اٹھاتے ہوئے نمبر پیش کرنا شروع کر دیا اور  
 میرے سیدر کان سے لگانے کے بعد ذرا توقف کر کے

انگریزی میں بولا۔ ”میڈم جولیٹ!..... کوئی صاحب  
 آپ سے ملنے آئے ہیں اپنا نام پرکاش بتا رہے ہیں۔  
 اوکے میڈم!“ کہہ کر اس نے ریسپورڈا پس کریڈل پر رکھ  
 دیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”آپ روم نمبر ایک سو تین  
 میں چلے جائیں۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ کہہ کر میں لفٹ کی جانب چل  
 پڑا۔ میں اس ہوٹل میں پہلے کی مرتبہ آچکا تھا اس کے محل  
 وقوع سے واقف تھا۔

میں لفٹ کے سامنے پہنچ کر ڈک گیا۔ اس کا دروازہ کھلا  
 ہوا تھا اور اس میں سے لوگ اتر رہے تھے۔ جب سب  
 لوگ اتر گئے تو باہر انتظار میں کھڑے لوگ اس میں سوار  
 ہو گئے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔

میرے مطلوبہ فلور پر لفٹ رک گئی۔ دروازہ کھلنے پر میں  
 اچک کر فلور پر آ گیا اور سامنے ہی موجود کمرہ نمبر پر نظر  
 ڈالی۔ وہ میرا مطلوبہ نمبر نہیں تھا۔

ذرا دیر بعد میں کمرہ نمبر ایک سو تین کے سامنے پہنچ  
 گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے تھوک  
 نکلے ہوئے اپنے بے قابو ہوتے حواس کو قابو میں کرنے  
 کی کوشش کی۔ اپنے لباس پر نظر ڈالی۔ کوٹ کو درست کیا  
 اور بالوں پر ہاتھ پھیر کر تسلی کر لی کہ وہ اب بھی اس  
 ترتیب سے جھے ہوئے ہیں جس ترتیب سے میں نے  
 انہیں جمایا تھا۔

میں نے آہستہ سے کمرے کے دروازے پر دستک  
 دی۔ پھر ذرا پیچھے ہو کر کھڑا ہو گیا۔

ذرا دیر بعد کچھ آٹھیں ابھریں اور جولیٹ نے دروازہ  
 کھول دیا۔ وہ کل پینٹ شرٹ میں تھی لیکن اس وقت اس  
 نے مٹی اسکرٹ اور بنیان پہن رکھی تھی۔ جس کا رنگ  
 سلیٹی تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرہ پر مسکراہٹ آ گئی۔  
 وہ خوش دلی کے ساتھ بولی۔ ”خوش آمدید خوش آمدید  
 مسٹر پرکاش!“

”گڈ مارننگ!“ میں نے مسکرا کر کہا۔



"مارنگ..... آؤ..... اندر آ جاؤ۔" اُس نے مجھے اندر داخل ہونے کا راستہ دیتے ہوئے کہا اور جب میں کمرے میں داخل ہو گیا تو اس نے دروازہ بند کر دیا۔ یہ ایک قایم اشارہ ہوٹل کا کمرہ تھا۔

"آؤ مسٹر پرکاش!..... بیٹھو۔" اس نے صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

ہم دونوں آسنے سانسے بیٹھ گئے۔ اُس نے ولادیز مسکراہٹ کے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم خیریت سے ہونا؟"

"ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں تم کیسی ہو؟" میں نے کہا۔

"میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ بولی۔

"مجھے تم سے ملاقات کر کے بہت خوشی ہو رہی ہے۔" میں نے اُسے اپنی کیفیت بتائی۔

"تمہارا شکریہ" وہ مسکرا کر بولی۔

"میں کل سے اس انجمن میں ہوں کہ آخر تم جیسی عظیم مصورہ نے مجھ سے ملنے کی خواہش کیوں کی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس لیے کہ میں تم سے کچھ کام لینا چاہتی ہوں۔" اُس نے بڑے معنی خیز انداز میں کہا۔

"مجھ سے؟" میں نے اپنے سینے کی طرف انگلی کی۔

"ہاں..... ایک بہت اہم کام ہے۔" اب اُس کا لہجہ معنی خیز ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ پراسرار بھی ہو گیا تھا۔

"میں..... کیا میں اس قابل ہوں کہ تمہارا کوئی اہم کام کر سکوں؟" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... تم ہی ہو جو میرا وہ اہم کام کر سکتے ہو۔" اس نے سابقہ انداز میں کہا۔

"اچھا بتاؤ کہ کیا کام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی میں تمہیں بتا دوں گی فی الحال میں تمہاری تواضع کے لیے کچھ منگوانا چاہتی ہوں۔"

"میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

"نہیں..... یہ تو بڑی بد اخلاقی کی بات ہوگی۔ اچھا بتاؤ کہ تمہارے لیے کیا منگواؤں؟"

"کافی مناسب رہے گی۔"

"اوکے!..... میں ابھی آرڈر کرتی ہوں۔" وہ اٹھ بولی۔ پھر اس نے اسٹرکام پر آرڈر نوٹ کر دیا۔

"وہاں آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔" وہ اپنے لیے بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ مجھے کسی کام کے لیے منتخب کیا ہے۔" میں نے اس سے کہا۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر تمہیں منتخب کیا ہے اور امریکہ سے آئی ہی تمہارے لیے ہوں۔"

"کیا؟" میں اچھل پڑا۔ "یہ..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" وہ گہری نظروں سے مجھ سے عاری لہجے میں بولی۔ مجھے اس کا یہ انداز بہت عجیب اور پراسرار محسوس ہوا۔

"اب تو میں بہت زیادہ تجسس میں مبتلا ہو گیا ہوں کہ آخر وہ کام ہے کیا؟" میں نے کہا۔ "اور یہ بھی میرے لیے نہایت حیرت ناک بات ہے کہ تم امریکہ سے صرف میرے لیے آئی ہو۔"

"ہاں..... میں امریکہ سے تمہارے لیے آئی ہوں۔ اس لیے کہ تم بھی خاص انسان ہو۔"

"خاص انسان؟" میں نے بھوئیں سیکڑ کر کہا۔

"ہاں۔ تم نے میرا آؤ گراف پڑھا تھا نا؟"

بولی۔ "ہاں بالکل پڑھا تھا۔"

"اس پر میں نے یہی لکھا تھا نا کہ عام انسان عام کرتے ہیں اور خاص انسان خاص؟"

"اور اب جب کہ میں تمہارے بارے میں یہ کہہ رہی ہوں کہ تم خاص انسان ہو تو یہ بات از خود ثابت ہو جاتی ہے کہ تم خاص کام بھی کر سکتے ہو۔"

"لیکن..... مجھے اس خاص کام کے بارے میں معلوم ہی تو ہونا چاہیے؟"

"سب معلوم ہو جائے گا۔" وہ پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ پھر اس نے سینئر ٹیمیل پر سے سگریٹ کا پیٹ نکال کر اس میں سے سگریٹ نکال کر اُسے ہونٹوں میں ڈال دیا۔ پھر ٹیمیل پر سے ہی لائٹر اٹھا کر اُس سگریٹ کو

دلا دیا۔ وہ ناک اور منہ سے دھواں اٹھنے لگی۔ میں اُس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ درحقیقت وہ کون ہے۔ مجھے تو اس پر کسی سیکرٹ انجینی کی کارکن ہونے کا شبہ

نہیں تھا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر تمہیں منتخب کیا ہے اور اس نے میرے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اُس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے متعلق بہت کچھ جانتی ہے اور اُس نے میرے بارے میں جاننے کے سبب ہی اپنے اہم کام کے لیے میرا انتخاب کیا تھا۔

اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں ہلکا سا گھبراہٹ سے اٹھ کر اپنے خیالوں سے باہر آ گیا۔

"وینر آرڈر لے کر آ گیا ہے۔" جولیٹ مسکراتے ہوئے بولی اور اٹھ کر دروازے کی طرف جانے لگی۔ ایک

آرڈر ہونے کی وجہ سے مجھے یہ عادت سی پڑ گئی ہے کہ میں لوگوں کے نقوش اور لنگر پر خاص نظر رکھتا ہوں اس وقت بھی میری نظریں جولیٹ پر تھیں۔ اُس کا لنگر بے حد

مناسب اور دلکش تھا۔ پتلی کمر بڑی بڑکشش تھی جو جولیٹ کے چلنے کی وجہ سے گویا محو قس معلوم ہوتی تھی۔ اُن پر کچھ نیچے تک اسکرٹ تھا اور اس کے نیچے اُس کی برہنہ ٹانگیں

نہیں۔ اب سے پہلے میں نے اسے اس طرح تفصیل سے نہیں دیکھا تھا۔

اُس نے دروازہ کھولا۔ سامنے وینر ہاتھ میں ٹرے لیے کھڑا تھا۔ جولیٹ نے اُس سے ٹرے لے لی اور دروازہ

بند کرنے کے بعد واپس میرے پاس آ گئی۔ اس نے اپنے سینئر ٹیمیل پر رکھ دی اور میرے قریب صوفے پر بیٹھنے کے بعد کافی بنانے لگی۔ پھر اُس نے طشتری میں کافی کا کپ رکھ کر مجھے دے دیا۔ دوسرا کپ اُس نے خود اٹھا

لیا۔ اُس نے کچھ چسکیاں لینے کے بعد میری طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم کافی پی لیں اس کے بعد میں تمہیں سب سے پہلے تو ایک اہم بات بتاؤں گی اس کے بعد وہ اہم کام بھی تمہارے سامنے آ جائے گا جو تم نے کرنا ہے۔"

"اہم بات؟" میں نے تجسس کے ساتھ کہا۔

"ہاں۔" اُس نے پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا ضروری ہے کہ تم کافی پینے کے بعد ہی مجھے وہ سب بتاؤ؟" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہاں..... میں چاہتی ہوں کہ....." وہ ذرا اُلجھن کا شکار ہوئی اور پھر بولی۔ "بس تم آرام سے کافی پی لو پھر ہم اہم معاملات پر بات کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔" میں نے کندھے اچکا کر کہا۔

ذرا دیر بعد میں نے کافی ختم کرنے کے بعد کپ اور طشتری ٹرے میں رکھنے کے بعد جولیٹ کی طرف دیکھ کر

کہا۔ "ہاں اب بتاؤ کیا معاملہ ہے؟"

اُس نے بھی اپنا کپ ٹرے پر رکھ دیا اور ذرا سا کھٹکھٹانے کے بعد میری طرف دیکھ کر بولی۔

"میں تمہیں ایک پینٹنگ دکھاتی ہوں تم اسے دیکھو پھر مزید بات چیت کرتے ہیں۔" وہ اٹھ کر بیڈ کی طرف گئی۔

اس پر کچھ پینٹنگز رکھی تھیں۔ ان میں سے اس نے سب سے اوپر والی پینٹنگ اٹھائی اور میری طرف آنے لگی۔

پینٹنگ بل رنی تھی اس لیے مجھے واضح طور پر نظر نہیں آ رہی تھی۔

جولیٹ آ کر میرے ساتھ بیٹھ گئی اور اُس نے پینٹنگ اپنی ٹانگوں پر رکھ لی۔ اب پینٹنگ مجھے واضح طور پر نظر آئی۔ ایک منظر تھا جس میں کچھ مکانات تھے ہری اور پیلی لمبی لمبی گھاس نظر آ رہی تھی۔ کچھ درخت اور ادھر ادھر موجود تھے یہ سب کچھ تو عام سا تھا لیکن بس ایک بات عجیب سی



تھی وہ یہ کہ اُس میں آسمان پر دو چاند نظر آ رہے تھے۔  
 میں نے جولیٹ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور بولا۔  
 ”میں نے تصویر دیکھ لی اُس میں عجیب بات صرف یہ ہے  
 کہ اس میں دو چاند بنائے گئے ہیں۔“  
 ”ہاں..... اور اس سارے منظر کا تم سے بہت گہرا تعلق  
 بھی ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں بولی۔  
 ”مجھے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔“  
 ”کیا تعلق ہے؟“  
 ”یہ ابھی تمہیں یاد آ جائے گا بس ذرا تم میری آنکھوں  
 میں دیکھو۔“ وہ بولی۔  
 میں اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا اور پھر چند سیکنڈ بعد  
 مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دماغ میں بہت جلن سی ہونے لگی  
 ہے اور پھر میرا سر بے جان سا ہو کر سامنے کی جانب  
 ڈھلک گیا۔

”اے پرکاش!..... سر اٹھاؤ۔“ جولیٹ نے میرے  
 بال بڑی بے دردی سے پکڑ کر میرا سر اٹھا دیا اور میں بالکل  
 ٹھیک ہو گیا وہ بولی۔ ”اب تم ٹھیک ہونا؟“  
 ”ہاں..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب  
 دیا۔

”اچھا اب ذرا تم پینٹنگ کی طرف دیکھو اور بتاؤ کہ تم  
 کیا محسوس کر رہے ہو۔“ اُس نے کہا۔  
 میں نے پینٹنگ کی طرف دیکھا۔  
 ”ذرا غور سے دیکھنا۔“ وہ بولی۔

”میں غور سے اس سارے منظر کو دیکھنے لگا اور پھر مجھے  
 یوں محسوس ہوا جیسے میں نے پہلے کہیں حقیقت میں یہ منظر  
 دیکھا ہوا ہے۔ یہی یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ آخر  
 میں نے یہ منظر کہاں دیکھا ہے۔“

”کیا محسوس کر رہے ہو؟“ جولیٹ بولی۔  
 میں نے نظریں پینٹنگ پر ہی رکھتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے یہ منظر پہلے کہیں

حقیقت میں دیکھا ہے۔“

”گڈ!..... یہ بہت اچھی بات ہے کہ تمہیں اتنا کچھ  
 آ گیا ہے۔ اب میں تمہیں دوسری پینٹنگ دکھاتی ہوں  
 وہ اٹھ کر پھر بیڈ کی طرف چلی گئی۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں  
 پکڑی پینٹنگ بیڈ پر رکھ دی اور وہاں سے دوسری پینٹنگ  
 اٹھا کر میرے پاس آ گئی اور سابقہ جگہ پر بیٹھنے کے بعد  
 نے پینٹنگ پہلے کی طرح ٹانگوں پر رکھ لی  
 بولی۔ ”لو..... اب اس منظر کو دیکھو۔“

میں اُس پینٹنگ کے منظر کو دیکھنے لگا۔ وہاں  
 چیزیں تھیں جو میں پہلی پینٹنگ میں دیکھ چکا تھا بس اُن  
 میں تین عجیب و غریب جانور کھڑے تھے۔ وہ انسان  
 مشابہت رکھتے تھے لیکن ان کے چہرے بہت خوفناک  
 تھے۔ ان کی بڑی بڑی گول آنکھوں میں جیسی سرخ آنکھیں  
 تھیں۔ کان ہاتھی کے کانوں کی طرح تھے۔ ناک کی جگہ  
 سوراخ تھے باقی نقشہ انسانوں جیسا تھا جب کہ ان  
 ہاتھ بن مانسوں کی طرح لمبے لمبے تھے اور باقی جسامت  
 عام انسانوں جیسی تھی۔

مجھے یاد آنے لگا کہ میں نے ان جانوروں کو بھی کہیں  
 دیکھا ہے۔ میں نے جولیٹ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”مجھے  
 محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے ان جانوروں کو بھی کہیں  
 حقیقت میں دیکھا ہے۔“

”ہاں..... تم نے انہیں دیکھا ہے۔“ وہ گہری نظر  
 سے مجھے دیکھتے ہوئے پراسرار انداز میں بولی۔

”کہاں دیکھا ہے؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”یہ ابھی تمہیں یاد آ جائے گا لیکن اس سے قبل تم آخر  
 پینٹنگ بھی دیکھ لو۔“ وہ اٹھی اور بیڈ کی طرف چلی گئی۔ اُس  
 نے اپنے ہاتھ میں پکڑی پینٹنگ وہاں رکھ دی اور وہاں  
 رکھی پینٹنگ اٹھا کر میرے پاس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی  
 پینٹنگ میرے سامنے کرتے ہوئے بولی۔ ”لو اب  
 اس منظر کو بھی دیکھو۔“

میں نے پینٹنگ پر نظر ڈالی۔ اس میں بھی وہی منظر

دکھایا گیا تھا لیکن پہلے تین جانور تھے جب کہ اب ان  
 تین جانوروں کے عقب میں ان جیسے بے شمار جانور  
 کھڑے تھے۔  
 ”کیا اب بھی تمہیں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ منظر تم  
 نے دیکھا ہے؟“ جولیٹ بولی۔

میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہاں مجھے ایسا محسوس  
 ہو رہا ہے۔“  
 ”دیری گڈ!“ کہتے ہوئے اس نے پینٹنگ میرے  
 سامنے سے ہٹا کر اپنے دائیں جانب صوفے پر رکھ دی۔  
 پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”اب میں تمہیں بتاتی ہوں  
 کہ تمہارا ان تصویروں سے کیا تعلق ہے۔ تم نے تین جانور  
 دیکھے تھے اب جو ایک ساتھ کھڑے ہیں؟“

”ہاں بالکل دیکھے ہیں۔“ میں نے بلا توقف جواب  
 دیا۔  
 ”ان میں سے دو درمیان والے تم ہو۔“ اس نے جواب  
 دیا تو میں اچھل پڑا اور بولا۔

”یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟..... تم ہوش میں تو ہو  
 نا؟“  
 ”میں بالکل ہوش میں ہوں۔“ اس نے جذبات سے  
 عاری لہجے میں جواب دیا۔

”اگر تم ہوش میں ہو تو سوچو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ میں  
 نے کہا۔

اُس نے مجھ پر نظریں مرکوز کر کے مستحکم لہجے میں کہا۔  
 ”میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ بالکل درست ہے۔“  
 ”اوہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ ایک جانور ہے جس  
 سے تم مجھے مل رہی ہو؟“ میں نے بیزار سی کہا۔  
 ”وہ جانور نہیں ہے۔ وہ تم ہی ہو۔“ وہ اب بھی اپنے  
 موقف پر قائم تھی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ذہنی مریضہ ہے اس لیے میں نے  
 اس کے ساتھ نرم رویہ رکھ کر اور اُسے بہلا پھسلا کر یہاں  
 سے چلے جانے کا ارادہ کیا۔ میں نے اُس سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ چلو میں مان لیتا ہوں کہ وہ میں ہی ہوں  
 لیکن اب کیا کیا جاسکتا ہے؟“  
 ”اب تمہیں واپس چلنا ہے۔“ وہ بولی۔  
 ”واپس..... کہاں؟“ میں نے بھوئیں سکڑ کر اس کی  
 طرف دیکھا۔

اُس نے پینٹنگ اٹھا کر اپنی ٹانگوں پر رکھ لی اور صوفے  
 کی پشت گاہ سے ٹیک لگانے کے بعد میری طرف دیکھ کر  
 بولی۔ ”اب تمہیں واپس اپنی دنیا میں چلنا ہوگا۔“  
 ”لیکن میری دنیا ہے کہاں؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”وہ ایک ستارہ ہے تم اصل میں وہیں کے باشندے  
 ہو۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے اُس کی ہاں میں ہاں ملانا ضروری سمجھا اور  
 بولا۔ ”لیکن اب تو میں انسانی شکل میں ہوں بھلا میں  
 اب واپس کیسے جاسکتا ہوں؟“  
 ”تم بے فکر رہو..... جس طرح آئے تھے اسی طرح  
 واپس بھی چلے جاؤ گے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں کس طرح آیا تھا؟“ میں نے ایک سوال کیا۔  
 ”ایک اڈن طشتری کے ذریعے اور اب اس کے  
 ذریعے واپس بھی جاؤ گے۔“ اس نے میری طرف دیکھ  
 کر جواب دیا۔ وہ کھڑی تھی۔ اُس نے اپنی بات کہنے  
 کے بعد بیڈ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ میری نظریں اس  
 پر تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ اب اس سے کس طرح جان  
 چھڑاؤں۔

اُس نے بیڈ پر رکھی باقی دو پینٹنگز بھی اٹھالیں اور تمام  
 پینٹنگز کو ایک کونے میں الماری کے اوپر رکھ دیا۔ پھر وہ  
 میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے میز پر سے سگریٹ کا  
 پیکٹ اور لائٹراٹھا کر ایک سگریٹ سلگایا اور کچھ کش لینے  
 کے بعد میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”اب ساری باتیں  
 تفصیل سے سن لو تا کہ تمہارے دل میں کوئی تجسس کوئی  
 تشفی نہ رہ جائے۔ یہ آج سے تقریباً پینتیس برس پہلے کی  
 بات ہے اس وقت تم ہمارے ستارے پر رہتے تھے۔ اس



کا نام "مارشر" ہے۔ ہماری زبان میں مارشر طاقت ور کو کہتے ہیں۔ تم وہاں کے حکمرانوں میں سے ایک ہو تم نے جو تین جانور تصویر میں دیکھے ہیں ان میں درمیان والے تو تم ہو جب کہ تمہارے دائیں اور بائیں تمہاری بھائی کھڑے ہیں تم نے ان سے ایک مرتبہ خواہش ظاہر کی تھی کہ تمہیں یہ زمین بہت پسند آئی ہے اور تم کچھ عرصہ یہاں گزارنا چاہتے ہو۔ مارشر پر رہنے والی ہماری قوم زمین پر رہنے والے انسانوں سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ ہم میں سے کئی مارشر یعنی اس ستارے پر رہنے والے جانور یا جو بھی تم کہو لہذا اس زمین پر اپنی اڑن فطرتوں میں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں تم بھی اس طرح آئے تھے اور یہ زمین تمہیں بہت اچھی لگی تھی تم نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ تم کچھ عرصہ اس زمین پر رہنے کے خواہش مند ہو۔ انہوں نے تمہیں اجازت دے دی تھی لیکن اب ان کی خواہش ہے کہ تم واپس وہاں پہنچ جاؤ اور تمہیں واپس لے جانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے۔ یہ بھی بتا دوں کہ اس زمین پر تم اکیلے نہیں آئے تھے بلکہ تمہارے ساتھ کچھ اور مارشریوں نے بھی ایسی ہی خواہش کا اظہار کیا تھا اور انہیں بھی یہاں رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اب وہ لوگ بھی اس دنیا کے مختلف ممالک میں موجود ہیں اور سب ہی مصوری کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تم سب یہاں آئے تھے تو یہی طے ہوا تھا کہ جب تم لوگوں کو واپس بلانا ہوگا تو میں تمہیں لینے آؤں گی اور دنیا کی ایک عظیم مصورہ کے طور پر سامنے آؤں گی۔ تم لوگ میری طرف متوجہ ہو جاؤ گے اور مجھ سے رابطہ کر لو گے پھر ہم یہاں سے جانے کا ایک پروگرام طے کر لیں گے اور اس کے مطابق مارشر پر واپس چلے جائیں گے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا لیکن مجھے تو بڑی مشکلات درپیش آ رہی ہیں۔ تم میں سے کئی ایک اپنا ماضی بھول چکے ہیں اور مجھے سب کو اس طرح باتیں یاد کرانا پڑ رہی ہیں جس طرح میں نے

تمہیں کرائی ہیں۔"

"مجھے تو سب یاد آ گیا ہے۔ بس اب تم طے کر لو کہ ہمیں کب اور کس طرح واپس جانا ہے۔" میں نے اُسے بہلاتے ہوئے کہا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک ایسی ذہنی مریضہ ہے جس کا من بہت بڑا ہونا چاہیے۔ ساتھ ہی مجھے یہ شک بھی ہو رہا تھا کہ شاید اس نے کوئی ذہنی مشقتیں کی ہیں جن کی وجہ سے اُس کی آنکھوں میں کوئی اثر آ گیا اور اسی اثر کے تحت میری ذہنی کیفیت بدلی تھی۔ بس مجھے یہ بات پریشان کر رہی تھی کہ آخر مجھے دکھائی جانے والی بیننگز دیکھ کر مجھے یہ کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے وہ مناظر حقیقت میں بھی دیکھے ہیں۔ میں نے سوچا کہ ایسا یقیناً میری بدلی ہوئی ذہنی کیفیت کی وجہ سے ہوا ہوگا یا اس کی ایسی ہی کوئی وجہ ہوگی۔ میں کسی طور پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ جولیت نے جو کچھ کہا ہے اُس میں ایک فیصد بھی درست ہے۔

اُس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "میرے حساب سے اس زمین پر موجود اپنے تمام ساتھیوں کو سمیٹنے اور انہیں واپس جانے پر آمادہ کرنے میں مجھے ایک دو مہینے لگ جائیں گے۔ تب تک میں یہاں سے جانے کا کوئی حتمی پروگرام بنالوں گی جو کہ تمہیں بھی بتا دیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے تم مجھے بتا دینا۔" میں نے کہا۔ "ویسے اگر اجازت ہو تو میں جاؤں مجھے دراصل کچھ ضروری کام کرنے ہیں ایک دوست کو اسٹوڈیو پہنچنے کا وقت دیا تھا وہ بھی کچھ دیر بعد آنے والا ہوگا؟"

"ٹھیک ہے۔ اگر تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔ مجھے جب تم سے رابطہ کرنا ہوگا کر لوں گی۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے تم کر لینا رابطہ۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا کہ اُس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی تھی ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ اُس سے جان چھڑانا کافی مشکل ہو جائے گا۔

وہ میرے ساتھ کمرے کے دروازے تک آ گئی اور

مہرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "ویسے مناسب ہوگا کہ تم میری اور اپنی باتیں کسی اور سے نہ کہو۔"

"میں نہیں کہوں گا۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ وہ مسنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "اگر تم کہہ گے تو لوگ تمہیں پاگل سمجھیں گے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ تم بے فکر رہو مجھے خود کو بے خوف کہلانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ویسے اگر تم کھانا بھی کھا کر جاتے تو بہتر تھا؟" اُس نے پیش کش کی۔

"نہیں شکریہ! کھانا ہم پھر کسی وقت کھالیں گے۔" میں نے فوراً کہا۔ اب میں کسی بھی وجہ سے وہاں رُکنا نہیں چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی! وہ بولی اُس نے دروازہ کھول دیا۔

"گڈ بائے!" کہنے کے بعد میں کمرے سے باہر آ گیا اور اُس پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے لفٹ کی جانب چل پڑا۔ مجھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

میں لفٹ کے پاس پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ آٹھویں منزل پر لڑکی ہوئی ہے۔ یہاں کچھ لوگ لفٹ کے انتظار میں کھڑے تھے اُس کے باوجود مجھے اس جگہ سے اب بڑی وحشت سی ہو رہی تھی۔ میرے اندر جولیت کا خوف بیٹھ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک کئی بار میں سڑکراس کے کمرے کی جانب دیکھ چکا تھا۔

اپنی وحشت کی وجہ سے میں نے وہاں رُکنا گوارا نہ کیا اور تیزی سے میڑھیوں کی جانب لپکا اور پھر میں یوں تیزی کے ساتھ میڑھیاں بھلا نکلنے لگا جیسے کوئی بدروح میرا تعاقب کر رہی ہو۔

ذرا ہی دیر بعد میں گراؤنڈ فلور پر آ گیا اور تیز تیز قدموں سے بیرونی دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

میں عمارت سے باہر آ کر بنا کوئی لمحہ ضائع کیے اپنی کار

میں آن بیٹھا اور پھر میں نے فوراً اسے اشارت کر کے چل دیا۔

میں نے ہوٹل کی عمارت سے باہر آ کر کچھ دور جانے کے بعد عقب نما آئینے میں ہوٹل کی دور ہوئی عمارت کو دیکھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ایسا قبرستان ہو جہاں کے مردے قبر سے نکل کر میرے تعاقب میں بھاگے ہوں اور میں ان سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

کافی دور آ جانے کے بعد مجھے کچھ سکون محسوس ہوا۔ میں سوچنے لگا کہ جب میں جولیت سے ملنے جا رہا تھا تو کتنا خوش اور پُر جوش تھا۔ میں اُس سے ہر حال میں مل لینا چاہتا تھا لیکن اب میری خواہش تھی کہ میں زندگی میں کبھی بھی اس کی شکل نہ دیکھوں۔ وہ ایک ذہنی مریضہ تھی اور ایسے مریضوں کے بارے میں میری معلومات یہ تھیں کہ یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں حتیٰ کہ ان کے لیے کسی کو قتل کرنا بھی قطعاً مشکل نہیں ہوتا۔

میں اپنے اسٹوڈیو پہنچا تو مجھے دیکھ کر کشمکش کے چہرے پر استغابہ تاثرات آ گئے۔ اُس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے کہا۔

"ارے سر!..... آپ اتنی جلدی واپس آ گئے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ جولیت کے ساتھ لُچ کر کے آئیں گے؟"

میں اس پر اپنی کیفیت واضح نہیں ہونے دینا چاہتا تھا اس لیے میں نے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ بکھیری اور بولا۔ "وہ تو مجھے لُچ کے لیے روک رہی تھی لیکن اُس کے کچھ دوست آ گئے وہ کچھ اُلجھن سی محسوس کر رہی تھی اس لیے میں نے اُس سے یہاں نہ کیا کہ مجھے ضروری کام ہیں اور یوں اس سے اجازت لے کر میں آ گیا۔"

"سر!..... ویسے ایک بات ہے کہ آپ کی خواہش بڑی آسانی سے پوری ہو گئی۔ میرا مطلب ہے کہ جولیت سے ملنے کے لیے آپ کو کوئی تک و دو نہیں کرنی پڑی اور یہ کام خود بخود آسانی کے ساتھ ہوتا چلا گیا۔" اُس نے مسکرا کر



اکتھار خیال کیا۔

”ہاں۔“ میں نے پھر مصنوعی مسکراہٹ کا سہارا لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس طرح زندگی میں کبھی کبھار ہی ہوتا ہے کہ جب انسان کی خواہش از خود پوری ہو جاتی ہے۔“

”ایسے لوگوں کو خوش قسمت ہی کہا جاسکتا ہے۔“ اس نے مسکا لگاتے والے انداز میں کہا۔

”ہاں بالکل۔“ میں مسکرا دیا اور پھر اپنے روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میرے لیے وہ سکی لے آؤ۔“

”بہتر ہے سہرا۔۔۔۔۔ ابھی لے کر آیا۔“ وہ بولا۔

میں اپنے روم میں آنے کے بعد صوفے میں جھنس گیا۔ میرے ذہن سے اب تک جو لیٹ چکی ہوئی تھی۔ میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور جو لیٹ کے ساتھ ہونے والی باتوں پر غور کرنے لگا۔ مجھے اس کی سنائی ہوئی کہانی پر حیرت ہو رہی تھی۔ اُس نے مجھے نہ صرف کسی ستارے کی مخلوق قرار دے دیا تھا بلکہ اپنی بات کے ثبوت کے طور پر اس نے مجھے پیشکش بھی دکھائی تھیں اور ان میں مجھے بھی کھڑا ہوا بتایا تھا۔

اب میرے اعصاب پر سکون ہو چکے تھے اس لیے میں اُس کی باتوں پر مسکرا دیا۔ اُسی وقت لکشمی کی بوتل لے کر آ گیا۔ اُس نے ایک پیگ بنا کر مجھے چھو دیا۔

کچھ شراب پی لینے کے بعد میں حریف سکون ہو گیا اور اپنی ایک نامکمل تصویر کھل کرنے لگا۔

—

تین دن گزر چکے تھے۔ جو لیٹ کو کافی حد تک اپنے ذہن سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس وقت اپنے اسٹوڈیو میں ایک تصویر پر کام کر رہا تھا کہ اچانک میرے موبائل فون کی بیل بج اُچی جس کی وجہ سے میرا ہاتھ کام کرتے کرتے ٹک گیا۔ میں نے ایزل اور برش قریب ہی موجود اسٹول پر رکھ دیا اور وہیں بڑے موبائل کو اٹھایا اس کے اسکرین پر نظر ڈالی اتنا ناخبر تھا۔ میں نے سوچا

کہ شاید کسی دوست نے نیا نمبر لیا ہوگا۔ مگر میں نے اس کے بعد میں نے فون کان سے لگا کر ”ہیلو“ کہا۔

”کیسے ہو پرکاش؟۔۔۔۔۔ جو لیٹ بول رہی ہوں۔ جو لیٹ کی آواز نے جیسے مجھے ساکت کر کے رکھ دیا۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ بولی۔“ کیا بات ہے پرکاش!۔۔۔۔۔ تم بات نہیں کر رہے ہو؟“

”ہاں ہاں۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ ہاں بولو کیسی ہو؟“ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سے ملاقات کرنا چاہ رہی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔

”ملاقات؟“ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کوئی کڑوی گولی منہ میں رکھ لی ہو۔ ”دراصل۔۔۔۔۔ میری کچھ مصروفیت چل رہی ہے اس لیے میں تم سے معذرت چاہوں گی۔“

”دیکھو بھئی! ملنا ضروری ہے اور ویسے بھی اب تمہیں اپنی یہ تمام مصروفیات تو ختم کر لی ہی پڑیں گی کیوں کہ میں نے واپسی کا پروگرام ترتیب دے لیا ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ کب تک آرہے ہو میرے پاس؟“ وہ بولی۔

”تم تو دونوں کے لیے یہاں آئی تھیں۔“ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ تو میرا ظاہری پروگرام تھا لیکن میں نے دراصل تمہارے لیے یہاں آئی تھی اور پھر واپسی کا پروگرام بھی قائل کرنا تھا۔ اس لیے میرا یہاں رہنا ضروری تھا۔“ اُس نے کہا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تمہیں اپنے ماضی کی باقی باتیں بھی یاد آگئی ہیں یا نہیں؟“

میں سوچنے لگا کہ اُسے کیا جواب دوں۔ پھر میں نے اُس سے جان چھڑانے کا فیصلہ کرتے ہوئے قدرے روکے انداز میں کہا۔ ”دیکھو میں جو لیٹ!۔۔۔۔۔ میں تو اب سمجھ کر تم سے ملنے کا خواہش مند تھا کہ تم ایک بڑی مصروف ہو لیکن تم سے ملاقات کے بعد مجھے احساس ہوا کہ شاید تمہارے ذہن میں کوئی خلل ہے۔ بہر حال۔۔۔۔۔ مجھے

تمہاری خواہشات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بس میں یہ چاہتا ہوں کہ اب آئندہ تم سے ملاقات نہ کروں اس لیے مناسب یہی ہوگا کہ آئندہ تم مجھ سے رابطہ نہ کرو۔“

میرا خیال تھا کہ میری بات پر وہ چراغ پا ہو جائے گی اور مجھ سے سخت لہجے میں کچھ کہے گی لیکن میری توقع کے برعکس مجھے اس کی ہنسی سنائی دی۔ وہ بولی۔

”مسٹر پرکاش!۔۔۔۔۔ میں تمہاری پرابلم جانتی ہوں۔ ہمیں میں رہنے والے ہمارے ایک ساتھی ڈیاگنک کے ساتھ بھی یہ معاملہ ہو گیا تھا۔ اُس کے ذہن سے بھی اپنا ماضی نکل چکا تھا میں نے اُسے بڑی مشکلوں سے یاد دلایا کہ درحقیقت وہ کون ہے۔ اب اُسے سب کچھ یاد آ چکا ہے اور وہ واپس جانے کے لیے تیار ہے۔ اسی طرح تم بھی تیار ہو جاؤ گے۔“

”تم میرا خیال تو ذہن سے بالکل نکال دو میں کہیں نہیں جانے والا۔“ میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

وہ دھیرے سے ہنس کر بولی۔ ”ایسی ہی باتیں ڈیاگنک بھی کر رہا تھا۔“

”مجھے کسی ڈیاگنک سے کچھ نہیں لینا دینا۔“ اب میرا لہجہ حریف تلخ ہو گیا تھا۔

”اچھا دیکھو! وہ ملائم لہجے میں بولی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ تم ابھی میرے پاس ہوں چلے آؤ لہجے ہم ساتھ ہی کر لیں گے حریف بات چیت بھی ہو جائے گی۔“

”تمہاری عقل میں میری بات نہیں آئی؟“ میں نے نہایت سختی کے ساتھ کہا۔ ”میں نے کہا ناں کہ میں تم سے نہیں ملنا چاہتا۔“

”ادکے۔۔۔۔۔ جیسی تمہاری مرضی۔“ اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے فون کان سے ہٹا دیا۔ میں اس وقت کافی طیش میں تھا۔ میں نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی فون اسٹول پر رکھ دیا اور گلاس میں موجود وہ سکی کے کچھ ٹکڑے معلق سے اُتار لیے۔ پھر میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور

اپنے سامنے موجود کینوس پر ادھوری تصویر کی طرف پوری طرح متوجہ ہونے کی کوشش کرنے لگا تا کہ جو لیٹ کی طرف سے میرا ذہن ہٹ جائے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ لکشمی بغیر دستک دیئے اندر آ جائے لیکن اب دروازہ کھل گیا تھا میں اپنے کام کی طرف متوجہ تھا لیکن اس طرح کی حرکت کے بعد میں نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا ذہن اُچھل کر معلق میں آ گیا ہے کیوں کہ میرے سامنے جو لیٹ کھڑی تھی۔

”قت۔۔۔۔۔ تم؟“ میں نے یہ مشکل کہا۔

”ہاں میں۔“ وہ معنی خیز اور پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”میں نے سوچا کہ تم آنے میں پس و پیش کر رہے ہو تو میں خود تمہارے پاس پہنچ جاتی ہوں۔ تم تو مجھے اندر آ کر بیٹھنے کے لیے شاید نہیں کہو گے اس لیے میں خود ہی آ جاتی ہوں۔“ اس نے کہا اور دروازہ بند کرنے کے بعد میرے قریب آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اُس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم شاید یہ سوچ رہے ہو گے کہ تمہارے سیکریٹری نے مجھے نہیں روکا ایسی بات نہیں ہے۔ اس نے مجھے باہر روکنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اُسے بے ہوش کر دیا۔“

”بے ہوش کر دیا؟“ میں نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”میں نے سوچا کہ میں اور تم آرام سے بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔“

”ادہ۔۔۔۔۔“ میں نے برش اور ایزل اسٹول پر رکھتے اور اٹھتے ہوئے کہا۔ ”پتہ نہیں وہ کس حال میں ہوگا۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا اور ابھی میں نے دروازے کی طرف ایک قدم ہی بڑھایا تھا کہ جو لیٹ نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اُس کی طرف غصیلی نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔ ”تم تو خواہ مخواہ میرے لیے درد سہتی جا رہی ہو۔ تم

33

ADVENTURE MONTHLY

32

ADVENTURE MONTHLY



**We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers**

**If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com**

or

**send message at  
0336-5557121**

میں نے اپنے آفس کے طور پر یہ فلیٹ ہی کرائے پر لے رکھا تھا۔  
وہ مجھے واپس میرے روم میں لے آئی۔ ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے تو اس نے نہایت سخت لہجے میں مجھ سے کہا۔  
”دیکھو مسٹر پرکاش!۔۔۔ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں نے واپس جانے کا حتمی پروگرام ترتیب دے لیا ہے۔ میں اپنے کچھ کاموں میں اب بھی ہوئی تھی اس لیے میں نے تم پر اب تک پوری توجہ نہیں دی تھی لیکن اب چوں کہ میں نے جانے کا فائنل پروگرام بنالیا ہے اس لیے تم سے یہ ملاقات ضروری تھی۔ میں تمہیں مطلع ہی کرنے آئی ہوں کہ واپس جانے کے لیے اپنے آپ کو پوری طرح تیار کر لو۔“  
میرا جی تو چاہا کہ میں اپنے سامنے سینئر نیبل پر پڑی سبک مرمر کی انش ٹرے اٹھا کر اس کے منہ پر مار دوں لیکن اس کی کارروائیوں کی وجہ سے میں اس سے کافی خوف زدہ ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش نہیں کی اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم آخر میرے پیچھے کیوں پڑی گئی ہو؟“  
”اس لیے کہ میں تمہیں واپس لے جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے ترش لہجے میں جواب دیا۔  
”کہاں؟“ میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا اور چیخ اٹھا۔  
”کہاں واپس لے جانا چاہتی ہو؟ جب سے تم مجھے ملی ہو تم نے یہ بکواس لگا رکھی ہے کہ میں واپس جانا ہے۔ میں اس زمین کا باشندہ ہوں نہیں پیدا ہوا ہوں اور یہیں مردوں گا۔“  
”پیدا ہوئے نہیں ہو بلکہ پیدا کیے گئے ہو اس نے گویا میری صبح کی۔“  
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ میں نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

نے پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا کیا ہے کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ تم نے اسے چوٹ تو نہیں ماری ہے؟“  
”نہیں، نہیں۔“ وہ ملائم لہجے میں بولی۔ ”میں نے اسے اپنی آنکھوں کی طاقت سے بے ہوش کیا ہے۔“  
”آنکھوں کی طاقت سے؟۔۔۔ وہ کس طرح سے۔“ میں نے بھویں سیکڑ کر اس کی طرف دیکھا۔  
”تمہیں ابھی پوری طرح اپنا ماضی یاد نہیں آیا ہے۔ اگر آ جاتا تو تم یہ سوال نہ کرتے بہر حال میں تمہاری اطلاع کے لیے بتا دیتی ہوں کہ مارشریوں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کی طاقت سے بہت کام لے سکتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں کی طاقت سے ہی لکشمین کو بے ہوش کیا ہے۔ تم بے فکر ہو آسے کوئی چوٹ نہیں آئی ہے اور نہ ہی کوئی تکلیف ہوئی ہے۔ بس یوں سمجھو کہ وہ گہری نیند میں چلا گیا ہے اور اب کم سے کم دو گھنٹے تک اسے ہوش نہیں آئے گا۔“  
”لیکن میں اسے دیکھنا ضرور چاہوں گا۔“ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔  
”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ آؤ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔  
ہم دونوں روم سے باہر آ گئے۔ استقبالیہ کمرے میں پہنچ کر میں نے لکشمین کو صوفے پر لیٹے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اس کا سانس چیک کیا جو بحال تھا پھر اس کی نبض ٹولی وہ بھی درست طور پر حرکت کر رہی تھیں۔ میں نے ایک گہرا سانس لے کر جولیٹ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔  
اس سے قبل کہ میں اس سے کچھ کہتا وہ بولی۔  
”تسل ہو گئی تمہاری؟“ پھر مجھے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”آؤ اب واپس چلتے ہیں۔ تم اب بالکل بے فکر رہو۔ میں نے فلیٹ کا بیرونی دروازہ اندر سے بند کر دیا ہے کوئی اندر نہیں آ سکتا۔“



"مطلب یہ کہ بظاہر تمہاری پیدائش ایک عام انسان ہی طرح ہوئی ہے لیکن تم درحقیقت مارشردی ہو۔"

"اوہ۔" میں نے اپنا سر ہٹا لیا۔ "میں تنگ آ چکا ہوں تمہارے اس راگ سے۔"

"یہ راگ نہیں حقیقت ہے۔ جب تم لوگوں نے اس زمین پر رہنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس وقت یہی طے ہوا تھا کہ تم لوگ اس دنیا میں کسی عورت کے پیٹ سے عام بچوں کی طرح پیدا ہو گے اور پھر تیس ہشتیس سال یہاں گزار کر واپس اپنی دنیا میں چلو گے۔ اس وقت ہمارے جن دانشوروں نے یہ فیصلہ کیا تھا اس وقت کے لحاظ سے تو وہ بالکل درست تھا لیکن اب ذرا گزیر ہو گئی ہے اور اس کی وجہ وہ ادویات ہیں جو انسانوں نے گزشتہ کچھ عرصے میں بنائی ہیں۔ یہ وہی ادویات ہیں جو کہ آج کل کے ایلو پیتھک ڈاکٹر دیتے ہیں اس کے علاوہ گندم چاول وغیرہ کی فصلوں میں جو کھادیں استعمال ہو رہی ہیں اور فصلوں پر جو اسپرے کیا جا رہا ہے وہ بھی تم لوگوں کے دماغوں پر اثر انداز ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ تم لوگوں کے دماغوں کا وہ حصہ جس میں تمہاری یادیں محفوظ رہتی تھیں نئی طرح متاثر ہوا ہے اور مجھے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ بہر حال میں نے مارشر کے دانشوروں کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک دوا بھیج دی ہے۔" اس نے اپنے پرس میں سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے وہ دوا۔۔۔۔۔ تم اس کے چند قطرے پیو گے تو تمہیں اپنا ماضی پوری طرح یاد آ جائے گا۔"

اب مجھے جو لیٹ سے کچھ زیادہ ہی خوف ہونے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جتنی مریض ہے اور اب مجھے ایسا لگا کہ کہیں وہ اس شیشی میں زہر ہی نہ لے آئی ہو۔ میں نے اس سے پیار سے نمٹنے کا فیصلہ کیا اور بولا۔ "دیکھو جو لیٹ!۔۔۔ میں اگر یہ مان لوں کہ تم بالکل درست کہہ رہی ہو تو ایسی صورت میں میں تم سے ایک پلٹ ضرور کہتا

چاہوں گا۔"

"وہ کیا؟" اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"میرا ماضی چاہے کچھ بھی ہو لیکن اب میرا دل اس دنیا سے اس زمین سے لگ چکا ہے میں واپس نہیں جانا چاہتا۔" میں نے جواب دیا۔

اس کی بھوس بھوس گئی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "یہ ناممکن ہے۔ تمہیں واپس جانا ہی ہوگا۔"

"دیکھو!۔۔۔۔۔ تمہیں میرے جذبات کا کوئی احساس نہیں ہے؟" میں نے بلا اشتعال کہا۔

"جذبات کا احساس ہے بالکل ہے۔" وہ بولی۔ "تم ہمارے ستارے کے باشندے ہو وہاں کے حکمرانوں میں سے ہو۔ میں تمہارے جذبات کا پورا پورا احساس کر رہی ہوں اور تم سے بہت رعایت بھی کر رہی ہوں تب ہی اب تک تم صحیح سلامت ہو اور میں نے تم سے کوئی زور زبردستی نہیں کی ہے۔ فی الحال تو میری یہ خواہش ہے کہ میں سیدھے طریقے سے اس کام کو ختم کروں۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہاری یادداشت درست طور پر کام کرنے لگے اور اگر ایسا ہو گیا تو میری ساری مشکلیں ختم ہو جائیں گی۔ تم خود کو گے کہ تم واپس جانا چاہتے ہو اور یادداشت کے لیے میں چاہوں گی کہ تم اس دوا کے چند قطرے پی لو۔" اس نے شیشی والا ہاتھ ڈرا اوپر کرتے ہوئے کہا۔

میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ میں وہ دوا پیوں لیکن میں نے جو لیٹ کو دھوکا دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے میں یہ دوا پی لیتا ہوں لیکن اگر اسے پینے کے بعد بھی میری یادداشت درست نہ ہوگی تو؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"یہ دوا ہمارے دانشوروں نے خصوصی طور پر تیار کر کے بھیجی ہے اس کے بے اثر ہونے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔" وہ بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ کہ اسے کیسے پینا ہے؟" میرا

مطلب ہے کہ ویسے ہی چند قطرے پی لوں یا پانی وغیرہ میں ڈال کر پینے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ویسے ہی پی لو۔" وہ بولی۔

"دیکھو!۔۔۔۔۔ میں ایک شرط پر پیوں گا۔" میں نے کہا تو اس نے فوراً میری طرف دیکھا اور بولی۔

"کیا شرط ہے؟"

"اگر اس دوا کے بعد مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا تو تم یہاں سے چلی جاؤ گی اور مجھ سے کبھی رابطہ نہیں کرو گی؟" میں نے جوابی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے منظور ہے۔" وہ بولی۔ "لو۔۔۔۔۔ میں تمہیں چند قطرے دے رہی ہوں تم پی لو۔" وہ شیشی کھولتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے شیشی کے ڈھکنے میں تھوڑی سی دوا ڈال دی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ لو۔۔۔۔۔ پی لو۔"

میں اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے تھوڑا سا جھک گیا اور پھر میں نے اپنے قدم زمین پر جھاتے ہوئے کسی چپتے کی طرح اس پر جست لگا دی۔ میں ہوا میں اڑتا ہوا اس پر گرا اور صوفہ پیچھے کی جانب لڑھک گیا۔

گرنے کی وجہ سے میرا سر زور سے قالین سے ٹکرایا تھا اور میرے سر کو کافی چوٹ لگی تھی لیکن اس وقت یہ چوٹ ہی میرے لیے اہم مسئلہ نہیں تھی اس لیے میں اسے نظر انداز کرتے ہوئے تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر میں نے دروازے کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔

ذرا ہی دیر بعد میں نے دروازے پر پہنچ کر کڑے تیزی سے کھولا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

میں استقبال سے ہوتا ہوا باہر لاؤنج میں آ گیا اور پھر چھوٹی سی گیلری میں پہنچ گیا۔ استقبال میں میں نے کلکشن کو سابقہ حالت میں دیکھ لیا تھا۔

گیلری کے اختتام پر قلیٹ کا داخلی دروازہ تھا میں آقاخان اس تک پہنچ گیا اور پھر اپنی تیزی برقرار رکھتے ہوئے میں اسے کھول کر باہر کوریڈور میں نکل آیا۔ میں نے تیزی

سے دوڑتے ہوئے کوریڈور بھی عبور کر لیا۔ میرا یہ قلیٹ سیکنڈ فلور پر تھا۔ اس عمارت کی لفٹ گزشتہ ایک ہفتے سے خراب تھی لہذا اس جانب جانے کا تو کوئی جواز نہیں تھا۔

میں برق رفتاری کے ساتھ میڑھیاں اترتا چلا گیا اور غلط پھر پڑ جانے کی وجہ سے میں گر گیا۔ میں نے فوراً رینگ کر پکڑ لیا تھا اس لیے زیادہ نیچے نہیں گیا۔ اسی وقت میری نظر اپنی ممر رسیدہ پڑوسن مسز الیاس پر پڑی جو میڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہی تھیں۔

"ارے پرکاش!۔۔۔۔۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں خیر تو ہے؟"

انہوں نے تیزی سے میڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کپڑے درست کرتا ہوا ان سے بولا۔ "بس میں ایک کام کے لیے جلد از جلد نیچے جانا چاہتا تھا۔"

"چوٹ تو نہیں آئی تمہیں؟" وہ بولیں۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا حالانکہ مجھے دائیں گھٹنے میں شدید چوٹ لگی تھی۔

"اچھا اب ذرا احتیاط سے جاؤ۔" انہوں نے کہا۔

میں رینگ پکڑ کر میڑھیاں اترنے لگا۔ میں میڑھیوں کے اختتام پر پہنچا تو سامنے کپاؤنڈ میں کچھ بچے کھیل رہے تھے وہیں ادھر ادھر کی گاڑیاں کھڑی تھیں اور لوگ بھی نظر آرہے تھے۔ میں رُک گیا اور اوپر میڑھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ جو لیٹ میرے تعاقب میں نہیں آئی تھی۔

مجھے خیال آیا کہ اپنے دوستوں میں سے کسی کو حالات بتاؤں لیکن پھر میں نے سوچا کہ کوئی بھی میری باتوں پر یقین نہیں کرے گا بلکہ میری ذہنی حالت پر شک کیا جائے گا۔

ذرا دیر بعد میرے حواس بحال ہو گئے۔ مجھے کلکشن کی فکر بھی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ جو لیٹ کہیں اس کو نقصان نہ پہنچا دے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میں اس سے کافی خوف زدہ ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے قابو کرنے



**We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers**

**If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com**

**or**

**send message at  
0336-5557121**

**www.Paksociety.com**

آواز کو سننے کی کوشش کی لیکن وہاں مکمل سکون طاری رہا۔ میں نے اب تک اندر کی کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ آخر جولیٹ کوئی حرکت کیوں نہیں کر رہی ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید وہ میری گھات میں بیٹھی ہو۔

میں نے اپنا حوصلہ مزید مضبوط کیا اور آہستہ آہستہ قلیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ گیلری میں میرا ایک بڑا انا اسٹینڈ دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ میں نے اُس کا جائزہ لیا۔ میں اگر اُسے توڑتا تو ایک مضبوط لکڑی میرے ہاتھ آ سکتی تھی اور میں اُسے جولیٹ کے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔

میں نے وہ اسٹینڈ تو توڑ ڈالا اور لکڑی حاصل کر لی۔ اب میرا حوصلہ از خود کچھ بلند ہو گیا۔ میں آہستہ آہستہ اندر کی جانب بڑھا۔ پھر میں استقبالیہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ لکشمی حسب سابق اپنی جگہ پر بے خبر لیٹا ہوا تھا۔

میں اُس کے پاس سے گزرتا ہوا مزید اندر کی جانب چلا گیا۔ پھر میں اپنے روم کے دروازے پر آ گیا جو آدھا کھلا ہوا تھا۔ میں نے محتاط انداز میں روم کے اندر جھانکا لیکن وہاں کہیں بھی مجھے جولیٹ نظر نہیں آئی۔

میں نے سوچا کہ کہیں وہ کسی صوفے کے پیچھے نہ چھپی بیٹھی ہو۔ میں آہستہ آہستہ روم کے اندر داخل ہو گیا اور پھر میں نے سارے صوفوں کے پیچھے دیکھ لیا جولیٹ کہیں نہیں تھی۔ کمرے میں اور کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے پیچھے وہ چھپ سکتی۔

”اس کا مطلب ہے کہ وہ قلیٹ میں کسی اور جگہ چھپ گئی ہے۔“ میں نے سوچا اور پھر میں روم سے باہر نکل آیا۔

ذرا دیر میں میں نے سارا قلیٹ چیک کر لیا لیکن جولیٹ کہیں نہیں ملی۔ یہ ثابت ہونے کے بعد کہ وہ قلیٹ سے جا چکی ہے میں کافی مطمئن ہو گیا۔

میں نے گیلری میں آ کر داخلی دروازے سے باہر کوریڈور میں جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دروازہ

کے بجائے راہ فرار اختیار کی تھی۔ بھاگنے سے پہلے میں نے صرف یہ سوچا تھا کہ مجھے جولیٹ کی دسترس سے دور ہونا ہے اور اب میں سوچ رہا تھا کہ اُس کے سلسلہ میں مزید کیا کروں اور کس طرح اُس سے لکشمی کو محفوظ رکھوں پھر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس قدر بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔

میں نے اپنا حوصلہ مضبوط کیا اور خود کو ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کے لیے تیار کر کے میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ پیری نگاہ مسلسل اوپر کی جانب تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے جولیٹ میرے سامنے آ جائے گی۔

بالآخر میں اپنے فلور پر پہنچ گیا۔ کوریڈور میں کوئی نہیں تھا۔ میں اپنے قلیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے دل کی دھڑکنیں حالات کی سنگینی اور آنے والے کسی بھی ممکنہ خطرے کی وجہ سے بے ترتیب تھیں۔

کچھ دیر بعد میں اپنے قلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا اور محتاط انداز میں اندر جھانکنے لگا۔

اُسی وقت مجھے دائیں جانب سے آہٹیں سنائی دیں۔ میں نے گردن موڑ کر اس طرف دیکھا۔ سزالیاس اپنے قلیٹ سے باہر نکل رہی تھیں۔ ان کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ بولیں۔ ”پتہ نہیں یہ لفٹ کب تک ٹھیک ہوگی۔ سیڑھیوں سے اترنے چڑھنے میں بڑی پریشانی ہو رہی ہے۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ آج میں پھر راند میر سنگھ سے بات کروں گا کہ لفٹ جلد سے جلد درست کروائے۔“ میں نے کہا۔

راند میر سنگھ بلڈنگ کا آڑ تھا۔

”میں بھی بات کروں گی۔“ وہ بولیں اور اپنے دروازے کو مقفل کرنے کے بعد سیڑھیوں کی جانب ہٹیں۔

جب سے سزالیاس قلیٹ سے باہر آئی تھیں۔ مجھے کچھ حوصلہ محسوس ہوا تھا۔ لیکن اب اس کے جانے سے پھر سابقہ خوف زدہ حالت ہونے لگی تھی۔

میں نے قلیٹ کے اندر جھانکتے ہوئے کسی آہٹ یا







میں نے اُسے جولیٹ کا سارا معاملہ بتا دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”معاملہ خامہ پیچیدہ تھا۔“

”جی ہاں..... مجھے اس میں مادی اور پراسرار پہلو بھی دکھائی دیتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ آپ سوچ سکتے ہیں۔ ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے میں ایسی باتوں پر نہیں سوچ سکتا۔“ اُس نے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا۔

”اوکے!..... آپ جس طرح بہتر سمجھیں سوچیں بس مجھے یہ مشورہ دیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”ہوں۔“ اُس نے ہنکارہ بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”آپ کے ساتھ زندگی میں پہلے کبھی ایسے واقعات پیش آئے ہیں؟“

”نہیں..... ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”پہلے کبھی آپ خوفناک خواب دیکھتے رہے ہیں یا اب بھی دیکھتے ہیں؟“

”جی نہیں..... میں نے شاید پوری زندگی میں ایک آدھ ہی ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا اور وہ بھی اپنے لڑکپن میں۔“ ”کبھی دماغ پر کوئی چوٹ تو نہیں لگی آپ کے؟“

”جی نہیں..... ایسا بھی نہیں ہوا۔“ ”زندگی میں کوئی ایسا سانحہ گزرا جس نے آپ کے دماغ پر اثر ڈالا ہو؟“

”ماتا پتا کے انتقال کے واقعات تھے لیکن اب ان کا دیہانت ہوئے بھی پندرہ سال ہو چکے ہیں۔“

”آپ ڈراؤنے ناول تو نہیں پڑھتے یا ڈراؤنی فلمیں تو نہیں دیکھتے؟“

”کبھی کبھار اگر ٹی وی پر کوئی ایسی فلم آرہی ہو تو دیکھ لیتا ہوں ویسے مجھے ایسے ناول پڑھنے یا ایسی فلمیں دیکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ ناول تو شاید میں نے کبھی ایسا کوئی پڑھا نہیں اور ٹی وی پر فلم دیکھے بھی کم سے کم دو ڈھائی

سال ہو چکے ہوں گے۔“

اُس نے ماتھا کھجایا اور ذرا سوچ کر بولا۔ ”میں آپ کو کچھ دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں وہ استعمال کریں اور کچھ ٹیسٹ ہیں وہ بھی کروالیں۔“

”اوہ ڈاکٹر صاحب!..... آپ نے تو مجھے مریض بتا دیا۔“ میں نے کہا۔ ”جب کہ آپ کی اصل مریضہ جولیٹ ہے۔“ ”جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہوگا۔“ اُس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر کہا۔

اُس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”آپ کے کس میں لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ کسی ایسے انسان کے ساتھ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا بہر حال..... آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے ایک ماہ کے اندر اندر آپ ٹھیک ہو جائیں گے اور یہ جولیٹ از خود عائب ہو جائے گی بس شرط یہ ہوگی کہ آپ میری ہدایات پر عمل کریں۔“ ”کیا ایسی کوئی صورت نہیں ہے کہ آپ حقیقت میں جولیٹ کو تسلیم کر لیں؟“ میں نے میز پر دونوں کہیاں رکھ کر اُس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ”پہلے آپ میری بات مان لیں۔ اگر ایک ماہ بعد بھی یہ جولیٹ عائب نہ ہوئی تو پھر میں آپ کی بات مان لوں گا۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب!..... آپ کو بھی یہ حقیقت مان لینی چاہیے کیوں کہ جولیٹ پلازا ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے آپ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

وہ پھر مسکرا کر بولا۔ ”میں مانتا ہوں کہ وہ ٹھہری ہوگی لیکن آپ جس جولیٹ کی بات کر رہے ہیں اس کا اس جولیٹ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ آپ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے کیوں انکار کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس لیے کہ..... میں ایک ماہر نفسیات ہوں اور یہ

ابھی طرح جانتا ہوں کہ میرے کس پیشفت کو کیا مرض ہے۔“ اُس کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔

میں نے پیچھے ہوتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی کمر کرسی کی پشت سے لگا دی۔

ڈاکٹر جلدیش نے اپنے رائٹنگ پیڈ پر کچھ دوائیں وغیرہ لکھیں اور پیڈ کا وہ کاغذ چھاڑ کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ دوائیں ہیں جو آپ نے بازار سے لے کر استعمال کرنی ہیں۔“

اُس نے دوسرے کاغذ پر حریف کچھ لکھنے کے بعد وہ بھی مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہیں وہ ٹیسٹ جو آپ کو کرانا ہیں اور ان کی رپورٹس مجھے دکھائیں گے۔“

میں نے وہ کاغذ بھی اس سے لے لیا اور پھر اُس کے بعد فیس ادا کر کے اس کے روم سے باہر آ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر جلدیش کسی حد تک درست کہہ رہا ہے اور پھر میں نے اُس کی ہدایات پر بھی عمل کرنے کا فیصلہ کیا تھا کہ اگر واقعی مجھے کوئی بیماری ہے تو اس کا تدارک ہو جائے اور ساتھ ہی میں نے اپنے طور پر جولیٹ سے نکلنے کا فیصلہ بھی کر لیا اور پھر ابھی مجھے یہ اُمید بھی باقی تھی کہ شاید لکشمی کوئی اچھی اطلاع لے کر آ جائے۔

میں نے راستے سے دوائیں خریدیں اور واپس اپنے فلیٹ پہنچ گیا۔ لکشمی اب تک نہیں آیا تھا۔ میں نے کافی تیار کی اور اپنے روم میں بیٹھ کر پینے لگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد لکشمی آ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”سر!..... میں باوا جگ موہن سے مل کر آ گیا ہوں۔“

”کیا کہا انہوں نے؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔“ اُس نے بتایا۔

”کب!..... ابھی چلنا ہے؟“

”شام سات بجے ہیں گے وہ۔“

”ٹھیک ہے ہم چھ بجے ہی یہاں سے نکل جائیں گے۔ ایک گھنٹے میں تو پہنچ جائیں گے ناں وہاں؟“

”جی ہاں سر آرام سے پہنچ جائیں گے۔“

”اوکے ہم چھ بجے نکل چلیں گے۔“

”مردہ ماہر نفسیات کا کیا ہوا..... ملاقات ہو گئی اس سے؟“ اُس نے پوچھا۔

”ہاں.....“ میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”ہو گئی اس سے ملاقات۔“

”کیا بات ہے سر..... آپ کچھ اداس سے ہیں کیا کہا ہے اُس نے؟“ وہ بولا۔

”مجھے شیزوفرینک سمجھتا ہے۔“

”شیزوفرینک؟“ وہ کچھ لکھن کا شکار ہو گیا۔

”ارے یار!..... نفسیات کی ایک بیماری ہے جسے شیزو فرینک کہتے ہیں اور اس بیماری کے متاثرہ مریض کو شیزو فرینک کہا جاتا ہے۔“

”اوہ..... اچھا۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”اس نے مجھے بھی مریض قرار دے دیا ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ شاید میں نفسیاتی مرض کا شکار ہو گیا ہوں۔ وہ میری کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھا اس لیے میں نے زیادہ بحث نہیں کی ورنہ میں اُسے تہہ را بھی حوالہ دیتا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں بھی مریض قرار دے دیتا یا کوئی اور ایسی ہی بات کرتا وہ جولیٹ کے معاملے کو پراسرار اور مادی ماننے کے لیے تو بالکل بھی تیار نہیں تھا۔“

اُس نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ ”یہ نفسیات کے ڈاکٹر ایسے ہی ہوتے ہیں سر!..... معاملہ چاہے کچھ بھی ہو وہ اسے صرف نفسیات کا مسئلہ ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”مجھے ڈاکٹر جلدیش سے بات کر کے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ بہر حال میں اُس کی ہدایات کو یکسر انداز میں نہیں کر رہا ہوں۔“

اُس کی بتائی ہوئی دوائیں لے آیا ہوں انہیں استعمال کروں گا اور اس کی دیگر ہدایات پر بھی عمل کروں گا اس



طرح اگر میں تھوڑا بہت نفسیاتی مریض ہوا بھی تو معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔

”یہ مناسب ہے۔“ وہ بولا۔

☆

شام چھ بجے میں اور لکشمی کار میں روانہ ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ لکشمی نے سنبھالی ہوئی تھی۔ میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ وہ ڈرائیونگ کرے کیوں کہ میرا دل ڈرائیونگ کو نہیں چاہ رہا تھا۔

ہم شہر کی حدود سے باہر آئے تو شام رخصت ہو رہی تھی اور اندھیرا سارے ماحول پر قابض ہو جانے کے لیے اپنے پر پھیلا رہا تھا۔

مزید دس منٹ کے سفر کے بعد لکشمی نے سڑک کے کنارے گاڑی روک لی۔ وہیں درختوں کو درمیان کچھ دور ایک روشن لائٹن نظر آ رہی تھی جو ایک کپے سے مکان کے باہر فٹے برآمدے میں لٹک رہی تھی۔

”وہ جولا لائٹن جل رہی ہے وہی بادا جگ موہن کا ٹھکانہ ہے۔“ لکشمی نے مجھے بتایا۔

ہم دونوں کار سے اترنے کے بعد اس ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ برآمدے میں ایک مفلوک الحال شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کالا چوٹا پن رکھا تھا۔ اس کے بال بکھرے اور اجڑے ہوئے تھے۔ شیو بڑھا ہوا تھا اس کی بھی کوئی ترتیب نہیں تھی۔ اس نے سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ ہنسنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ بادا جگ موہن ہے تو میرے معاملے کو کیا سمجھے گا کیوں کہ وہ تو خود اپنے حال سے بے گانہ دکھائی دیتا تھا۔

لکشمی نے وہاں نظر آنے والے لکڑی کے دروازے پر دستک دی۔

ڈراور بعد ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا۔ ”نستے ماتاجی!“ لکشمی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے اس سے کہا۔

”نستے..... جیتے رہو۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ اسی دوران

اس نے مجھ پر بھی نظر ڈالی تھی۔ ”آؤ..... اندر آ جاؤ۔“ اس نے ایک طرف ہوتے ہوئے لکشمی سے کہا۔

”آئیے سرا!“ لکشمی نے پلٹ کر مجھ سے کہا اور ہم دونوں اُس مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ سامنے ایک چھوٹا سا محن تھا جس میں ایک جلتی ہوئی لائٹن لٹک رہی تھی۔ سامنے ہی ایک اور دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ہم اس دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ بوڑھی عورت نے اس دروازہ پر ہلکی سی دستک دینے کے بعد کہا۔

”لکشمی اور اس کے ساتھی آئے ہیں۔“

”بیچ دو انہیں۔“ اُردو سے ایک بھاری مردانہ آواز آئی۔

بوڑھی عورت نے اندر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے لکشمی سے کہا۔ ”جاؤ اندر چلے جاؤ۔“

لکشمی نے دروازے پر ہاتھ ڈال کر اُسے کھول دیا۔ پھر جوتے اتارے اور اندر قدم رکھ دیا۔ اس کے بعد میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ یہاں بھی ایک جلتی ہوئی لائٹن موجود تھی جو ایک جانب لکڑی کے چوکھٹے پر رکھی تھی جب کہ زمین پر درزی چھمی ہوئی تھی۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک عمر رسیدہ آدمی بیٹھا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے بال تھے جن میں سے بہت کم ہی کالے رہ گئے تھے۔ یہی اُس کی واڈھی موچھوں کا حال تھا۔ اُس نے پہلے رنگ کا چوٹا پن رکھا تھا۔ اُس کے گلے میں چھوٹے بڑے موتیوں کی مالا لٹکی ہوئی تھیں لیکن یہ شخص باہر موجود شخص کی طرح گندا اور میلا نہیں بلکہ بہت صاف سہرا تھا۔

”نستے باداجی!“ لکشمی نے ہاتھ جوڑ کر اس سے کہا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”جیتے رہو جیتے رہو۔“

میں نے بھی انہیں نستے کہا اور انہوں نے لکشمی کی طرح مجھے بھی جواب دیا اور اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے تو لکشمی نے ان سے کہا۔ ”باداجی! یہ میرے مالک ہیں پرکاش جی!..... میں نے صبح آپ

سے ان ہی کے بارے میں بات کی تھی۔“

باداجی نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”تمہاری مانتا کیا نام ہے؟“

”سادتری!“ میں نے جواب دیا۔

”اور پتا کا؟“

”منوہر گھل!“

”ہوں۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ہنکارہ بھرا اور کچھ سوچنے لگے۔ پھر انہوں نے اپنے گلے سے سرخی موتیوں کی ایک مالا اتار لی اور اس کا موتی کھماتے ہوئے بڑبڑانے لگے۔ ساتھ ہی انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

کچھ دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں اور ایک گہرا سانس لینے کے بعد میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ تمہیں کچھ ہمت کرنا ہوگی۔“

”جی..... وہ کیا؟“ میں نے ان کی بات پر پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

”پرسوں امادس کی رات ہے تم اگر ایک خطرناک عمل کر ڈالو تو تمہاری زندگی محفوظ ہو سکتی ہے۔“

”وہ..... کیا عمل ہوگا؟“ میں نے سوال کیا۔

انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور ذرا سوچ کر بولے۔

”میں تمہیں ایک خنجر دوں گا اور اس سے تمہیں ایک بھیڑیے سے لڑنا ہوگا۔ اگر تم نے اسے ختم کر ڈالا تو اس کے خون سے میں تمہیں ایک تعویذ تیار کر کے دوں گا تم اسے گلے میں ڈال لینا پھر ہمیشہ کے لیے تمہاری جان کا

تمہارے دشمنوں وغیرہ سے چھوٹ جائے گی۔“

میں نے ابھی ہوئی نگاہوں سے لکشمی کی طرف دیکھا تو باداجی بولے۔ ”دیکھو! یہ تمہاری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ درندہ جو لٹ تمہیں چند پانچ کے اندر اندر مار ڈالے گی۔“ میرا خیال ہے کہ اس کے ہاتھوں مرنے سے بہتر ہے کہ تم اپنی زندگی بچانے کی کوشش کر دو۔ دیکھو۔“

”جو لٹ کی حقیقت کیا ہے؟“ میں نے باداجی سے سوال کیا۔

”وہ ایک آتما ہے۔ بھگتی ہوئی آتما۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”سرا..... جیسا باداجی کہہ رہے ہیں ویسا کر لیں یہ آپ کی زندگی کا مسئلہ ہے۔“ لکشمی نے کہا پھر اس نے باداجی کی طرف دیکھا۔ ”باداجی!..... کیا میں ان کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“

”نہیں..... وہاں تو کسی عام آدمی کو ہوتا بھی نہیں چاہیے درندہ بھیڑیا اُسے مار ڈالے گا۔“ باداجی نے جواب دیا۔

پھر انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ”بالک!..... تم یہ کام کر ڈالو ہمت کر لو۔“

”یہ لڑائی کہاں ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں پیچھے دیرانہ ہے وہیں ہو جائے گی۔“ انہوں نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے معاملے کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے باداجی! میں یہ کر لوں گا۔“

”ہوں۔“ انہوں نے ہنکارہ بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بس تو پھر ٹھیک ہے تم لوگ پرسوں رات گیارہ بجے سے پہلے آ جانا۔ تمہارے سسلے میں مجھے ایک گھنٹے تک عملیات کرنے ہوں گے اس کے بعد تم اس دیرانے کی طرف چلے جانا۔“

”جی بہتر ہے۔“ میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد میں اور لکشمی وہاں سے روانہ ہو گئے۔

”سرا..... پریشان نہ ہوں۔ آپ ہمت کریں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس بھیڑیے کو مار ڈالیں گے اور ویسے بھی آپ کے ہاتھ میں خنجر تو ہوگا جس پر کچھ نہ کچھ باداجی آپ کو پڑھ کر دیں گے۔ وہ کوئی عام خنجر نہیں ہوگا۔“

”لکشمی نے میری ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں ہمت سے اُس بھیڑیے کو ختم کر ڈالوں گا۔“ میں نے کہا۔



میں اور لکشمی پھر باواجی کے پاس پہنچ گئے۔ ہم ایک دن چھوڑ کر آئے تھے اور آج رات ہی ہمیں باواجی نے بلایا تھا۔ باواجی نے میری طرف دیکھ کر کہا: "تم اپنی پوری قوت اور ہمت کے ساتھ لڑنا" مجھے یقین ہے کہ تم اس بھیڑیے کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

"میں ضرور اسے ختم کر لوں گا۔" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"شاباش۔" وہ خوش ہو کر بولے۔ "بس اب میں اپنے عملیات کر لوں اس کے بعد تم اس سے لڑنے کے لیے چلے جانا۔"

"بہتر ہے۔" میں نے کہا۔

انہوں نے لکشمی کی طرف دیکھا۔ "لکشمی!۔۔۔ تم لوگ یہیں بیٹھو میں اپنے عملیات کر کے واپس آتا ہوں۔"

"بہتر ہے باواجی! لکشمی ادب سے بولا۔

باواجی اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ لکشمی میری ہمت بڑھانے کی باتیں کرنے لگا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد باواجی واپس آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک چمک دار خنجر تھا جو انہوں نے بیٹھنے کے بعد اپنے سامنے رکھ لیا اور مجھ سے بولے۔ "بالک!۔۔۔ اب تمہیں روانہ ہونے ہے۔ میں تمہیں کچھ باتیں بتا دوں۔ ایک تو یہ کہ تم یہاں سے تقریباً سو ڈیڑھ سو قدم آگے جاؤ گے تو تمہیں وہ بھیڑیائے ملے گا۔ تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنا ہوگا وہ کسی بھی طرف سے آ کر تم پر حملہ آور ہو جائے گا۔ صرف تمہارے عقب سے نہیں آئے گا اور اس کی ایک آنکھ انکا بے کی طرح سرخ ہوگی۔ اگر اس نے تمہیں مار دیا تو تمہاری کہانی وہیں ختم ہو جائے گی اور اگر تم نے اسے مار دیا تو پھر تمہارے لیے زندگی قائم رکھنے کے راستے کھل جائیں گے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ چاہے تمہیں کوئی بھی عقب سے آوازیں دے تم نے کسی صورت میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا ہے۔ ایک اور اہم بات ہے کہ تم نے کسی صورت

بھاگنا نہیں ہے یعنی واپس نہیں بھاگنا یہ ذہن میں رکھو کہ تمہیں ڈرانے کے لیے بہت سی کوششیں ہو سکتی ہیں۔"

"بہتر ہے باواجی!" میں نے کہا۔

"چلو اب ہم لوگ باہر چلتے ہیں۔" وہ بولے۔

ہم لوگ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئے۔ باواجی کے کہنے پر یوڑمی عورت جو کہ ان کی پتی تھیں لکشمی کو دو جلتی ہوئی لائٹیں دے دی تھیں۔

گھر کے عقب میں آ کر باواجی نے سامنے اندھیرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پرکاش!۔۔۔ تمہیں اس طرف جانا ہے۔"

"بہتر ہے باواجی۔" میں نے کہا۔

"تم ڈرو نہیں رہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میں نے جواب دیا۔

"کوئی بات پوچھنی ہے؟"

"جی نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے کہا اور خنجر میری طرف بڑھایا۔

"لو۔۔۔ اب تم جاؤ۔" انہوں نے لکشمی کی طرف دیکھا۔

"لکشمی!۔۔۔ ایک لائٹیں اسے دے دو۔"

لکشمی نے ایک لائٹیں مجھے دے دی۔

"بس اب جاؤ۔۔۔ بھگوان تمہاری رکھشا کرے گا۔"

باواجی نے مجھ سے کہا۔

"بہتر ہے۔" کہہ کر میں نے قدم بڑھا دیے۔

ابھی میں نے اٹھ کر دس قدم ہی بڑھائے تھے کہ مجھے اپنے عقب میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھا کہ باواجی اور لکشمی میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ مجھے باواجی کی بات یاد آ گئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ مجھے کسی صورت مڑ کر پیچھے نہیں دیکھنا اس لیے میں پیچھے دیکھے بغیر چلا رہا۔

"سنو پرکاش!۔۔۔ رُک جاؤ۔۔۔ عمل کچھ غلط ہو گیا ہے مزید آگے نہ جاؤ۔" باواجی کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ میں ٹھٹھک گیا۔ مجھے شک ہوا تھا کہ کہیں واقعی باواجی

تو نہیں آ گئے ہیں لیکن پھر میں چل پڑا اور مڑ کر نہیں دیکھا۔

"ارے پرکاش رُک جاؤ!" ایک بار پھر باواجی کی آواز آئی لیکن میں نے توجہ نہیں دی۔ پھر ان کی کئی آوازیں آئیں لیکن میں نہیں رکا اور نہ ہی میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور پھر مجھے سامنے ایک برشیر دکھائی دیا جو غراتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ میں محتاط ہو گیا مجھے شک ہوا تھا کہ کہیں وہ حقیقت میں شیر ہی نہ ہو لہذا اگر وہ مجھ پر حملہ کرے گا تو میں خنجر سے اپنا تحفظ کروں گا۔

شیر میرے انتہائی قریب آ گیا۔ اُس نے مجھ پر جست لگائی اور جیسے ہی وہ میرے قریب آیا۔ میں تیزی سے ایک جانب ہو گیا اور اُس پر خنجر سے وار بھی کیا لیکن اچانک وہ غائب ہو گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر چل پڑا۔

ذرا دور آ کر مجھے سامنے سے کچھ آوی دکھائی دیے۔

وہ میرے قریب آ کر رُک گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "تم کون ہو؟"

"تم کون ہو؟" میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

"ہم ڈاکو ہیں جو کچھ ہے نکال دو۔" وہ غرایا۔

میں نے اچانک اُسے چھوٹنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن اس کے جسم کا کوئی وجود نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بھی میرے راستے کی رکاوٹ ہیں۔ میں چل پڑا اور اس آوی کے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔ پھر مجھے خوفناک قہقہے سنائی دینے لگے۔

تمام تر سنگین حالت کے باوجود میں اپنے قدموں کا حساب رکھے ہوئے تھا اور اب تک میں نے ایک سو چالیس قدم اٹھائے تھے۔ یعنی اب صرف دس قدم ہی مجھے اٹھانے تھے۔ اچانک مجھے بائیں جانب سے بھیڑیے کی غراہٹ سنائی دی۔ میں نے فوراً اس طرف دیکھا۔ ایک درخت کے عقب سے ایک بھیڑیا مجھے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی ایک آنکھ انکارے کی طرح سرخ تھی۔ میرا دشمن میرے سامنے آچکا تھا۔ میں نے لائٹیں زمین پر رکھ دی۔

وہ ذرا دیر اپنی جگہ کھڑا غراتا رہا اور پھر درخت کی اوٹ سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا اور پھر اچانک اُس نے مجھ پر جست لگا دی۔

میں پوری طرح تیار تھا۔ اب میرا سارا خوف غائب ہو چکا تھا اور صرف یہی دھن سوار تھی کہ مجھے اُس بھیڑیے کو ختم کرنا ہے۔ میں یکدم ایک جانب ہو گیا اور بھیڑیا غراتا ہوا میرے سے پاس گزر گیا۔ وہ زمین پر اترا اور پھر فوراً پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ وہ بہت تیز تھا میں نے خود کو بچانے کی کوشش کی لیکن وہ میرے بازو سے رگڑ کھاتا چلا گیا۔

وہ زمین پر اترنے کے بعد غراتا ہوا ایک بار پھر پلٹا اور اُس نے مجھ پر جست لگائی۔ جیسے ہی میرے قریب آیا میں فوراً بیٹھ گیا۔ وہ میرے اوپر سے گزرنے لگا میں نے برقی رفتار سے اُس پر خنجر سے حملہ کیا اور خنجر نے اس کا پیٹ کاٹ ڈالا۔ وہ زمین پر گر اور پلٹ کر اتنی زیادہ تیزی سے مجھ پر حملہ آور ہوا کہ میں خود کو اس سے نہ بچا سکا اور وہ مجھے لیتا ہوا گر گیا۔ میں نے خوف کے عالم میں اُس سے خود کو چھڑانے کے بجائے اس پر خنجر سے پے در پے حملہ کیے۔ وہ بلبلانے لگا اور پھر میں نے اُسے اپنے اوپر سے ہٹا کر ایک طرف پھینک دیا۔ وہ وہیں پڑا رہا اور اُس کے منہ سے ہلکی ہلکی غراہٹیں سنائی دیے لگیں۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف سے مزید کسی حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا لیکن وہ وہیں کراہتا اور غراتا رہا۔ بالآخر اس کی آوازیں اور حرکتیں ختم ہو گئیں۔

میں محتاط انداز میں اُس کی طرف بڑھا۔ اُس کے قریب جا کر میں نے خنجر والا ہاتھ اس پر حملے کے لیے پوری طرح تیار کر لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُسے چھو اور تھوڑا ہلایا وہ سناکت و جامد تھا۔ میں نے اُسے ذرا زور سے ہلایا لیکن اُس نے نہ تو کوئی آواز نکالی اور نہ ہی کوئی حرکت کی۔ ثابت ہو گیا تھا کہ وہ ختم ہو گیا ہے میں اگلے قدموں اُس سے دور ہوتا چلا گیا۔ مجھے اب بھی یہ خدشہ تھا کہ وہ مجھ پر



حملہ کر دے گا۔

میں لائین تک پہنچ گیا۔ میں نے اُسے اٹھایا اور تیز تیز قدموں سے واپس چل پڑا۔ میں مڑ مڑ کر بھیڑیے کی طرف دیکھتا جا رہا تھا وہ اپنی جگہ پر ہی پڑا ہوا تھا۔ بلاآخر میں واپس لکشمی اور بادا جگ موہن تک پہنچ گیا۔ "بہت خوشی کی بات ہے سر کہ آپ صحیح سلامت واپس آ گئے۔"

"بچنے کے امکانات تو نہیں تھے لیکن بس بچ ہی گیا۔" میں نے کہا اور فخر بادا جی کی طرف بڑھایا۔ "یہ لیجیے۔ اس پر بھیڑیے کا خون لگا ہوا ہے۔"

انہوں نے فخر لینے کے بعد اُس کے جائزہ لیا اور بولے۔ "بس اب تمہاری زندگی محفوظ ہو جائے گی آؤ واپس چلتے ہیں۔"

ہم لوگ بادا جی کے گھر کی طرف چل پڑے۔

کچھ دیر بعد ہم ان کے کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے میری اور لکشمی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم دونوں بیٹھو میں ابھی واپس آتا ہوں۔" وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں اور لکشمی بیٹھ گئے۔

"سر!..... وہاں کیا ہوا؟" لکشمی نے پرتجسس لہجے میں مجھ سے کہا۔

میں نے اُسے اپنے ساتھ بیٹے واقعات بتا دیے۔ وہ بہت حیرت زدہ ہوا اور ساتھ ہی اُس نے میری ہمت کی بہت تعریف بھی کی۔

کچھ دیر بعد بادا جی کی چٹی ہمارے پاس آ گئیں اور لکشمی سے بولیں۔ "تم یہیں رہو گے۔" پھر انہوں نے میری طرف دیکھا۔ "تم میرے ساتھ آ جاؤ بادا جی بلا رہے ہیں۔"

میں ان کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا۔ بادا جی ایک جانب درہی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا تو انہوں نے ایک دعائے کے بنے ہوئے تعویذ کے خول میں ایک کالی

ڈوری ڈالنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ اس خول میں تعویذ ہوگا۔ ڈوری ڈالنے کے بعد انہوں نے اُسے میری طرف بڑھا دیا اور بولے۔ "یہ لو..... یہ تعویذ اپنے گلے میں ڈال لو اور اسے ہمیشہ اپنے گلے میں رکھنا تم محفوظ رہو گے۔ اگر تم نے یہ تعویذ اتار دیا تو پھر وہ کچھ ہو جائے گا جو جو لیت چاہتی تھی۔"

"کیا مطلب بادا جی؟" میں نے استغاب سے لہجے میں کہا۔ "تم پہلے یہ تعویذ پہنو۔" وہ بولے۔

"میں نے تعویذ گلے میں ڈال لیا۔ انہوں نے ذرا سوچا اور بولے۔ "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اُسے غور سے سنو!..... میں نے تم سے یہ غلط کہا تھا کہ جو لیت کوئی آتا ہے۔ دراصل اس وقت میں تمہیں حقائق سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر بتا دیتا تو تمہارے ذہن پر نہ جانے کیسے اثرات ہوتے۔ میں چاہتا تھا کہ تم بھیڑیے والا عمل کر آؤ تو تمہیں بتاؤں گا۔ اگر بھیڑیا تمہیں مار دیتا تو پھر کھانی دیں دفن ہو جاتی۔ تم واقعی دوسرے ستارے کے رہنے والے ہو۔"

"کیا؟" میں اُچھل پڑا۔ "یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے بادا جی؟"

انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور بولے۔ "ایسا ہی ہوا ہے۔ تم انسانی صورت میں پیدا ہوئے ہو اور اب تم خود کو انسان سمجھنے لگے ہو بلکہ آسان لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ تم اب انسان ہی ہو تم نے ایک عورت کے پیٹ سے جنم لیا ہے اور جسمانی طور پر اب تم انسان ہی ہو۔ یہی تمہارے ماضی کی بات تو تم اُسے بھول جاؤ۔ جو لیت کی یہ بات درست تھی کہ اس کے ستارے والے انسانوں سے سائنسی ترقی میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ ان کے پاس اڈن طشتریاں ہیں جن کے ذریعے وہ آنا جانا ہماری دنیا میں آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ انسان باوجود کوشش کے اب تک انہیں پکڑ نہیں سکے ہیں لیکن عملیات میں وہ ہم سے آگے نہیں ہیں۔ انہیں بھی عملیات آتے

ہیں اور انہی کی وجہ سے جو لیت دوسروں کے دماغوں پر اثر کر دیتی تھی لیکن بہر حال اُس کا مادی علم محدود ہے۔ میں نے تمہارے لیے جو تعویذ تیار کیا ہے اس کی وجہ سے اُس ستارے کا کوئی فرد تم تک نہیں پہنچ سکے گا بلکہ تم سے کوسوں دور رہے گا۔ بہر حال اب تم مطمئن ہو کر رہ سکتے ہو۔ تمہیں یہاں بلانے کا مقصد یہ ہے کہ لکشمی کو تمہارے بارے میں پتہ نہ چلے ورنہ وہ تم سے خوف زدہ رہنے لگے گا اور اس کے ذریعے بات اور تک بھی جاسکتی ہے اس لیے بس اب اس راز کو اپنے ہی سینے میں رہنے دینا۔"

"جی بہتر ہے۔" میں نے مردہ سی آواز میں کہا۔

"تم کچھ مایوس اور پریشان ہو؟" وہ بولے۔

"میرے لیے یہ بہت افسوس ناک خبر ہے کہ میں انسان نہیں ہوں۔" میں نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔

"تم انسان ہی ہو۔ تمہاری ماں انسان تھی۔ تم ایک عمل کڈ رہے اُس کی کوکھ میں پہنچے تھے اور پھر تم ایک انسان ہی کی طرح پیدا ہوئے۔" انہوں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"لیکن..... بہر حال یہ غلطی تو ہے کہ میں درحقیقت انسان نہیں ہوں۔"

"اوہو..... اپنے آپ کو یہ یاد کر لو کہ تم ایک انسان ہی ہو۔"

"لیکن ماضی میں تو نہیں تھا۔"

"ماضی میں تو کوئی بھی انسان نہیں تھا۔ ہر انسان ایک روح کی حیثیت رکھتا تھا اور پھر اس نے مرد عورت کے ملاپ کے نتیجے میں جسم حاصل کیا۔ اگر بات ماضی پر پریشان ہونے کی ہے تو پھر ہر انسان کو پریشان ہونا چاہیے کیوں کہ وہ ماضی میں اس دنیا میں آنے سے قبل ایک روح تھا لہذا جس طرح دوسرے انسان اس بات کو اہمیت نہیں دیتے، تم بھی نہ دو۔"

ان کی بات میں وزن تھا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے بادا جی جیسا آپ کہہ رہے ہیں میں دینا ہی سوچوں گا۔" اور مجھے یقین ہے کہ جلد ہی تمہاری غلطی ختم ہو جائے

گی۔ "وہ بولے۔" رسی جو لیت کی بات تو اب اُسے بھول جاؤ وہ یہاں سے جا چکی ہے۔ اُس نے ایک مصورہ کا روپ بھرا اور دنیا بھر میں اپنے افراد کو متوجہ کیا۔ جب تم لوگ اس دنیا میں آئے تھے تو اس سے قبل یہی منصوبہ طے ہوا تھا کہ جو لیت خود کو مصورہ کے طور پر مشہور کرائے گی اور تم سب لوگ اس سے رابطہ کر لو گے کچھ ساتھیوں کی یادداشت پر زیادہ اثر نہیں ہوا تھا اس لئے انہوں نے اس سے رابطہ کر لیا لیکن تم اور دو ایک اور لوگوں نے چنی اثرات کی وجہ سے اُس سے رابطہ نہیں کیا حالانکہ تم پر بہر حال اُس کا کچھ اثر ہو گیا تھا۔ تم اس کی تصاویر سے متاثر ہو گئے تھے اور پھر تم اس سے ملنے کے لیے بے چین ہوئے تھے۔"

"لیکن اس نے مصوری ہی کا طریقہ کیوں اپنا لیا۔ وہ براہ راست بھی تو سب سے بات کر سکتی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں..... یہ ہو تو سکتا تھا لیکن یہ بھی ان کے لیے آسان طریقہ ہی ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا ان کے لیے۔" انہوں نے جواب دیا۔ "بہر حال..... اب تم بے فکر ہو کر زندگی گزار سکتے ہو بشرطیکہ تم خود ایک بے فکر زندگی گزارنا چاہو۔ اگر تم اپنے ماضی کو ذہن سے کھرچ کر پھینک دو تو ایک اچھی زندگی گزار سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گا۔" میں نے کہا۔ "آؤ چلو وہاں چلتے ہیں۔"

ہم دونوں لکشمی کے پاس آئے۔ دو لکشمی!..... تمہارے دوست کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ اب تم لوگ بے فکر ہو کر جاسکتے ہو۔" بادا جی نے کہا تو لکشمی بہت خوش ہوا۔ کچھ دیر بعد میں اور لکشمی واپس روانہ ہو گئے۔ یہ غلطی اب بھی میرے دل میں تھی کہ میں ایک مکمل انسان نہیں ہوں لیکن بہر حال اب شاید مجھے اس غلطی کے ساتھ ہی زندگی گزارنی تھی۔

☆☆☆



مفلس بھوک اور بیماری انسان کی تمام حسوں کو مٹا دیتی ہے اور انسان بس مجبور محض بن کر رہ جاتا ہے ایک ایسا مٹی کا پتلا جس کو سامنے صرف ضرورتیں ہی ضرورتیں ہوتی ہیں اور وہ انہیں پورا کرنے کے لیے اپنے مقام سے گرتا چلا جاتا ہے۔

نیلر خاتون

ایک بے کس عورت کا احوال اس کے پاس فروخت کرنے کے لیے کچھ بھی نہ پچھتا

ڈرا دیر بعد آسید واپس آ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پلاسٹک کی ایک تھیلی تھی جس میں سالن نظر آ رہا تھا جبکہ اس کے دوسرے ہاتھ میں روٹیاں تھیں جو کہ ایک اخبار میں لپی ہوئی تھیں اس نے عابد کو بیٹھدیکھ کر کہا۔ ”کیا پھر کھانسی آئی تھی؟“

”ہاں۔“ عابد نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔  
”پانی پیا تھا؟“ وہ یوں بولی جیسے پانی ہی عابد علی کا علاج ہے۔

”ہاں پیا تھا۔ اسی سے رکی تھی۔“ عابد بولا۔  
”آج کے لیے تو بے فکری ہو گئی ہے۔ بیگم سلٹی کے گھر سے کھانا مل گیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”ابھی لے کر آ رہی ہوں۔“ پھر وہ باورچی خانہ میں آ گئی۔

کچھ دیر بعد وہ ٹرے لے کر عابد کے پاس پہنچ گئی اور ٹرے اس کے سامنے رکھ کر بولی۔ ”لو..... کھانا کھا لو.....“ پھر اس نے ننھے بابو کی طرف دیکھا۔ ”چل آ جا..... تو بھی کھالے۔“

ننھا بابو اٹھا اور تیزی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ننھے بابو کو چار پائی پر بیٹھا دیا اور خود بھی بیٹھ گئی۔ پھر وہ تینوں کھانا کھانے لگے۔

”کیا بات ہے آسید..... کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہے؟“ عابد نے پوچھا۔

عابد کی نگاہیں چھت پر مرکوز تھیں۔ اسے ابھی ڈرا ہی دیر پہلے بڑی زور سے کھانسی کا دورہ پڑا تھا جس کی وجہ سے وہ بے حال ہو چکا تھا۔ اب اسے کچھ سکون آیا تھا۔ وہ گزشتہ چھ ماہ سے بیمار تھا۔ اسے سانس کا عارضہ لاحق تھا۔ وہ گلی کے کٹڑ پر پکڑوں اور سوسوں کا ٹھیلانگا تا تھا۔ وہ عرصہ دراز سے اپنے سانس کے مرض کو جھیل رہا تھا اور سرکاری اسپتال سے اکثر دوا بھی لاتا رہتا تھا لیکن پھر اس پر بیماری کا شدید حملہ ہوا جس نے اسے چار پائی سے لگ جانے پر مجبور کر دیا اور اب تو وہ خاصا کمزور لاغر ہو چکا تھا۔

اس کی بیوی آسید گھروں میں برتن اور کپڑے دھو کر کسی نہ کسی طرح گھر کا خرچ چلا رہی تھی لیکن ایک ماہ پہلے ایک گھر میں کپڑے دھوتے وقت گرم پانی کا برتن الٹ پڑا تھا جس کی وجہ سے اس کا الٹا ہاتھ جل گیا تھا اور وہ کام کاج کے قابل نہیں رہی تھی۔ اب وہ مانگ تا بگ کر گزارہ کر رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ محلے سے کچھ کھانے کے لیے مانتے گئی تھی۔

عابد کو ہلکی سی کھانسی پھر آئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ قریب ہی اس کا آٹھ سالہ بیٹا کھیل رہا تھا جس کا نام تو واجد علی تھا لیکن اسے پیار سے ننھا بابو کہتے تھے۔ وہ باپ کی کھانسی سن کر منجھد ہو گیا تھا۔ اسے تو قہقہے تھے کہ اب میرا باپ پہلے کی طرح کھانسنے لگے گا۔



"کوئی بات نہیں ہے۔" آسہ نے اس سے نظریں جڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں۔۔۔ کوئی بات تو ہے۔۔۔ بتا کیا بات ہے؟"

عابد نے اصرار کیا۔

"کہا ناں کوئی بات نہیں ہے۔" آسہ بولی۔

"نہیں بتائے گی۔۔۔؟ لے میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

عابد نے نوالہ ٹرے میں رکھ دیا۔

آسہ ذرا متذبذب کا شکار رہ کر بولی۔ "اچھا کھالو۔۔۔"

میں بتاتی ہوں۔"

"تجھے میری قسم جھوٹ مت بولنا جو بات ہے وہی بتاتا۔" عابد نے کہا۔

وہ ایک بار پھر الجھ گئی کیونکہ اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ جھوٹ بول کر عابد کو مطمئن کر دے گی۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بولی۔ "تم کھانا کھاؤ۔۔۔ میں سچ ہی بتاؤں گی۔"

"بتا کیا بات ہے؟" عابد اسے جواب طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"اب میں سسلی کے گھر نہیں جاؤں گی۔" خود بولی۔

"کیوں؟" عابد نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

"ان کے شوہر کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا کہا انہوں نے۔" عابد فوراً بولا۔

"کہہ رہے تھے کہ میں مستقل طور پر ان کے ہاں کام کر لوں۔ تم جانتے ہو کہ ان کی تنگم بھی کہیں نوکری کرتی ہیں۔ سارا دن تو وہ گھر پر نہیں ہوتیں۔ مجھے لالچ دے رہے تھے کہ الگ سے بھی پیسے دے دیا کروں گا۔" اس نے بتایا۔

عابد نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ "بس اب تم ان کے گھر نہ جانا۔" اس نے نوالہ پورا کر دیا۔

"اب کیا ہوا؟" آسہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس بھوک نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"تمہیں میری قسم کھالو۔"

عابد مجبور ہو گیا۔ اس نے پھر نوالہ اٹھالیا۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ پھر نھا بابو آسہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "امی۔۔۔ اکل عید ہے۔۔۔ میں بھی کپڑے پہنوں گا ناں۔۔۔؟ سجاد کہہ رہا تھا کہ اس کے اس کے لیے نئے کپڑے لائے ہیں۔" سجاد اس کا ہمراہ تھا اور سامنے والے گھر میں رہتا تھا۔ سجاد کے والد فرما صاحب ایک اچھے ادارے میں کام کرتے تھے۔ ان کی معقول تنخواہ تھی۔

"ہاں ہاں۔۔۔ تمہیں نئے کپڑے پہناؤں گی۔" آسہ نے ننھے بابو کے سر پر ہاتھ بھرتے ہوئے پیار سے کہا۔

"ابو۔۔۔! میرے کپڑے کب لاؤ گے؟" ننھے بابو نے عابد کی طرف دیکھا۔

"لے آئیں گے جیٹا۔۔۔!" عابد نے اپنے سینے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کب۔۔۔؟" ننھے بابو کا سوال لب بھی برا قرار تھا۔

"لے آئیں گے ناں۔" آسہ نے ننھے بابو کا کندھا آہستہ سے ہلاتے ہوئے کہا۔ "کیوں ابو کو تنگ کر رہے ہو تمہارے ابو بیمار ہیں انہیں تنگ نہ کیا کرو۔"

"میں تنگ کب کر رہا ہوں میں تو کپڑوں کا پوچھ رہا ہوں کہ کب لائیں گے۔" نھا بابو مصومیت سے بولا۔

"لے آئیں گے رات میں جا کر۔" آسہ نے اسے بہلایا۔

"میں بھی جاؤں گا ابو کے ساتھ۔" وہ جلدی سے بولا۔ وہ خوش ہو گیا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے تم بھی جانا۔" آسہ بولی۔

نھا بابو مطمئن ہو گیا۔

"پتا نہیں مجھے کب تک یونہی بستر پر پڑا رہنا پڑے گا۔"

عابد نے آسہ سے کہا۔ "لگتا ہے کہ ان سرکاری دواؤں میں کچھ اثر نہیں ہے۔ آج چھ مہینے ہونے کو آ رہے ہیں۔ حالت بہتر ہونے کے بجائے خراب ہوتی جا رہی ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" آسہ نے اسے دلا سہ دیا۔

"تمہاری بیماری بھی تو بہت بڑھ گئی تھی۔ اب ختم ہونے کی وقت لے گی۔"

عابد نے سر جھکا لیا۔

"لو۔۔۔ یہ کھانا تو کھاؤ۔" آسہ نے نوالہ اس کے منہ کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔ بس اب دل نہیں کر رہا ہے۔" عابد نے نوالہ کے سامنے لاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں۔۔۔ کھاؤ یہ۔۔۔ تم نے کھایا ہی کتنا ہے۔"

مہ نے اس کی نہ سنی اور نوالہ اس کے منہ میں دے دیا۔ پھر عابد نے خود ہی کھانا شروع کر دیا۔

"امی۔۔۔! میں موٹر کار بھی لاؤں گا سجاد جیسی۔ وہ سب بھلتی ہے۔" ننھے بابو نے اپنی ایک اور خواہش کا اظہار کر دیا۔

"ہاں ہاں۔۔۔ وہ بھی لے آنا۔" آسہ نے اس کے سر پر ہاتھ بھرتے ہوئے کہا۔

"لال رنگ کی لاؤں گا امی!" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے لال رنگ کی ہی لے آنا۔" اس نے پھر ننھے بابو کے سر پر ہاتھ بھیرا۔

"میں سوچتا ہوں کہ میرے جسم میں تھوڑی بہت ہی ہاں آ جائے تو میں کام شروع کر دوں۔" عابد نے آسہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم بالکل فکر نہ کرو تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔" یہ کچھ وقت دن ہیں جو گزر جائیں گے پھر ساری عمر پڑی ہے کام کرنے کے لیے اور پھر اب کچھ ہی دنوں میں میرا ہاتھ ٹھیک ہو جائے گا میں پھر سے کام کرنے لگوں گی۔"

وہ بولی۔

"میں نہیں چاہتا ہوں کہ تم کام کرو۔" عابد ہڈیانی انداز میں بولا۔ آسہ نے اس کی حالت پر پریشان ہو کر اس کے کانوں پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔

"میں جانتی ہوں عابد کہ تم ایسا نہیں چاہتے ہو لیکن۔۔۔"

"میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی گھر گھر جا کر کپڑے

دھوئے برتن دھوئے اور پھر محاذ سے کے طور پر چند کے اسے دیئے جائیں یا پھر گھر میں بچا کھچا کھانا۔ میں۔۔۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا نہیں کر سکتا۔" بولتے بولتے اس کے لہجے کا جلال غائب ہو گیا تھا اور اب وہ رو نے لگا تھا۔

"تم۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔۔۔" آسہ نے اپنے جذبات کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن اس کے منہ کے سارے بند نوٹ گئے اور آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے بھی بہہ نکلا۔

عابد نے اپنے آنسو صاف کئے اور سنہلے ہوئے آسہ سے بولا۔ "اچھا مت رو۔۔۔ بس میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔۔۔ لے لے لے تک آ گیا ہوں ناں۔۔۔ کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس گھر میں خوشیاں لانا چاہتا ہوں لیکن۔۔۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

عابد کو سنہلے دیکھ کر آسہ نے بھی خود کو سنبھالا اور اپنی بوسیدہ چادر سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے عابد سے بولی۔ "تم فکر نہ کرو۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"ہاں۔۔۔" عابد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اچھا دیکھو۔۔۔! میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" آسہ نے ماحول میں پھیلی اداسی کو دور کرنے کے لئے عابد سے کہا۔

"چینی پتی ہے؟" عابد نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔! ابھی کچھ باقی ہے۔" آسہ نے جناب دیا۔

"کل کے لیے رہے دو۔" عابد نے کہا۔

"خالہ شہرا تن نے کہا تھا کہ وہ رات میں چینی اور پتی دے دیں گی۔"

"خود غریب عورت ہیں۔ تم انہیں زیادہ تنگ نہ کیا کرو۔ ان کے گھر کا گزارا نہ جانے کس طرح ہوتا ہے۔" عابد نے کہا۔

"میں نے تو انہیں منع کیا تھا لیکن وہ ہنستیں۔"



عابد خاموش رہا اور آسیدہ ٹرے لے کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ عابد سوچنے لگا کہ اب نہ جانے وہ ٹھیک ہو سکے گا یا نہیں۔ اس نے ڈاکٹروں سے پوچھا تھا کہ اگر مسئلہ فی بی کا ہو تو وہ سنی ٹوریم میں داخل ہو سکتا ہے لیکن ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ اسے فی بی کا مرض تو ہے لیکن اتنا خطرناک نہیں ہوا ہے کہ سنی ٹوریم میں داخل ہوا انہوں نے دواؤں کے ساتھ ساتھ اچھی خوراک پر زور دیا تھا لیکن عابد کے گھر میں تو معمولی کھانا بھی نہیں تھا اچھی چیزوں کی توقع کیسے کی جاسکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کا یہی حال رہا تو جلد یا بدیر موت کے منہ میں چلا جائے گا۔

”کیا سوچ رہے ہو۔“ آسیدہ نے اس کے پاس آ کر کہا تو وہ چونک گیا اور چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔  
”بس یہی سوچ رہا تھا کہ جلد از جلد ٹھیک ہو جاؤں تو پھر اپنے کام پر جاؤں اس مرتبہ میں سمسوں پکڑوں کے ساتھ طبی بھی لگانا چاہتا ہوں۔“  
”یہ تو اچھا ہے گا۔“ آسیدہ بولی۔ وہ ایسی باتوں میں اس کا حوصلہ بڑھاتی تھی۔ اس نے چار پائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔  
”بس چائے بن رہی ہے۔“

☆

رات ہو گئی۔ ننھا بابو اس آس میں تھا کہ اس کے ابو اسے نئے کپڑے اور لال موٹر کار ڈولانے لے جائیں گے۔  
”چلو ننھے بابو.....! اب لیٹ جاؤ۔“ آسیدہ نے اس سے کہا تو وہ بول اٹھا۔  
”ای.....! ابو مجھے کپڑے اور موٹر کار ڈولانے نہیں جائیں گے؟“  
”ہاں ہاں جائیں گے لیکن ابو اسکے جائیں گے۔ بازار میں بہت رش ہو گا ناں اس لیے۔“ آسیدہ نے کہا۔  
ننھے بابو کو تسلی ہو گئی۔ وہ لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ جب وہ صبح اٹھے گا تو اس کی چیزیں موجود ہوں گی۔  
اور پھر صبح ہو گئی۔ ننھا بابو جاگا۔ آسیدہ سے اس کا پہلا

سوال تھا۔ ”امی! میرے کپڑے اور موٹر کہاں ہے؟“  
”وہ.....“ آسیدہ سوچنے لگی کہ اب اس سے کیا کرے۔ ”اصل میں تمہارے ابورات میں چیزیں گئے تھے لیکن ان کی جیب سے پیسے گر گئے اس چیزیں نہیں لائے۔“  
ننھا بابو اداس ہو گیا۔ وہ بولا۔ ”تو امی پھر میں کون کپڑے پہنوں گا؟“  
”میں نے تمہارے کپڑے دھوئے تھے ناں! انہی امتری کردوں گی وہ پہن لینا وہ خیلے والے کپڑے انہی ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔  
”اور میری موٹر کار.....؟“ ننھا بابو بولا۔

”وہ بھی آ جائے گی.....! ابھی تم اپنے پرانے کھلونوں سے کھیل لینا۔“ آسیدہ نے کہا۔  
”پرانے کھلونے.....!“ ننھا بابو اداسی سے بولا۔  
ان کھلونوں سے کھیل کھیل کر تنگ آ چکا تھا اور کھلونے ہی کہتے ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی فٹ بال تھی جو بار بار اندر کو جنس جاتی تھی۔ ایک گڑیا تھی جس کا ایک بال عابد ہو چکا تھا۔ ایک رنگین پلاسٹک کا چشمہ تھا۔ جو اس گھس چکا تھا کہ اس میں سے کچھ نظر نہیں آتا تھا اور ایک پلاسٹک کی موٹر کار تھی اس کے اگلے دونوں پیسے عابد ہو چکے تھے۔ اس کا رنگ پیلا تھا۔  
آسیدہ ننھے بابو کی اداسی کو محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل کٹا جا رہا تھا بیٹے کی اداسی اور مایوسی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی لیکن وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو یہ سوچ رہی تھی کہ اب چائے کس طرح بنائے گا کیونکہ خالہ شہر اتن نے رات میں چائے کی پی اور چینی لا کر نہیں دی تھی۔  
”ای.....! سجاد آج اپنی موٹر کار چلائے گا۔“ ننھے حسرت سے کہا۔  
”ایسا کرنا کہ تم اپنی پرانی پیلی والی موٹر کار چلا لینا۔“ آسیدہ بولی۔

”اس کے دو پیسے نہیں ہیں۔“ ننھے بابو نے کہا۔  
”ہم اس کے پیسے لگا لیں گے۔“  
”کیسے امی؟“  
”اس کے پیسے گھر میں ہی عابد ہوئے ہیں ناں۔ ہم دھونڈ لیں گے۔“  
”لیکن امی.....! سجاد کی موٹر تو سیلوں سے چلتی ہے۔ اس کی بتیاں بھی چلتی ہیں۔“ ننھے بابو نے کہا۔  
”تو بیٹا.....! ہم تمہاری کار میں سیل بھی لگا دیں گے اور بتیاں بھی۔“  
”کیسے امی؟“ ننھا بابو جلدی سے بولا۔ وہ پرامید ہو گیا تھا۔  
”کوشش کریں گے تو تمہاری کار بھی ویسی ہی ہو جائے گی جیسی سجاد کی ہے۔“  
”ٹھیک ہے امی.....! آپ اسے ویسا ہی بتا دیتا۔“  
ننھے بابو نے اس کی بات پر یقین کر لیا۔  
”تم بے فکر رہو میں بنادوں گی۔“ وہ بولی۔  
اس وقت گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ آسیدہ نے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے خالہ شہر اتن کھڑی تھی۔ وہ آسیدہ کی طرف پلاسٹک کی ایک تھیلی بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”لو بیٹی.....! میں رات میں نہیں آ سکی لیکن اب یہ لے آئی ہوں پی اور چینی۔“  
”تمہارا بہت بہت شکریہ خالہ.....! آسیدہ نے اس سے تھیلی لینے کے بعد کہا۔  
”اچھا.....! دوپہر کے کھانے کی فکر نہ کرنا دوپہر میں کھانا بھی دے جاؤں گی۔“ خالہ شہر اتن نے کہا۔  
”خالہ.....! تم بہت خیال رکھتی ہو ہمارا.....! مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔“ وہ متکبرانہ انداز میں بولی۔  
”ارے نہیں بیٹی.....! شکریہ کی کیا بات ہے۔ تو بیٹی ہے میری۔“ انہوں نے آسیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اچھا! چلو میں چلتی ہوں۔ ایک بجے تک کھانا بھی لے آؤں گی۔“

آسیدہ اندر آ گئی۔ باورچی خانہ کی طرف جاتے ہوئے اس نے ننھے بابو کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے کھلونوں کا تھیلیا اٹھا رہا تھا۔  
چائے بنانے کے بعد آسیدہ نے عابد کو جگادیا اور وہ لوگ رات کی باسی روٹی اور چائے سے ناشتہ کرتے گئے۔  
عابد بار بار ننھے بابو کو دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ کپڑوں اور کھلونوں کے حوالے سے آسیدہ نے اسے کیا کہہ کر بہلایا ہے۔ بہر حال ننھے بابو کی خاسوشی اور اطمینان بتا رہا تھا کہ آسیدہ نے اسے کچھ نہ کچھ کہا ہے۔  
”شہر اتن خالہ کہہ کر گئی ہیں کہ آج کھانا دے جائیں گی۔“ آسیدہ نے عابد سے کہا۔  
”وہ بے چاری بھی ہمارے لیے بہت کچھ کرتی رہتی ہیں۔“ عابد بولا۔  
”ہاں.....! میں نے بھی ان سے یہ بات کہی تھی اور ان کا شکریہ ادا کیا تھا لیکن انہوں نے کہا کہ شکریے کی کیا بات ہے۔ میں تو ان کی بیٹی ہوں۔“ آسیدہ نے کہا۔  
”بہت ساتھ دیتی ہیں وہ.....! میں بھی ان کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔“ وہ بولا۔  
”ابو.....! آپ کے پیسے گر گئے تھے؟“ اچانک ننھے بابو نے سراٹھا کر عابد سے کہا تو اسے سمجھ نہیں آیا کہ کیا معاملہ ہے اور وہ بولا۔  
”پیسے.....! ہاں.....! وہ.....“  
”میں نے ننھے بابو کو بتا دیا تھا کہ رات میں تم اس کے کپڑے اور کھلونے لینے گئے تھے اور تمہاری جیب سے پیسے گر گئے تھے۔“ آسیدہ جلدی سے بولی۔  
”ارے ہاں۔“ عابد ننھے بابو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”بیٹا.....! میں رات میں تمہارے کپڑے اور کھلونے لینے گیا تھا۔ چنانچہ میری جیب سے کس طرح پیسے گر گئے اس لئے میں کچھ خرید ہی نہیں سکا۔“  
”ابو.....! امی میری پرانی موٹر کار کو بدل دیں گی۔ وہ اس میں پیسے بھی لگا دیں گی اور اس میں سیل بھی لگا دیں گی“



وہ سجاد کی کار جیسی ہو جائے گی۔“ ننھے بابو نے عابد کو بتایا۔  
”ہاں ہاں بھئی.....!“ عابد بولا۔ ”تمہاری اسی تو یہ کام  
آرام سے کر دیں گی۔“

”اچھا..... اب تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لینا میں کپڑے  
استری کر دوں گی وہ پہن لینا شاید کوئی گھر آ جائے۔“  
آسیہ نے عابد سے کہا۔

”یہاں کون آئے گا۔“ عابد تنگی سے مسکرایا۔ ”ایسے  
حالات کے مارے گھرانوں میں کون آتا ہے؟“

”تمہارے بھائی ہی آ سکتے ہیں۔“ آسیہ بولی۔ عابد کا  
ایک بڑا بھائی تھا۔ اس کا نام ساجد تھا۔ وہ اپنی مشائی کی  
دکان چلاتا تھا۔ اس کے حالات بہت اچھے تھے لیکن وہ  
ان لوگوں سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ چھوٹے دل کا  
آدی تھا اور ڈرتا تھا کہ اگر ان لوگوں سے ملے گا تو ان کی  
مالی مدد کرنی پڑ جائے گی۔ عابد اور آسیہ کے سارے ہی  
رشتہ دار ان کے خراب حالات کی وجہ سے ان سے دور  
رہتے تھے۔

آسیہ کی بات پر عابد نے کہا۔ ”ارے وہ کہاں آئیں  
گے۔ وہ بڑے آدی ہیں۔“

”پھر بھی تم کپڑے بدل لینا شاید کوئی آ جائے عید کا  
دن ہے ناں۔“ آسیہ بولی۔

ناشتے کے بعد اس نے عابد کو دوا کھلائی اور پھر کپڑوں پر  
امتری کرنے لگی۔ پھر اس نے عابد اور ننھے بابو کو کپڑے  
پہنائے اور خود بھی ایک پرانا جوتا نکال کر پہن لیا۔

”ننھا بابو اپنی کار لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے عابد سے کہا  
۔“ ای آؤ اب اسے ٹھیک کر دو۔“

آسیہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ننھے بابو نے کار اس کے  
سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”انی یہ لو..... اب ٹھیک کر داسے۔“

آسیہ کا امتحان شروع ہو چکا تھا۔ اس نے کار کو الٹا پلٹا  
شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ذہ سوچ رہی تھی کہ اب ننھے بابو کو  
کس طرح بہلائے۔ پھر اس نے کہا۔ ”ننھے بابو.....!  
پہلے تو ہمیں اس کے پیچے تلاش کرنے ہیں ناں۔ چلو آؤ

پہلے وہ ڈھونڈتے ہیں۔“ پھر وہ پیچے ڈھونڈنے کی  
اداکاری کرنے لگی اور ننھا بابو سچ پیچے تلاش کرنے لگا۔  
کافی دیر کی تلاش کے بعد آسیہ نے ننھے بابو سے کہا۔  
”اب ہم لوگ تھک گئے ہیں۔ کچھ آرام کر لیتے ہیں اس  
کے بعد پھر ڈھونڈیں گے۔“

ننھا بابو نہیں تھکا تھا۔ اس کے اندر تو جوش تھا۔ وہ اپنی کار  
سجاد کی کار جیسی بنانا چاہتا تھا۔ اس نے آسیہ سے کہا۔  
”ای اتم آرام کر لو میں نہیں تھکا ہوں۔ میں تو تلاش کر رہا  
ہوں پیسے۔“

”ٹھیک ہے تم تلاش کرو۔“ آسیہ نے کہا۔

کچھ دیر بعد سجاد آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں اس کی موٹر کار  
تھی۔ وہ ننھے بابو کے پاس آ گیا۔

”اسے چلاؤ نا سجاد۔“ ننھے بابو نے کہا۔

”ہاں ابھی چلاتا ہوں۔“ سجاد نے کار فرش پر رکھ دی۔

پھر اس کار میوٹ استعمال کرنے لگا۔ کار آگے پیچھے چلنے  
لگی۔ پھر اس نے ننھے بابو سے کہا۔

”تمہارے ابو کوئی کھلونا لائے ہیں؟“

”میرے ابو ایسی کار لینے گئے تھے لیکن ان کی جیب  
سے پیسے گر گئے اس لیے وہ کار لا نہیں سکے۔“ ننھا بابو اس  
سے بولا۔ ”لیکن میری ای اب میری پرانی کار کو ایسا ہی  
بنادیں گی۔“

”ایسا بنادیں گی؟“ سجاد نے حیرت سے کہا۔ وہ ننھے  
بابو کی کار دیکھ چکا تھا۔

”ہاں۔“ ننھے بابو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”بالکل ایسی ہی ہو جائے گی اور سیل سے بھی چلے گی۔“

”ٹھیک ہے پھر ہم دونوں ریس لگائیں گے۔“ سجاد  
نے کہا۔

”ہاں..... بڑا حرا آئے گا۔“ ننھا بابو خوش ہوتے  
ہوئے بولا۔

سجاد کچھ دیر کھیلنے کے بعد چلا گیا اور ننھا بابو ایک بار پھر  
کار کے پیوں کی تلاش میں لگ گیا۔

ایک بجے کے قریب شہر اتن خالہ آ گئی۔ وہ کھانا لے کر  
آئی تھی۔

”ارے خالہ.....! تم تو ہمارا بڑا خیال رکھتی ہو۔ میں  
آج آسیہ سے یہاں کہہ رہا تھا کہ میں خود تمہارا شکریہ ادا کرنا  
چاہتا ہوں۔“ عابد نے اس سے کہا۔

”ارے بیٹا.....! میں بھلا کیا خیال رکھتی ہوں تم لوگوں  
کا۔“ شہر اتن خالہ بولی۔ ”میرا تو دل کرتا ہے کہ تم لوگوں کو  
بہت کچھ دوں بہت ڈیڑھ ساری رقم دوں میں تمہارے  
ایسے حالات دیکھنا چاہتی ہوں لیکن بیٹا.....! تم جانتے ہو  
کہ تمہاری اس خالہ کے کیا حالات ہیں۔ تمہارے خالو کی  
جو تھوڑی بہت آمدنی ہے اس میں سارا خرچ چلانے کی  
کوشش کرتی ہوں۔“

”فکر نہ کرو خالہ.....!“ آسیہ بولی۔ ”خالو کی آمدنی بھی  
بہت اچھی ہو جائے گی۔“

”بس دعا کرو بیٹی! وہ بولی۔

”میں تو بہت دعا کرتی ہوں خالہ۔“ آسیہ نے کہا۔

شہر اتن خالہ کے جانے کے بعد وہ لوگ کھانا کھانے  
لگے۔ عابد نے آسیہ سے کہا۔ ”ہمارے برے وقت میں  
ہمارے سارے اپنے ساتھ چھوڑ گئے ہیں لیکن شہر اتن  
خالہ.....! اس سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے بس وہ ہماری  
مٹلے دار ہی ہے لیکن اس نے اپنوں سے بڑھ کر ہمارا ساتھ  
دیا ہے۔“

”ہاں بالکل۔“ آسیہ نے اس کی تائید کی۔

”انی.....! ای.....! یہ کار کے پیسے مل گئے ہیں۔“  
ننھے بابو نے کہا۔ وہ بھاگا ہوا آسیہ کے پاس آ رہا تھا۔ اس  
نے اسٹور سے پیسے تلاش کر لئے تھے۔ پھر وہ آسیہ کے  
پاس پہنچ کر پیسے اسے دکھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ  
دیکھیں..... میں نے ڈھونڈ لیے ہیں پیسے۔“

آسیہ نے وہ پیسے اس سے لے لیے۔ ان میں سے ایک  
پہیہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ننھے بابو نے اس کی طرف اشارہ کرتے  
ہوئے کہا۔ ”انی.....! یہ پہیہ تو ٹوٹا ہوا ہے۔ اسے کیسے

جوڑیں گی؟“  
”تم فکر نہ کرو میں جوڑ لوں گی اسے..... تم اسے لے کر  
جا کر گاڑی کے پاس رکھو میں تمہارے ابو کو دوا دے کر  
آ رہی ہوں۔“ آسیہ نے کہا۔  
ننھا بابو چلا گیا۔

آسیہ نے عابد کو دوا پلائی اور ننھے بابو کے پاس پہنچ گئی۔  
اس نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی ٹوٹے  
ہوئے پیسے کو جوڑ دیتی ہوں۔“ اس نے پیسے اٹھائے اور ان  
کا بغور جائزہ لیتے ہوئے سوچنے لگی کہ اسے جلا کر جوڑنے  
کی کوشش کرے یا اسے دھاگے سے باندھے۔ پھر اس  
نے سوچا کہ اگر اس نے کسی بھی طرح پہیہ جوڑ لیا اور ان  
پہیوں کو کار میں لگا بھی دیا تو وہ اپنی کئی ہوئی بات کیسے  
پوری کرے گی کہ وہ کار سجاد کی کار جیسی ہو جائے گی۔

اس نے گاڑی بھی اٹھا کر اس کا جائزہ لینا شروع  
کر دیا۔ اس طرح وہ سوچنے کے لئے زیادہ وقت لینا  
چاہتی تھی۔ اس وقت عابد زور سے کھانسنے لگا۔

”یہ یہیں رکھو میں تمہارے ابو کو دیکھ کر آتی ہوں۔“ آسیہ  
نے کار اور پیسے فرش پر رکھتے ہوئے ننھے بابو سے کہا اور اٹھ  
کھڑی ہوئی۔ پھر جلد ہی وہ عابد کے پاس پہنچ گئی۔ عابد کو  
کھانسی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ اسے سنبھالنے لگی۔ ذرا دیر بعد  
عابد کی حالت بہتر ہو گئی۔ آسیہ نے اسے لٹا دیا۔

”آسیہ.....! مجھے لگتا ہے کہ میں کبھی صحت مند نہیں  
ہوں گا۔“ عابد نے نحیف آواز میں کہا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو تم..... دوائیں چل رہی ہیں تم  
جلدی ہی ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ آسیہ نے اسے تسلی دی۔

”لیکن کب؟“ عابد بے زاری سے بولا۔ ”اتنا عرصہ تو  
ہو گیا ہے مجھے بستر سے لگے ہوئے..... اور پھر..... صرف

ان دواؤں سے ہی تو کچھ نہیں ہوگا۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا  
کہ میں اچھی خوراک بھی استعمال کروں اور تم اچھی طرح  
جانتی ہو کہ ہمیں کتنی اچھی خوراک مل رہی ہے۔ میں تو خیر  
بہار آ دی ہوں تم اپنی مشکل دیکھو۔ نا مناسب خوراک کی



وجہ سے تمہارا کیا حشر ہو گیا ہے۔“

”تمہاری بات درست ہے..... لیکن.....“

”ہاں میں جانتا ہوں۔“ عابد نے اس کی بات کاٹ دی۔  
”ہمارے حالات ہی ایسے ہیں کہ ہم اچھی خوراک حاصل نہیں کر سکتے اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ میں کبھی ٹھیک نہیں ہوں گا۔ کاش!..... کاش مجھے جلد موت آ جائے تاکہ تم بیوہ ہو جاؤ۔ بیوہ ہو کر شاید لوگ تمہاری زیادہ مدد کرنے لگیں۔“ وہ جذباتی ہو چکا تھا۔

”یہ..... یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم؟“ آسیہ نے تڑپ کر کہا۔ ”میری زندگی بھی تمہیں مل جائے۔“ وہ رونے لگی۔  
عابد نے خود کو سنبھالا اور آسیہ کو سینے سے لگا لیا۔ وہ اُس کی کمر باندھی دیتے ہوئے بولا۔ ”مجھے معاف کر دو۔ میں جذبات میں کچھ زیادہ ہی بول جاتا ہوں۔ اچھا میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی باتیں نہیں کروں گا۔“

”تمہارا قصور نہیں ہے۔“ آسیہ سکتے ہوئے بولی۔  
حالات اور بیماری نے تمہیں چڑا کر دیا ہے لیکن غلط باتیں منہ سے نہ نکالا کرو۔“

”میں نے کہا ناں اب نہیں کروں گا ایسی باتیں وہ بولا۔ ”چلو..... اب معاف کر دو۔“

آسیہ نے سر اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اب وہ خاصی مطمئن ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ عابد اکثر اس طرح جذباتی ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا ہمیشہ حوصلہ بڑھاتی تھی۔  
آج عابد نے مرنے کی بات کر کے اُسے بہت زیادہ دکھی کروا دیا تھا۔

ننھا بابو اداس لوگوں کے پاس آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں اپنی کار اور اس کے پیچھے۔ اُس نے وہ چیزیں ان کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ”ای!..... یہ ٹھیک کروں ناں۔“

”ہاں بیٹا..... ابھی کرتی ہوں۔“ آسیہ بولی۔ پھر وہ اٹھ کر ننھے بابو کے ساتھ چل پڑی۔ وہ لوگ پھر وہیں آ کر بیٹھ گئے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ آسیہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ ننھیا بابو سے کیا بہانہ کرے۔ پھر اُس نے پیسے کو جوڑنے

کی کوشش شروع کر دی اور ذرا دیر بعد ننھے بابو سے بولا۔  
”یہ مجھ سے ٹھیک نہیں ہوگی۔“

”تو پھر ای؟“ ننھے بابو نے مایوس اور پریشان ہوئے اس سے کہا۔

”یہ باباجی ٹھیک کر دیجئے۔“ وہ بولی۔  
”باباجی؟..... یہ کون ہیں امی۔“ ننھے بابو نے اس

پوچھا۔  
”یہ ساری خراب چیزیں صحیح کر دیتے ہیں اور آ رات کے وقت آتے ہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”اوہ..... تو پھر مجھے آدمی رات تک جاگنا پڑے گا۔“ وہ بولی۔

”نہیں..... تم نہیں جاگو گئے میں جاگوں گی اور آج وہ آئیں گے تو میں ٹھیک کرالوں گی اسے۔“ اُس نے ننھے بابو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔  
”ٹھیک ہے امی..... میں کل کھیل لوں گا اس سے ننھا بابو کچھ مطمئن ہو کر بولا۔

☆

”ای!..... میری کار ٹھیک ہوگئی؟“ من جب ننھا جاگا تو آسیہ سے اس کا سب سے پہلا سوال یہ تھا۔

”کل باباجی آئے تھے لیکن ان کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لیے انہوں نے کوئی کام نہیں کیا وہ کہہ کر گئے ہیں آج رات جب وہ آئیں گے تو تمہاری کار ضرور ٹھیک دیں گے۔“ آسیہ نے جواب دیا۔ یہ جواب اس نے ہی سوچ رکھا تھا۔

ننھا بابو اداس ہو گیا۔ آسیہ نے اس کی اداسی کو محسوس کیا اور بولی۔ ”بیٹا!..... تم مایوس نہ ہو وہ آج ضرور تمہاری کار ٹھیک کر دیں گے۔“

ننھا بابو کچھ نہ بولا لیکن آسیہ جانتی تھی کہ اُس کے دل کا گزر رہی ہے۔

دن میں ایک بار پھر سجاد اپنی کار اور دیگر کھلونے لے آ گیا۔ ننھے بابو نے دیگر کھلونوں کو بھی پسند کیا لیکن اُس

کو سجاد کا مرکز اب بھی کا رہی تھی۔

”کیا تمہاری کار ٹھیک ہوگئی ننھے بابو؟“ سجاد نے پوچھا۔  
”نہیں۔“ ننھے بابو نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیوں؟“ سجاد نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”رات میں باباجی کی طبیعت خراب تھی۔“

”باباجی..... یہ کون ہیں؟“

”وہ رات میں آتے ہیں اور خراب چیزیں ٹھیک کر دیتے ہیں۔ کل رات ان کی طبیعت خراب تھی اس لیے ان کوئی کام نہیں کیا۔“

”کیا تم نے ان کو دیکھا ہے؟“ سجاد نے دلچسپی سے پوچھا۔  
”نہیں وہ آدمی رات میں آتے ہیں ناں..... اس رات میں سو رہا ہوتا ہوں۔“ ننھا بولا۔

”ہوں.....“ سجاد سوچنے لگا۔  
☆

رات میں سونے سے پہلے ننھے بابو نے آسیہ سے کہا۔  
”ای!..... آج رات باباجی میری کار ٹھیک کر دیں گے ناں؟“

”ہاں بیٹا..... ضرور کر دیں گے۔“ اُس نے ننھے بابو کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا اور سوچنے لگی۔

”مگر وہ صبح اُس سے کیا بہانہ کرے گی۔“

ذرا دیر بعد ننھا بابو سو گیا۔ آسیہ اُسے غور سے دیکھنے لگی۔ اُسے ننھے بابو کو دیکھ کر رونا آ رہا تھا۔ اس کا بچہ محرومیوں میں زندگی گزار رہا تھا۔ ایک معمولی سا کھلونا اس کی زندگی کا محور بنا ہوا تھا اور ننھا بابو اُسے حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔

اُسی وقت عابد کو کھانسی آنا شروع ہوگئی۔ آسیہ نے ننھے بابو کو لحاف اوڑھ لیا اور اپنی چارپائی سے اتر کر عابد کے پاس پہنچ گئی۔ اس وقت تک عابد کی کھانسی دورے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ آسیہ اُسے سنبھالنے لگی اور پھر ذرا دیر بعد ماہد کی حالت کچھ بہتر ہوگئی۔ کھانسنے کے دوران وہ اٹھ کر

دیکھ گیا تھا۔ اب آسیہ نے اُسے لٹا دیا۔

”جاؤ تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ ابھی میں ٹھیک ہوں۔“

اس نے آسیہ سے کہا۔ ”ننھا بابو سو گیا کیا؟“

”ہاں..... سو گیا ہے۔“ آسیہ نے جواب دیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ ”مجھے شہر اتن خالہ کے گھر جانا ہے ذرا دیر کے لیے۔“

”کیوں خیریت تو ہے؟“ عابد نے پوچھا۔  
”میں اُن سے کچھ پیسے لینا چاہتی ہوں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”لیکن کیوں؟“ عابد بولا۔

”میں ننھے بابو کی موٹر کار لانا چاہتی ہوں۔ وہ کئی دن سے اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اب مجھ سے اُس کی تڑپ دیکھی نہیں جاتی۔“ آسیہ نے آہستہ لہجے میں کہا۔

”لیکن..... شہر اتن خالہ کو تنگ کرنا مناسب نہیں ہے۔“ عابد بولا۔

”کچھ بھی ہو..... تم ایک ماں کے جذبات کو نہیں سمجھ سکتے۔ آج مجھ سے ننھے بابو کی مایوسی نہیں دیکھی گئی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں شہر اتن خالہ کو صاف صاف بتا دوں گی کہ کیا مسئلہ ہے۔ اُن سے کچھ پیسے ادھار لوں گی اور کونے والے کھلونے کی دکان سے موٹر کار لا کر ننھے بابو کے لیے رکھ دوں گی تاکہ جب وہ صبح اٹھے تو اس کا کھلونا اسے مل جائے۔“ آسیہ نے کہا۔

ننھے بابو کے بارے میں ذرا غور کرنے کے بعد عابد نے آسیہ سے کہا۔ ”دیکھو..... تم شہر اتن خالہ پر زیادہ زور مت ڈالنا اگر ان کے پاس پیسے نہ ہوں تو یہ نہ کہنا کہ وہ کسی اور سے لے کر دے دیں۔ بس چپ چاپ گھر چلی آنا۔“

”ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گی۔“ آسیہ بولی۔

ذرا دیر بعد وہ شہر اتن خالہ کے گھر پہنچ گئی۔ ان کے شوہر گھر پر نہیں تھے۔ وہ گھر میں اکیلی ہی تھیں۔ آسیہ نے اُن سے کہا۔ ”شہر اتن خالہ..... میں تم سے کچھ اہم بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”ہاں..... ہاں بولو بیٹی؟“ شہر اتن خالہ نے کہا۔



# غریب کا سر شہیہ



شاعر علی شاعر

گاڑی چلانے سے مطلب ہے۔ غفلت میں گزر جانے سے مطلب ہے۔ تیری گاڑی کے پیچھے اگر کسی کی جان جائے یا گاڑی کی کھر سے کوئی محتاج ہو تجھے کچھ پروا نہیں ہے۔ یہ باتیں ان کے لیے قابل جواز ہوتی ہیں۔ جو قابل سماعت ہوں۔ تو کہہ سکتا ہے کہ میں نے تو ہارن بجایا تھا مگر تم راستے سے نہیں ہٹے اس لیے کاری زد میں آ گئے۔ ریحان خان میں تو سماعت سے محروم بچہ تھا تو نے مجھے بھی اپنے غرور کا شکار کیا۔

وہ تیز دھار خنجر لیے آگے بڑھتا رہا اور کہتا رہا۔ ریحان خان اب تم بے بس ہو۔ کچھ نہیں کر سکتے۔ حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ خون کا بدلہ خون ہے۔ لہذا میں اپنے قتل کا بدلہ تم

اسے ہر رات ایک ہی خواب نظر آ رہا تھا۔ وہ خوف کے مارے سکون کی نیند سو بھی نہیں پا رہا تھا۔ زندگی میں اس قدر تو بے چین کبھی نہ ہوا تھا۔ اس خواب نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ وہ سوتے سوتے اچانک چونک پڑتا تھا۔ آج بھی وہ بے شکل سو پایا تھا کہ وہی خواب نظر آنا شروع ہو گیا۔

”بارہ سالہ بچہ اس کی طرف خنجر لیے بڑھ رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا ریحان خان تجھے کیا ملا۔ ایک بے زبان اور معصوم بچے کو کچل کر۔ میں تو گونا گونا بچہ تھا۔ تیری گاڑی کا ہارن کیونکر سن سکتا تھا لیکن تیرے غرور نے تجھے اس طرف سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ تو تو بس ہارن بجاتا تھا۔ کوئی سن نہ سنے کوئی آگے سے ہٹ نہ ہٹے بس مجھے تو تیز رفتار

کے لیے کہا ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ اگر وہ میرے کچھ مدد کر سکتی ہیں تو کر دیں۔ ان کے پاس تین ہزار روپے پڑے تھے۔ انہوں نے اس میں سے مجھے ایک ہزار روپے دے دیے۔“

عابد انیک گہرا سانس لے کر بولا۔ ”جو حالات چل رہے ہیں ان میں تو یہ لوٹنا مشکل ہو جائیں گے۔ تمہیں اتنی بڑی رقم نہیں لینا چاہیے تھی۔“

”انہوں نے خوشی سے دیے ہیں بلکہ وہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ وہ اور بھی ہماری مدد کریں گی۔“

”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ غریب عورت ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ تم یہ رقم انہیں واپس کر دو۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ یہ بڑی بات ہوگی۔ وہ پتہ نہیں کیا سوچیں گی اور پھر۔“ اس نے اپنی چادر کے اندر سے ایک ڈبہ نکال کر عابد کے سامنے رکھ دیا۔ ”میں یہ نفعے بابو کی موٹی کار بھی لے آئی ہوں اور تمہارے کھانے کے لیے کچھ چیزیں بھی لائی ہوں۔“

”ادھو۔“ عابد تاسف سے بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم نے کافی پیسے خرچ کر لیے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ بہر حال تم فکر نہ کرو۔ میرا ہاتھ بھی بس اب ٹھیک ہی ہونے والا ہے۔ میں جلد ہی کام کاج کرنے جاؤں گی اور خالہ کے پیسے لوٹا دوں گی۔“ اس نے تسلی دی۔

عابد نے بے بسی اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔

صبح جب ننھا بابو جاگا تو اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے وہ آسیر نے نئی موٹر کار اس کو دے دی۔ ننھا بابو اسے پاکر سیدھا حد خوش تھا اور اسے دیکھ کر آسیر کی بھی خوشی کی حد نہیں تھی لیکن اس خوشی کی اس نے بڑی بھاری قیمت ادا کی تھی۔ اب اسے پیچھے سسلی کے شوہر کے اشاروں پر ناچنا تھا اور ان سے جو رقم ملتی تھی اور ملتی تھی اس کے بارے میں عابد کو بھی بتانا تھا کہ وہ شہر اتن خالہ نے دی ہے۔ شہر اتن خالہ بھی بوقت ضرورت اس بات کی تصدیق کے لیے تیار تھیں۔

☆☆☆

”آج میرا بچہ مایوس ہو گیا ہے۔ اسے ایک کھلونے کی ضرورت ہے۔ اس عید پر اس کے لیے صرف ایک ہی خوشی تھی وہ کھلونا جو اسے اب تک نہیں مل سکا۔ کل عید کا آخری دن ہے میں نہیں چاہتی کہ اس کی یہ عید اس چھوٹی سی خوشی کے بغیر گزر جائے اس لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے لیکن پیسوں کی مدد نہیں ہوگی۔“ آسیر نے کہا۔

”تو پھر کاہے کی مدد چاہیے بیٹا؟“ شہر اتن خالہ نے اُلجھن کے ساتھ کہا۔

آسیر نے ذرا سوچا ایک گہرا سانس لیا اور بولی۔ ”میں جو کچھ کرنے جا رہی ہوں اس میں تم میری مدد کرو گی۔ میرا شوہر آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے اسے اچھی خوراک کی ضرورت ہے جو اسے نہیں مل رہی ہے اور اگر اسے کچھ عرصہ اور اچھی خوراک نہ ملی تو وہ شاید۔۔۔۔۔ وہ مر جائے گا۔ میرا بچہ مردیوں کا شکار ہے۔ میرے پاس لوگوں کی حوصلہ افزا باتوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک تم ہی ہو جو عملی طور پر میری مدد کرتی ہو۔ میں اس لیے تمہارے پاس آئی ہوں تاکہ تم سے اپنے دل کی بات کہہ سکوں اور تم سے مدد لے سکوں۔“ اور پھر اس نے شہر اتن خالہ کو اپنے دل کی بات بتا دی۔ پہلے تو خالہ حیران ہوئیں لیکن پھر آسیر کے اصرار پر انہوں نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆

آسیر واپس گھر آ گئی۔ عابد جاگ رہا تھا۔ آسیر نے باورچی خانے میں سامان رکھا اور اس کے پاس گئی۔ عابد کی سوالیہ نگاہیں اس پر تھیں۔ وہ بولی۔ ”میں نے شہر اتن خالہ سے ایک ہزار روپے ادھار لے لیے ہیں۔“

”ادھ۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ تم نے انہیں تنگ کیا ہوگا؟“ عابد بولا۔

”نہیں۔“ آسیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے نفعے میاں والی بات بتائی تھی اور۔۔۔۔۔ یہ بھی بتایا تھا کہ ڈاکٹروں نے تمہیں اچھی خوراک کھانے



سے اس حالت میں با آسانی لے سکتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے تیز دھار خنجر والا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور ٹھیک دل کی جگہ پر سینے میں اتار دیا۔

ایک دل دوڑ چھی مار کر ریحان خان اٹھ بیٹھا۔ وہ لا جواب تھا کیا کر سکتا تھا۔ اس غلطی کا خیاں وہ بھگتا بھی چاہتا تو کیسے۔ کفارہ ادا کرنے بھی چاہتا تو کیسے۔ اس کے اختیار کے باہر تھا۔ وہ بے بس تھا۔ شاید یہ بے بسی ہی اس کے غرور کا سرینچا کرنے کے لیے کافی تھی۔

ریحان خان نے اپنی پریشانی کا ذکر اپنے گہرے دوست اور یس خان سے کیا۔ اور یس خان نے اسے مشورہ دیا کہ وہ خود کو کسی نفسیاتی ڈاکٹر کو چیک کرائے۔ لہذا وہ اپنی بد خوابی کے علاج کیلئے ایک ماہر نفسیات سے ملا۔

”ڈاکٹر صاحب مجھے کئی دن سے ایک ہی خواب نظر آتا ہے۔ کوئی بچہ ہے جو مجھے قتل کرنے کے لئے میرے سینے میں دل کے مقام پر تیز دھار خنجر اتار دیتا ہے میں ایک چیخ مار کر چونک اٹھتا ہوں۔ ہر روز یہی خواب نظر آتا ہے۔ بچہ بھی وہی ہوتا ہے اور اس کے ہاتھ میں خنجر بھی وہی۔ بتائیے میں اس خوف ناک خواب سے کس طرح چھٹکارا پاسکتا ہوں۔“

”دیکھئے ضروری ہے کہ مکمل اور صحیح پر مبنی معلومات حاصل ہوں تب کہیں جا کر ہم مرض کی تشخیص کرتے ہیں اور جب مرض کی تشخیص ہو جاتی ہے تب مریض کا علاج ممکن ہوتا ہے۔“

”جی ڈاکٹر صاحب آپ پوچھیے کیا کیا پوچھنا چاہتے ہیں میں جو بات مکمل اور صحیح پر مبنی ہی دوں گا۔“

”تمہارا پیشہ کیا ہے؟“

”ڈرائیونگ۔“

”کتنے عرصے سے ڈرائیونگ کر رہے ہو۔“

”تقریباً بیس سال سے۔“

”کیا اس دوران کوئی حادثہ پیش آیا ہے؟“

”جی ہاں کئی حادثے ہوئے ہیں۔ ایک بار میری کار

الٹ گئی تھی۔ ایک مرتبہ ایک شخص میری کار سے زخمی ہو گیا تھا۔ کئی بار ایکسی ڈنٹ ہوا تھا۔ جس میں مجھے بھی شدید چوٹیں آئی تھیں۔ دو ایک بار مجھے ڈاکوؤں نے لوٹا بھی تھا۔ کئی مرتبہ میرا مالک کار میں کئی چیزیں بھول گیا تھا جس میں ایک پرس بھی شامل تھا وہ میں نے اسے واپس نہیں کیا۔ کیا ڈاکٹر صاحب ان سب باتوں کا تعلق اس ڈراؤنے خواب سے ہو سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں۔ تم نے جواب مکمل تو دیا اب ڈرائیونگ جتاؤ کی اکسی کسی حادثے میں کوئی موت بھی واقع ہوئی ہے۔“

اس سوال پر وہ چونکا تھا۔ اگر چیخ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا تو قتل کا اعتراف کرے گا۔ اور اقبال جرم پر تو پھانسی کی سزا ہو جاتی ہے۔ ڈرائیونگ لائسنس میں بھی پھانسی کی سزا عمر قید میں بدل سکتی ہے۔ اور پھر ڈاکٹر کو قتل کے بارے میں بتانا قتل کا گواہ پیدا کرنا تھا۔ لہذا یہاں ریحان کو جھوٹ سے کام لینا پڑا۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کوئی شخص میری کار کی زد میں آ کر ہلاک ہوا ہو۔“

”دیکھئے ریحان صاحب آپ کے خواب کی نفسیاتی تعبیر یہ ہے کہ آپ سے کسی بچے کا قتل ہو گیا ہے۔ جس کی عمر بارہ یا تیرہ سال کے قریب ہے۔ وہ قتل کار کی زد میں آ کر ہوا ہے یا تمہارے ہاتھوں۔ بہر حال قتل پھر قتل ہے۔ اس قتل میں تمہارا تصور سراسر ہوگا۔ اس وقت وہ بچہ بے بس و جمہور ہوگا کہ تم سے بچ نہ سکا ہو گا یا ان جانے میں مارا گیا ہوگا۔ اب چونکہ جب تم سوتے ہو تو بے بس ہو جاتے ہو۔ اس لیے اس بچے کی لاشعوری طاقت تمہیں قتل کرنے آ جاتی ہے۔ یہ تمام کارروائی تمہیں خواب کی صورت میں نظر آتی ہے اور تم گھبرا کر چونک جاتے ہو یا ڈر کر بیدار ہو جاتے ہو۔ لیکن تم نے بتایا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تم سے دانستہ یا نادانستہ کوئی قتل ہوا ہو تو اس صورت میں تمہیں اپنے ذہن کو مکمل طور پر پرسکون یا کسی ایسی مصروفیت میں رکھنے کا مشورہ دوں گا جو اس صورت حال سے مختلف ہوتا کہ تم ذہنی طور پر اس میں مصروف رہو اور تمہیں اس طرف کا خیال تک نہ آئے۔ جب اس قسم کا خیال

الٹ گئی تھی۔ ایک مرتبہ ایک شخص میری کار سے زخمی ہو گیا تھا۔ کئی بار ایکسی ڈنٹ ہوا تھا۔ جس میں مجھے بھی شدید چوٹیں آئی تھیں۔ دو ایک بار مجھے ڈاکوؤں نے لوٹا بھی تھا۔ کئی مرتبہ میرا مالک کار میں کئی چیزیں بھول گیا تھا جس میں ایک پرس بھی شامل تھا وہ میں نے اسے واپس نہیں کیا۔ کیا ڈاکٹر صاحب ان سب باتوں کا تعلق اس ڈراؤنے خواب سے ہو سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں۔ تم نے جواب مکمل تو دیا اب ڈرائیونگ جتاؤ کی اکسی کسی حادثے میں کوئی موت بھی واقع ہوئی ہے۔“

اس سوال پر وہ چونکا تھا۔ اگر چیخ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا تو قتل کا اعتراف کرے گا۔ اور اقبال جرم پر تو پھانسی کی سزا ہو جاتی ہے۔ ڈرائیونگ لائسنس میں بھی پھانسی کی سزا عمر قید میں بدل سکتی ہے۔ اور پھر ڈاکٹر کو قتل کے بارے میں بتانا قتل کا گواہ پیدا کرنا تھا۔ لہذا یہاں ریحان کو جھوٹ سے کام لینا پڑا۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کوئی شخص میری کار کی زد میں آ کر ہلاک ہوا ہو۔“

”دیکھئے ریحان صاحب آپ کے خواب کی نفسیاتی تعبیر یہ ہے کہ آپ سے کسی بچے کا قتل ہو گیا ہے۔ جس کی عمر بارہ یا تیرہ سال کے قریب ہے۔ وہ قتل کار کی زد میں آ کر ہوا ہے یا تمہارے ہاتھوں۔ بہر حال قتل پھر قتل ہے۔ اس قتل میں تمہارا تصور سراسر ہوگا۔ اس وقت وہ بچہ بے بس و جمہور ہوگا کہ تم سے بچ نہ سکا ہو گا یا ان جانے میں مارا گیا ہوگا۔ اب چونکہ جب تم سوتے ہو تو بے بس ہو جاتے ہو۔ اس لیے اس بچے کی لاشعوری طاقت تمہیں قتل کرنے آ جاتی ہے۔ یہ تمام کارروائی تمہیں خواب کی صورت میں نظر آتی ہے اور تم گھبرا کر چونک جاتے ہو یا ڈر کر بیدار ہو جاتے ہو۔ لیکن تم نے بتایا کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تم سے دانستہ یا نادانستہ کوئی قتل ہوا ہو تو اس صورت میں تمہیں اپنے ذہن کو مکمل طور پر پرسکون یا کسی ایسی مصروفیت میں رکھنے کا مشورہ دوں گا جو اس صورت حال سے مختلف ہوتا کہ تم ذہنی طور پر اس میں مصروف رہو اور تمہیں اس طرف کا خیال تک نہ آئے۔ جب اس قسم کا خیال

”ریحان صاحب کیا یہ اسمگلر کار کو ٹھیک چلا رہا ہے؟“

”جی ہاں ڈاکٹر صاحب۔ اسمگلر کار کو ٹھیک چلا رہا ہے۔“

”کیا تیز رفتاری منع نہیں ہے؟“

پتلون سے رانوں میں ورد

کو لمبے سے نیچے پہنی جانے والی پینٹ پہ ظاہر فیشن میں داخل کبھی جاتی ہے لیکن اس سے کو لمبے کی ہڈی کے سامنے والے حصے میں واقع حساس عصی حصوں پر منفی اور منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ نیچی پتلونوں کا استعمال عورت اور مرد دونوں ہی کے لئے تکلیف کا سبب ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے رانوں میں جلن کی شکایت عام ہوتی ہے۔ اور تار پو (کینیڈا) کے ڈاکٹر مالدور پر مار کی تحقیق کے مطابق ان کے زیر علاج موٹی خواتین کی رانوں میں تکلیف کا اصل سبب نیچی پتلونیں تھیں۔ ان کا استعمال ترک کرنے کے بعد خواتین مہینوں سے جلا اس تکلیف سے نجات پا گئیں۔

منع تو ہے لیکن اس وقت اس کی جان کو خطرہ ہے۔ ”کیا اس کی تیز رفتاری سے دیگر لوگوں کی جان کو خطرہ نہیں ہے؟“

ڈاکٹر صاحب سڑک گاڑیوں کے چلانے کے لیے بنائی گئی ہے تاکہ انسانوں کے چلنے کے لیے۔ جیسا کہ ریل گاڑی کے لیے ریل کی پٹری بنائی جاتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص ریل کی پٹری پر آ کر اپنی جان دے دے تو اس میں ریل چلانے والے کا کوئی قصور نہ ہوگا۔

”یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن اگر کوئی جانور اچانک سامنے آ جائے تو پھر کیا ہو؟“ کیونکہ جانور کو تو اتنی سمجھ نہیں ہے کہ وہ سمجھ سکے کہ سڑک کس لیے ہے؟“

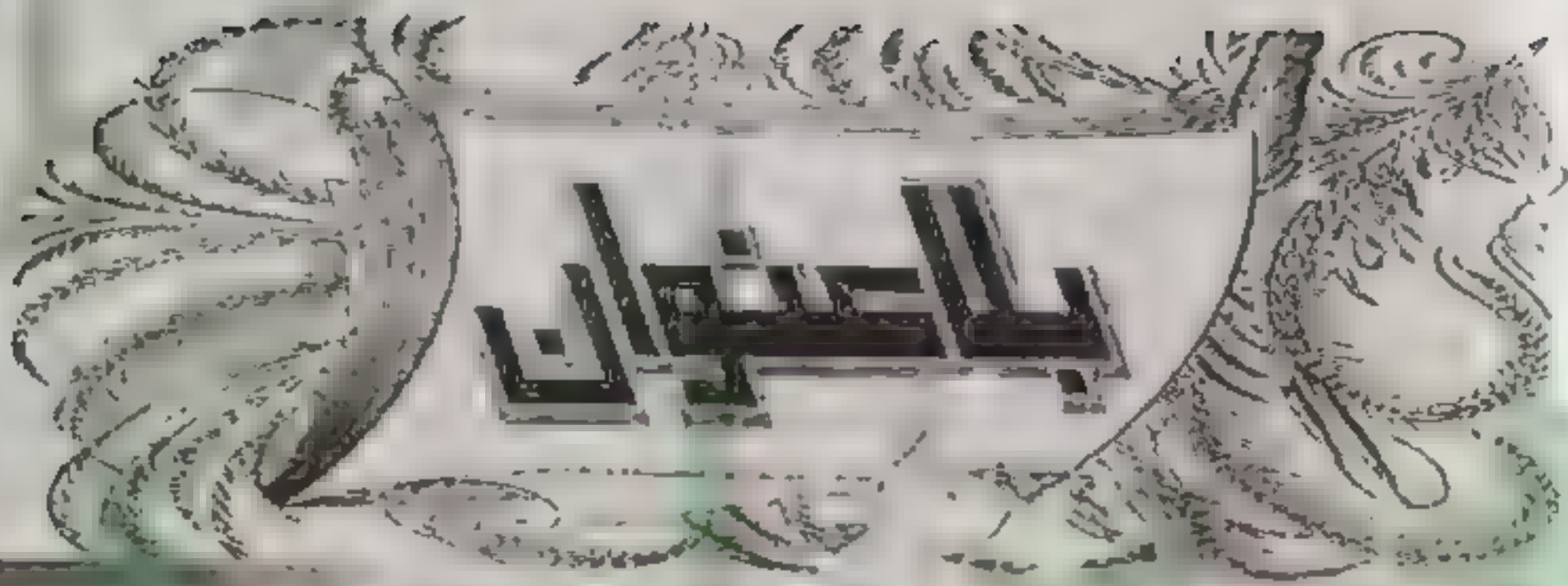
”ڈاکٹر صاحب انسان کی جان جانور سے زیادہ قیمتی ہے لہذا اس کی جان کی پرواہ کیے بغیر بھی گزرا جاسکتا ہے۔“

”اگر اچانک کوئی بچہ سامنے آ جائے تو؟“

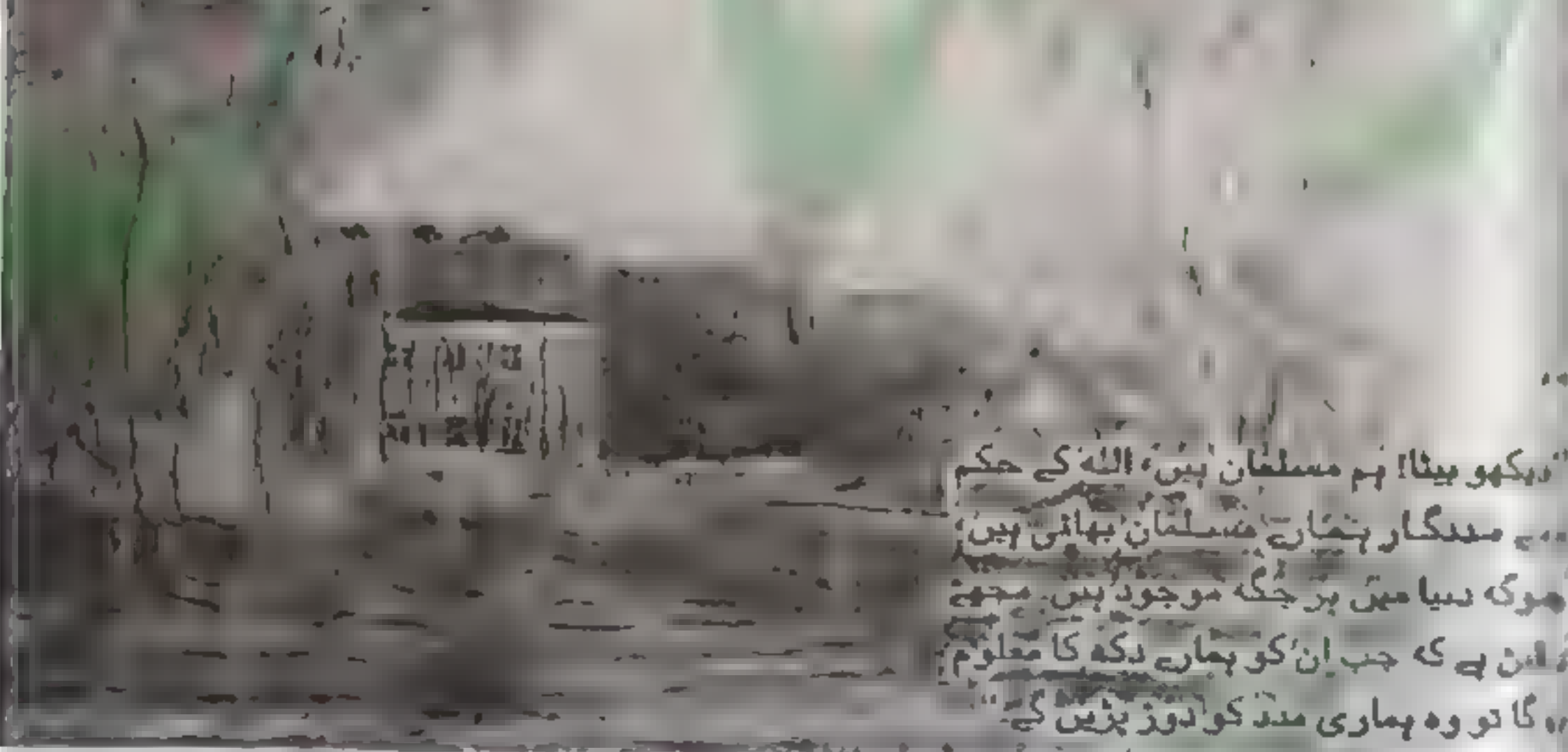
”گاڑی میں ہارن اسی لیے ہوتا ہے کہ سامنے آنے والے انسان کو مطلع کر دیا جائے کہ گاڑی آ رہی ہے ہشیار رہے۔“

”اگر وہ اتنی جلدی نہ سنبھل سکے تو؟“





ایک ایسا حادثہ



”دیکھو بیٹا! ہم مسلمان ہیں، اللہ کے حکم سے مسدگار بنیں۔ مسلمان بھائی ہیں۔ ہو کہ دنیا میں ہر جگہ موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب ان کو ہمارے دکھ کا معلوم ہو گا تو وہ ہماری مدد کو دوڑ پڑیں گے۔“

ایک ایسا حادثہ

ہارن بجا کر اسے مطلع کرتا رہا لیکن وہ جیسے بہرہ ور نوٹس لیے چلا رہا۔ میرا غصہ عروج پر پہنچا تو میں اسے طرح طرح مارتا ہوا گزر گیا۔ مگر سے اس کی ٹانگیں ٹوٹ ہوں گی۔ جب کہ دور جا کر گرنے سے اس کا سرفٹ میں لگا تھا۔ جس سے اس کے زندہ بچنے کے امکانات ہو گئے ہوں گے۔

اس حادثے کے بعد میں سویا تو وہی بچہ میرا خواب میں آ گیا۔ ہاتھ میں تیز دھار خنجر لیے ہوئے۔ وہ با آواز بلند کہتا ہے۔ ”خالم انسان تو نے ایسے بچے کو قتل کی اسے جو بہرہ تھا۔ وہ تیرا ہارن کچھ سکتا تھا۔ وہ بے بس تھا۔ آج تو بے بس ہی ہوں۔ آغوش میں لپٹا ہے۔ مدھوش ہو رہا ہے لہذا تو حرم نہیں کر سکتا۔ خود کو چاہتے ہوئے بھی بچا نہیں سکتا۔ اپنے خون کا بدلہ لے کر رہوں گا۔“ اسپیکٹر صاحب میرے خواب میں یہ کہتے ہوئے تیز دھار خنجر دل مقام پر سینے میں اتار دیتا ہے۔ وہ تکلیف سے دل چنچ ماکر بیدار ہو جاتا ہے۔

اسپیکٹر صاحب اس جان لیوا خواب نے میری نیند حرام کر دی ہیں۔ میرا سکون تباہ کر دیا ہے۔ اس نے میرے غرور کا سر نیچا کر دیا ہے۔ مجھے ماہر نقاش نے خود احتسابی کا علاج بتایا تھا لہذا میں نے احتساب کے لئے اپنے خمیر کی عدالت میں پیش کیا ہے۔ لہذا مجھے آپ اس بچے کے دانستہ قتل کے میں گرفتار کر کے سزا دلوائیں تاکہ میں اپنے خیمازہ دنیا میں ہی بھگت لوں اور باقی زندگی انسان کر رہوں اور خالم کا رونا ہیوں سے باز رہوں۔ اس سزا سے عوام الناس اور خاص طور پر ان لوگوں درس عبرت ملے گا جو مجھ سے سوچ رکھتے ہیں۔ رو داد پڑھ کر وہ بھی خود کو احتساب کیلئے پیش کر سکیں۔ غرور کرنا چھوڑ دیں کیونکہ غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔

☆☆☆

یہ اس کی قسمت ہے کہ زندہ بچے یا مر جائے۔ یہ سنتے ہی ڈاکٹر نے ویڈیو فلم روک دی۔ کمرے میں اجالا کر دیا۔ ریحان کو ایسا لگا جیسے وہ خواب سے بیدار ہوا ہے آندھیرے سے اجالے میں آیا ہے۔ ”کیا ہوا ڈاکٹر صاحب؟“ ریحان نے اپنی الجھن کو سلجھاتے ہوئے کرسی میں دھستے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب مجھے بھی بتاؤ تا مرض کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟“

ریحان صاحب اس کا علاج آپ ہی کے پاس ہے آپ چاہیں تو اس ڈراؤنے خواب سے چھٹکارا پا سکتے ہیں اور وہ علاج ہے خود احتسابی کا۔ اپنے خمیر کی عدالت میں خود کو پیش کریں فیصلہ خود بخود آپ کے حق میں ہو گا۔“ ڈاکٹر کی تشخیص سن کر ریحان چپ چاپ اٹھ کھڑا ہوا اور سوچ کی گہرائیوں میں مستغرق گہروں کی یاد دہ رات بھر سوچتا رہا۔ صبح پر عزم ادارے لے کر کمرے نکل گیا۔ ریحان خان اسپیکٹر جیشیم اختر کے کے سامنے خود کو پیش کرتے ہوئے بیان دے رہا تھا۔

”اسپیکٹر صاحب! میں ایک ڈرائیور ہوں۔ پٹھے سے منسلک ہوئے مجھے میں سال ہو گئے ہیں۔ میں ایک متکبر اور گھمنڈی شخص ہوں۔ تیز رفتاری میری عادت میں شامل ہے۔ میں کار چلاتا ہوا خود کو ہوا میں اڑاتا محسوس کرتا ہوں جیسے ہوائی جہاز کا پائلٹ اپنے راستے میں کسی رکاوٹ کو برداشت نہیں کرتا اسی طرح میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی انسان یا جانور میرے راستے کی رکاوٹ نہ بنے۔ مجھے راستے میں آئے ہوئے انسان جانور ٹکٹے ہیں اور جانور کیڑے مکوڑے دکھائی دیتے ہیں۔

میں نے نہ جانے کتنے انسانوں کو اپنے غرور کی بھیشت چھٹا کر اپنا چ کیا ہے۔ کتنے ہی جانوروں کو ایذا نہیں پہنچائی ہیں۔ اب تک میرے ظلم کی کارروائیاں مٹتی رہی تھیں مگر حال ہی میں مجھ سے ایک حادثہ ہو گیا۔ میری کار کے سامنے ایک بارہ یا تیرہ سال کا لڑکا آ گیا۔ میں بار بار

شاز یہ جھوٹیڑی سے باہر جاتے ہوئے بولی۔ شاز یہ جس نے ابھی اپنے گھر سے ایک قدم ہی باہر رکھا تھا۔ سامنے کا مسٹر دیکھ کر چیخ پڑی اور ہکلاتے ہوئے بولی۔ ”بب۔۔۔۔۔ بب۔۔۔۔۔ بابا! پانی آرہا ہے۔ وہ۔۔۔۔۔ دیکھو!“

”ارے بھائی کیا ہوا ہے کون سا پانی۔“ بابا جعفر جو کہ باہر آ چکا تھا اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکا کیونکہ واقعی پانی کی بڑی بڑی لہریں اڑتی ہوئی سی آرہی تھی۔ ”یہ تو شاید سمندر کی لہریں ہیں م۔۔۔۔۔ مگر ان کو کیا ہوا؟“ بابا جعفر سوچ رہا تھا۔ ان کی جھوٹیڑی بلکہ ان کی نہیں ان جیسے سیکڑوں چھیروں کی جھوٹیڑیاں سمندر کے بالکل ساتھ تھیں جن کا رزق خدا نے اس سمندر میں لکھا تھا۔ یہ

”میں نہیں جانتا کہ میں اس کہانی کو کوئی عنوان یا نام کیوں نہیں دے سکا مگر آپ لوگ کہانی پڑھیے اور آپ کو کہانی پڑھ کر جو محسوس ہو اسی حساب سے آپ اس کا کوئی عنوان یا نام رکھ سکتے ہیں۔“

”بابا۔۔۔۔۔ بابا! پانی آرہا ہے جلدی آؤ بابا!“ لٹھے باقر نے جس کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہیں تھی اپنے دادا کو جھوٹیڑی کے باہر کھڑے کھڑے آواز دی۔ باقر کا دادا جعفر (جو کہ جھوٹیڑی کے اندر اپنی ٹوٹی ہوئی ہار پائی کو ٹھیک کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا) نے اپنی سہکوا آواز دی۔

”شاز یہ بٹی! یہ باقر کیا کہہ رہا ہے ذرا باہر دیکھنا۔“ ”اچھا بابا! دیکھتی ہوں۔“



سمندر ان کے ہر دکھ درد کا ساتھی تھا۔ یہ سمندر ہی تھا جو ان کو دو وقت کا کھانا دیتا۔ ان کی خوشیوں کو دو بالا کرتا بلکہ یہ کہتا بے جا نہ ہوگا کہ یہ سمندر ہی ان کا ہم درد ساتھی تھا مگر آج یہ ہم درد ساتھی ہی ان سب کا دشمن بن گیا تھا۔ وہ سمندر جو ان کو بہت کچھ دیتا تھا۔ آج ان کا سب کچھ جھین رہا تھا جن میں ان کے گھر، بہن، بھائی، ماں باپ اور جانے کیا کیا۔ سمندر کی پھری ہوئی لہریں ان فقیر انسانوں کو اٹھا کر دور دور پھینک رہی تھیں، ہر طرف افراتفری کا عالم تھا اور عجیب بے حسی کا عالم تھا کہ اس وقت ہر کوئی ایک دوسرے کو بھول چکا تھا۔ ہر ایک کو اپنی اپنی جان کی فکر تھی۔ ہر طرف جھین تھیں، صدائیں اور فریادیں تھیں۔ اف..... کیسا عالم تھا خدا کی پناہ..... چند گھنٹوں کے بعد جب لہروں کا زور ٹوٹا اور سمندر کچھ پرسکون ہوا تو چند لمحوں پہلے جو لوگ اپنی اپنی جانیں بچا رہے تھے ان کو اب اپنے گھروں اور عزیزوں کی فکر لاحق ہوئی۔ سینکڑوں میں سے تو بڑی تعداد ہلاک ہو چکی تھی کچھ کو سمندر نگل گیا اور کچھ زخموں کی وجہ سے ہلک رہے تھے۔ آہ دہکا کر رہے تھے۔ ہر کوئی ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ ہر ایک کو اپنے اپنے عزیز کی تلاش تھی۔ بابا جعفر جس کا ذہن اب بھی اس حادثے کو ماننے کو تیار نہ تھا، کھلے اور کچھ زدہ میدان میں بھاگتا پھر رہا تھا۔ وہ میدان میں بڑی لاشوں کو الٹ الٹ کر دیکھتا۔ کچھ ہی دیر میں اسے ایک پرانے بوڑھے درخت کی جڑ کے قریب اپنا پوتا روتا ہوا ملا۔ بابا جعفر کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اس کا پوتا زندہ ہے۔ اب انہوں نے اپنی بہو کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں ایک درخت کے اوپر بابا کی بہو کی لگی ہوئی لاش مل گئی۔ بابا جعفر کا خاندان پہلے ہی چھوٹا سا تھا۔ ایک بیٹا، بہو، پوتا اور وہ خود۔ چند ماہ پہلے بیٹا ایک حادثے میں چل بسا اور اب بہو بھی چل بسی۔ بابا جعفر اپنے پوتے کے سوالوں کے جواب نہ دے پا رہا تھا، جو ایک ہی بات کہے جا رہا تھا۔

ابا! اماں کہاں گئی؟..... وہ کیوں گئی؟..... بابا چلو اماں کے پاس۔“

کچھ ہی دیر میں بچے کچھ لوگ ایک جگہ جمع ہو گئے اور اسٹھے بیٹھ کر غم غلط کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ اس دوران باقر نے اپنے دادا سے پوچھا۔

”بابا! اب ہمارے گھر کیسے بنیں گے۔ ہم سب کو جو چوٹیں آئی ہیں ان کی دوائی ہمیں کون دے گا۔ سب کچھ پانی لے گیا۔“

بابا جعفر کو باقر کے ننھے ذہن سے ایسے سوال کی توقع نہیں تھی مگر بابا نے جواب دیا۔

”دیکھو بیٹا! ہم مسلمان ہیں، اللہ کے حکم سے مددگار ہمارے مسلمان بھائی ہیں، جو کہ دنیا میں ہر جگہ موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب ان کو ہمارے دکھ کا معلوم ہوگا تو وہ ہماری مدد کو دوڑ پڑیں گے۔“

☆

ٹی وی پر تین چار روز سے لگا تار خبروں میں بتایا جا رہا تھا کہ دنیا کے مختلف خطوں میں جن میں انڈونیشیا، سری لنکا، تھائی لینڈ، انڈیا اور بہت سے افریقی ممالک شامل ہیں۔ ان میں ایک بہت بڑا سمندری طوفان آیا اور لاکھوں افراد قتل، اجل بن گئے۔ اس کے ساتھ ہی ٹی وی پر بچ جانے والے افراد کی مدد کی اپیل کی جا رہی تھی۔ سن گئی بھی کئی روز سے اپنے باپ کے ساتھ یہ سب کچھ ٹی وی پر دیکھ رہا تھا۔

”ابو! یہ کیا ہوا ہے؟“ علی نے اپنے باپ سے پوچھا۔

”بیٹا! کچھ ممالک پر بہت بڑی مصیبت نازل ہوئی ہے اور ان کی مدد کے لیے کہا جا رہا ہے۔“ علی کے ابو نے جواب دیا۔

”تو کیا ان میں مسلمان بھی ہیں ابو!“

”ہاں بیٹا! ان میں مسلمان بھی ہیں اور دوسرے بھی بہت سے لوگ شامل ہیں۔“

”تو ابو! ہمیں بھی ان کی مدد کرنی چاہیے۔“

”یقیناً! ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔“

”تو ابو وہ اقبال انکل کے اسٹور پر ان لوگوں کی مدد کے لیے پیسے جمع ہو رہے ہیں۔ ہم بھی پیسے دیں گے۔“ علی تجسس سے اچھلتا ہوا بولا۔

”ہاں بیٹا! یہ لو پیسے اور تم بھی دے آؤ۔ اس سے ان لوگوں کی مدد ہو جائے گی۔ شرف کو ساتھ لے جانا۔ لو جاؤ!“ علی کے باپ نے جیب سے ایک سو کا نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ علی سو کا نوٹ لے کر باہر کو چل تو دیا مگر وہ سوچ رہا تھا کہ کل شام کو جب ابو گھر آئے تھے تو وہ بہت خوش تھے اور انہوں نے ماما کو بتایا تھا کہ ان کو کاروبار میں صرف ایک دن میں پانچ لاکھ کا پروفٹ ہوا ہے۔ علی سوچ رہا تھا کہ پاپا نے مجھے صرف ایک نوٹ دیا ہے جب کہ ماما کو تو انہوں نے بہت سے نوٹ دیے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ نوٹ ان سب سے بڑا ہو۔ ہاں اس لیے انہوں نے مجھے یہ پیسے دیے ہیں۔ علی نے اپنے کم سن ذہن سے سوچتے ہوئے کہا۔

☆

ڈاکٹر عرفان اپنے دوست ڈاکٹر جاوید کے ساتھ بیٹھا سو نامی کے طوفان پر بات چیت کر رہا تھا۔

”یار عرفان! اس مشکل وقت میں ہمیں بھی ان لوگوں کی مدد کے لیے جانا چاہیے۔ جاوید ٹی وی کی طرف نظریں جمائے بولا۔

”جانا چاہیے! کیا مطلب؟“ عرفان حیرانی سے بولا۔

”دیکھو یارا! ان لوگوں میں جن پر مصیبت نازل ہوئی ہے۔ ان میں ہمارے مسلمان بھائی بھی شامل ہیں اور خدا نے ہمیں اتنا کچھ عطا کیا ہے ہمیں وہاں جا کر ان کی مدد کرنی چاہیے۔“ جاوید بولا۔

”چھوڑ دیا راکھ پیسے دے دیتے ہیں۔ ہم کیوں وہاں جا کر وقت اور پیسہ ضائع کریں۔“ عرفان منہ بتاتے ہوئے بولا۔

”میں تو جاؤں گا تم نہ جاؤ!“ ڈاکٹر جاوید بولا۔

”اچھا جاؤ مجھے کیا۔“

اس دوران فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ جاوید نے فون اٹھایا اور کچھ دیر بعد بات کر کے فون رکھ دیا۔

”وہ عرفان! میری جو پوسٹنگ کا مسئلہ تھا میری شہر میں پوسٹنگ رکی ہوئی تھی وہ مسئلہ حل ہو گیا، یعنی میری پوسٹنگ شہر میں ہو گئی۔ ہاں یارا تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہاں جا کر بھی ہم وقت ضائع کریں گے۔ ہمیں پر کچھ پیسے دے کر مدد کر دیتے ہیں۔“ ڈاکٹر جاوید اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

☆

طوفان سے بچے ہوئے لوگوں کے لیے مختلف تنظیموں نے کمپ لگا دیے تھے اور وہاں مہاجرین کی دیکھ بھال کی جا رہی تھی۔ انہی میں ایک خیمے میں باقر اپنے دادا جعفر کے ساتھ بیٹھا تھا۔

”بابا! یہ لوگ جو ہماری مدد کر رہے ہیں کیا یہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں؟“ باقر نے اپنے دادا سے پوچھا۔

”نہیں بیٹا! یہ ہمارے مسلمان بھائی نہیں ہیں۔“

”تو بابا! وہ لوگ کیوں نہیں آئے؟“

”آئیں گے بیٹا! وہ لوگ ضرور ہماری مدد کو آئیں گے۔“ بابا جعفر نے غلامی میں گھورتے ہوئے کہا۔

”لیکن بابا! کب آئیں گے وہ آخر کب.....؟“

بابا جعفر جو کئی روز سے اس سوال کا جواب دے رہا تھا مگر اب اس کے پاس بھی اس سوال کا جواب نہیں تھا۔

”بابا! بتاؤ ناں ہمارے مسلمان بھائی ہماری مدد کو کب آئیں گے۔ بابا تم بتاتے کیوں نہیں!“ بابا جعفر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تو اپنے ہم درد سمندر کو گھور رہا تھا جو شاید پھر ایک وقفہ اپنی ہم دردی جتانے آنے والا تھا۔

☆

اب آپ لوگ خود سوچے کیا یہ ایک کہانی ہے یا حقیقت.....؟ مگر میرے خیال میں یہ ایک حقیقت ہے۔ ایک تلخ حقیقت اور حقیقت کو کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ آپ کے خیال میں یہ کیا تھا..... مجھے ضرور بتائیے گا۔

☆☆☆



# بے بدن

## ایم ایے واٹ

نیاز احمد نے فرمایا کہ یہ فلیٹ ان کے جاننے والے کا ہے اور اس جاننے والے نے اس فلیٹ کو ایک اور شخص کو کرائے پر دیا ہوا ہے وہ شخص جس نے فلیٹ کرائے پر لیا ہوا ہے وہ اس بات پر آمادہ ہے کہ اس کا ایک کمرا مزید کرائے پر دے دیا جائے۔

زندگی کے ناآسودہ خوابوں کی تعمیر ایک انوکھی آپ بیتی

ہے ماں باپ یاد ہیں مگر ایک مٹی مٹی سی تحریر کی طرح جو کسی بوسیدہ کتاب کے اوراق کی مانند ہو۔

دیے کسی تنہا شخص کی زندگی بھی کیا ہوتی ہے۔ محبتوں کو ترسا ہوا رقاتوں کا خواہاں ہر شخص سے پیار کا طلب گار۔ ممکن ہے میری سوچ بہت سے لوگوں سے جدا ہو بے شمار لوگ تنہائی پسند ہوتے ہیں۔ انہیں ہنگاموں سے دشت ہوتی ہے۔ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو اپنے گھر سے صرف اس لیے بیزار ہوتے ہیں کہ وہاں بچے شور مچاتے ہیں۔ ہنگامے ہوتے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جو تنہا ہیں خوش ہیں لیکن میری نگاہ میں وہ زندگی بیزار لوگ ہوتے ہیں۔ بچے تو حسن کائنات ہیں زندگی کی خبر دیتے ہیں وہ۔ مجھے بچوں کا شور بہت پسند ہے۔ پھول جیسے۔ نازک نازک قلعاریاں مارتے ہوئے۔

میں ایک بینک میں ملازمت کرتا ہوں زندگی کا بڑا حصہ لاہور میں گزرا۔ کراچی کا تصور ایک سحر کی مانند تھا اور میں نے اس کے بہت سے خواب دیکھے تھے۔ جب بھی فرصت ملتی مری کاغان نارائن وغیرہ کل جاتا کراچی

میراثام نامر حال ہے۔ شکر ہے جمال عبدالناصر نہیں ہے ورنہ بڑی شرمندگی ہوتی کہ ایک تو مصر کا سربراہ تھا اور دوسرا بینک کا معمولی کلرک۔ دیے یہ بھی شکر ہے کہ ناموں پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ کم از کم انسان کو ایک آزادی تو حاصل ہے کہ جیب میں پھٹی کوڑی نہ ہو لیکن نام مرزا قارون بیک رکھا جاسکتا ہے۔ چھپکل سے جان نکلتی ہو نام سکندر اعظم یا قتل سے نور اپہاری لگتی ہو نام حسن آراء وغیرہ۔

خیر زندگی کی اس کہانی میں نام بنیادی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ تو بس تذکرہ کل آیا۔ کہا جاتا ہے کہ گھوڑے کے بھی دن پھرتے ہیں گھوڑا جانتے ہیں آپ...؟ پرانی اصطلاح ہے اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوڑے کے مستقل ڈبیر ہوتے ہیں تو کہانی گھوڑے کی بھی نہیں ہے میں تو آپ کو اپنی زندگی کی کہانی اپنی آپ جتنی سنا رہا تھا۔

اس کائنات میں تنہا تھا "تھا" کو ذہن میں رکھئے کیونکہ اب خدا کے فضل سے تنہا نہیں ہوں۔ ہاں دیے بہت سے رشتوں سے محروم ہوں۔ ماں باپ بہن بھائی کوئی نہیں









کوئی تیس کے لگ بھگ ہوگی۔“ وہ کہتے۔

”جی ہاں! آپ کا خیال درست ہے۔“

”تو پھر شادی کب کرو گے بڑھاپے میں؟“

”بہر حال ایسی بھی بات نہیں ہے فرید صاحب بس کچھ ایسی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔“

”پوچھنے کی بات تو نہیں ہے ناصر صاحب ذاتی مسائل ہیں لیکن میرا خیال ہے آپ پر انہیں مانیں گے۔“

”نہیں فرید صاحب آپ بلا جھجک پوچھ سکتے ہیں۔“

”وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر آپ نے شادی نہیں کی۔“

”اوہ فرید صاحب بات اتنی گہری نہیں ہے بات صرف یہ ہے کہ شاید کے کچھ لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اس بڑے شہر میں جہاں انسان تنہا زندگی ہی گزارنے کے لیے بے پناہ مشکلات کا سامنا کرتا ہے اور ان حالات میں اگر کسی دوسرے کو اپنی زندگی میں منسلک کر لیا جائے تو میرا خیال ہے دوسرے کے ساتھ بھی زیادتی ہوگی۔ اچھے گھر کی خواہش ہر انسان کے دل میں ہوتی ہے۔ اور خاص طور سے وہ لڑکی جو بیوی بن کر کسی گھر میں آتی ہے اسے پر آسائش دیکنا پسند کرتی ہے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے میاں لیکن جب تمام عورتیں ہی اس زیادتی کی عادی ہیں تو پھر تم شادی سے محروم کیوں رہو۔“ فرید صاحب ہنس کر کہتے اور میں بھی ہنس پڑتا۔

بہر حال اس مسئلے پر لوگوں نے کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ بے چارہ شیریں مجھ سے اس قدر مل گیا تھا کہ وہ اکثر میرے پاس آنے کی کوشش کرتا۔ بچے کو تو محبت کے چند الفاظ اور میٹھی میٹھی تافیاں چاہیے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ چنانچہ شیریں اپنے گھر کی پکلی ی گلی پار کر کے میرے دروازے تک آ جاتا اور پھر کچھ ایسا ہوا کہ وہ اکثر میرے گھر کے دروازے پر میرا انتظار کرتے

لگا۔

بچے کی یہ الفت پا کر میں اس سے اور بھی زیادہ کرنے لگا۔ میں خوش بھی رہنے لگا کیونکہ مجھے خدا تخلیق کیے ہوئے بالکل بے ضرر اور معصوم سے انساں رفاقت مل گئی تھی درحقیقت میں اس سے بے پناہ کرنے لگا تھا۔

کئی بار میں اس کے لیے کھلوے بھی لایا جو میں اس کو دے دیتے۔ حالانکہ ان کھلونوں کو قبول کرنے میں وہ قدح ہوتی تھی۔ لیکن براہ راست مجھ تک کوئی ہاتھ نہیں پہنچتی تھی۔ ہاں ایک چمٹی والے دن فرید صاحب میرے کمرے میں آئے اور بولے۔

”ناصر صاحب اب آپ کافی زیادتیاں کرتے ہیں۔“

”میں نہیں سمجھا فرید صاحب۔“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”دیکھو نا اس بچے کو اتنا سر چڑھا رہا ہے ہو کہ یہ سر چڑ جا رہا ہے۔ بہت زچ کرنے لگ گیا ہے ہمیں۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا فرید صاحب۔ اس پیارے بچے نے کیا قصور کیا ہے؟“ میں نے شیریں کے بالوں سے کھیلنے ہوئے کہا۔

”بھئی ہر وقت تمہاری ہی طرف آنے کی رٹ لگا رہتا ہے۔ ہر وقت تمہیں یاد کرتا ہے۔“ فرید صاحب نے کہا۔

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ فرید صاحب شادی جب میں آتا ہوں تو اسے میرے پاس بھیج دیا کرتا ہوں۔ میرا بھی دل بہل جاتا ہے تنہائی دور ہو جاتی ہے۔“

”میں یہ تنہا سا بچہ تنہا دیرے لیے بڑا غم گسار ہے۔“ فرید صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ کچھ دیر سے ہو گئے تھے۔ میں نے اس وقت ان کی اس خاموشی غور بھی نہیں کیا لیکن اب.....“

اسے اچانک ہی الٹیاں ہونے لگی تھیں۔ مجھے علم نہیں تھا کہ فرید صاحب گھر پر نہیں ہیں۔

شام کے تقریباً سات بجے ہوں گے کہ میرے کمرے کا دروازہ کھٹکایا گیا۔ عام طور سے میں اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رکھتا تھا۔ جب گھر میں موجود ہوتا تھا۔ ہاں کہیں جانا ہوا تو مجبوری تھی بہر حال میں نے بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔

”کون ہے؟“ دروازہ کیونکہ کھلا رہتا تھا اس لیے آنے والے اندر ہی آ جاتے تھے۔ ان میں عام طور سے میرے دوست ہوتے تھے۔ وہ بھی شاذ و نادر ہی ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ میں اس معاملے میں تھوڑا سا محتاط تھا۔ نہیں چاہتا تھا کہ میرے دوستوں کی آمد سے کسی کو تکلیف ہو۔ کیونکہ دوسرے کا گھر میرے گھر یا میرے کمرے سے ملحق تھا۔ میں عام طور سے خود ہی دوسرے لوگوں کو نہیں بلاتا تھا۔ کیونکہ دوسرے لوگوں کا معاملہ تھا اور میں مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ اس کمرے میں میرے دوستوں کے بے تکلف قیام کو نہیں اور دوسروں کو شکایت کا موقع ملے۔

بہر حال میری آواز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ تب میں نے دوبارہ ہانک لگائی۔

”کون ہے بھائی! اعدا آ جاؤ۔“ اور دوسری بار آواز لگانے کا اثر ہوا تھا کہ ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

”ذرا باہر تشریف لائیے۔“ آواز میری سماعت سے کرائی اور میں چونک پڑا۔

حیرت زدہ سا میں باہر پہنچا تو ایک خاتون منہ پھیرے کھڑی ہوئی تھیں میں نے پوچھا۔ ”فرمائیے کیا بات ہے؟“

”میں..... میں آپ کے برابر رہتی ہوں۔ میرا مقصد ہے شیریں۔“ خاتون بری طرح نروس ہو رہی تھیں۔ ”اوہ آپ شیریں کی امی ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”فرمائیے کیا بات ہے؟“

”میں نے رخ بدل لیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان خاتون کو کسی قسم کی ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑے تب خاتون دوبارہ بولیں۔

”وہ..... وہ دراصل شیریں کی طبیعت اچانک شدید خراب ہو گئی ہے اسے شدید الٹیاں ہو رہی ہیں۔“

”ارے اچھا فرید صاحب تو دکان پر ہوں گے؟“ میں نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

”جی نہیں۔“

”گھر پر؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”جی نہیں۔ وہ کام کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر گئے ہوئے ہیں۔ فرید صاحب کی ٹیم نے جواب دیا۔

”اوہ کب؟“

”آج ہی صبح۔“

”تو پھر کب واپس آئیں گے؟“

”شاید آج نہیں؟“

”کچھ بتایا نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کل تک آنے کی امید ہے۔“ خاتون نے جواب دیا۔

”اوہ۔ آپ فکر نہ کریں۔ کیا چاہتی ہیں آپ میں اسے ڈاکٹر تک لے جاؤں یا ڈاکٹر کو نہیں بلانا ہے؟“

”جی نہیں میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی ہوں۔“

”تو پھر جیسا حکم کریں۔ کیا آپ میرے ساتھ چلنا پسند کریں گی یا پھر مجھے بتادیں کہ آپ اسے کس ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی ہیں۔ میں اسے خود لے جاتا ہوں۔“

”میں بھی چلوں گی۔“ ماں کی متا بھری آواز سنائی دی۔

”تو پھر چلیے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں میں برقع اوڑھ لوں۔“

”ٹھیک ہے آپ شیریں کو لیں میں ٹیکسی لے آتا



”بہتر میں آپ کو تکلیف دینے پر شرمندہ ہوں۔“  
 ”ارے شرمندگی کیسی۔ کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ شیریں بیمار ہے بلکہ میں تو سوچ رہا تھا کہ وہ ابھی تک میرے پاس آیا کیوں نہیں۔“

”میں ابھی آرہی ہوں۔“ خاتون نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

”بہتر آپ نیچے تشریف لائیے۔ میں نیچے ٹیکسی لیتا ہوں میں نے کہا اور پھر میں نے انتہائی تیزی سے لباس تبدیل کیا۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا اور نیچے اتر آیا۔ اور نیچے اترنے کے بعد ٹیکسی تلاش کرنے لگا۔

خوش بختی سے ٹیکسی کسی تلاش کے بغیر ہی مل گئی۔ ڈرائیور بھی کوئی شریف آدمی تھا۔ فوراً تیار ہو گیا۔ اور چند ساعت کے بعد خاتون شیریں کو سنبھالنے ٹیکسی کی پچھلی نشست پر آکر بیٹھ گئیں میں ڈرائیور کے سات والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

خاتون کے بتانے پر میں انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے شیریں کو اچھی طرح دیکھا اسے انجکشن لگائے اور کچھ دوائیں دیں۔

دواؤں کا پرچہ خاتون نے میرے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ جنہیں میں فوری طور پر قریبی کیمسٹ سے خرید لایا اور پھر میں ان خاتون کو لے کر واپس گھر پہنچ گیا۔ میں نے ان سے کہا۔ ”معاف کیجئے گا بھابی جان اتفاق سے میں آپ سے باقاعدہ متعارف نہیں ہوں لیکن آپ تو مجھے جانتی ہی ہوں گی۔ آپ کسی قسم کی تکلیف نہ کریں۔ بلکہ جو کچھ چاہیے ہو مجھ سے فرمادیں۔ فرید صاحب آجائیں تو پھر کوئی بات نہیں ہے لیکن اس وقت تک جب تک آپ تنہا ہیں براہ کرم کسی بھی قسم کی تکلیف نہ کریں میں ہر طرح سے آپ کے کام آنے کے لیے تیار ہوں۔“ میں نے

کہا۔

”نہیں بھائی جان سب ٹھیک ہے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے بالکل اپنوں کی طرح میری یہ تکلیف دور کی ہے۔“

”اوہ بھابی جان شکریے کی کوئی بات نہیں ہے شیریں میرے لیے جو حیثیت رکھتا ہے۔ اسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ شاید آپ اس حیثیت سے واقف نہیں ہیں۔ درنہ کبھی اس مسئلے میں شکریہ ادا نہ کرتیں۔“

”میں سمجھتی ہوں بھائی جان آپ شیریں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں آپ دعا کریں کہ وہ صبح تک ٹھیک ہو جائے۔“

”میں دعا کروں گا۔“ میں نے خلوص سے کہا اور اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔ خاتون اندر چلی گئی تھیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد میں نے خود ہی ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر سے خاتون کی آواز سنائی دی۔

”کون ہے؟“

”معاف کیجئے گا بھابی جان میں ناصر جمال ہوں۔ یہ بتا دیجیے کہ شیریں کیسا ہے اور اس کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی یا۔۔۔۔۔“

شیریں سوچا ہے اور بہتر ہے۔ ایک اور تکلیف کریں بھائی جان!“

”جی فرمائیے۔“

”یہ جو پیسے آپ کے خرچ ہوئے ہیں وہ لے لیں۔“  
 ”اوہ بھابی جان میں آپ کے لیے بلاشبہ اجنبی ہوں لیکن شیریں کے لیے نہیں براہ کرم یہ سب کچھ کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔“

”نہیں بھائی جان یہ خلاف اصول بات ہے آپ ویسے بھی شیریں کے لیے بہت کچھ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن براہ کرم یہ پیسے لے لیجیے اور اگر آپ نے پیسے نہ لیے تو فرید صاحب بھی اس بات کو پسند نہیں کریں گے۔“

”جیسی آپ کی مرضی بھابی جان اگر یہ بات ہے تو

آپ پیسے مجھے دے دیں ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ شیریں میرے لیے اتنی اہمیت رکھتا ہے جتنی کے آپ کے لیے۔ بلاشبہ یہ بات آپ کو متاثر نہیں کر سکے گی اور نہ ہی آپ کو میری بات کا یقین آئے گا کہ میں واقعی شیریں کے لیے اس قدر پر محبت ہوں لیکن بھابی جان یقین دلانے کا میرے پاس اور کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔ آپ بہر حال ماں ہیں اور ماں اپنی محبت کو اپنے بچے کے لیے مکمل سمجھتی ہے۔“

”میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ براہ کرم یہ پیسے لے لیں۔“ اور خاتون نے کچھ نوٹ پکڑ کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میں پھر بھی کہوں گا کہ میرے ذہن میں کوئی ایسی بات پیدا نہیں ہوئی جسے ناپسندیدہ کہا جاسکتا۔ یا پھر کوئی ایسی گمناؤنی یا گندی سوچ میرے ذہن میں بیدار نہیں ہوئی تھی کہ اس خاتون کے بارے میں کوئی بری بات سوچتا خاتون کا ہاتھ آگے بڑھا ہوا تھا اور ان میں کچھ نوٹ دبے ہوئے تھے میں نے وہ نوٹ اٹھا لیے۔

اور میں واپس چلا گیا شیریں کے لیے میں بہت پریشان تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ بار بار اس کی خیریت معلوم کروں لیکن بہر صورت یہ بات مناسب نہیں تھی۔

فرید صاحب ہوتے تو اس میں کوئی ہرج بھی نہیں تھا۔ بہر صورت دوسری صبح مجھے اطلاع ملی کہ شیریں خیریت سے ہے۔

دفتر جانے سے پہلے میں نے شیریں کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور قسلی بخش جواب پا کر مطمئن ہو گیا۔

عجیب سی بات تھی شیریں کی بیماری کی وجہ سے دفتر میں بھی دل نہیں لگا تھا۔ شام کو سیدھا گھر پہنچا اور سب سے پہلے دروازے پر دستک۔ ے کر میں نے شیریں کی خیریت معلوم کی اور جواب میں فرید صاحب نکل آئے۔

”ٹھیک ہے شیریں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ ناصر

صاحب آپ نے بڑی مدد کی میں تو اچانک ہی چلا گیا تھا۔ ورنہ آپ کو اطلاع دے کر جاتا۔“ فرید صاحب نے شکر گزاری سے کہا۔

”ارے کوئی بات نہیں فرید صاحب یہ تو میرا فرض تھا اور پھر شیریں۔۔۔۔۔ شیریں کے لیے آپ یقین کریں میں بہت پریشان رہا ہوں۔“

”بہر صورت اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اسے بہت چاہتے ہیں لیکن اب وہ ٹھیک ہے۔“

غالباً اسی تعاون کا نتیجہ تھا کہ اب اکثر کبھی کبھی کوئی چیز جو گھر میں پکی ہوتی تھی میرے لیے آجاتی تھی اور شاید اس کا علم فرید صاحب کو بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ان خاتون کی جانب سے میری کوئی پذیرائی نہیں ہوئی تھی۔

اتنے عرصے ساتھ رہنے کے باوجود میں نے ان کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا اکثر وہ فرید صاحب کے ساتھ جاتی تھیں لیکن برقع اوڑھ کر اور برقعے کا صحیح استعمال کرنے کے بعد یعنی ان کا چہرہ ڈھکا ہوتا تھا۔

چھٹی کا دن تھا۔ فرید صاحب حسب معمول میرے پاس آگئے اور ہم دونوں چائے پی رہے تھے۔ تب اچانک فرید صاحب نے کچھ برتن دیکھے اور بولے۔

”ارے یہ تو ہمارے گھر کے برتن ہیں۔“

”اوہ ہاں۔ بھابی کو دینا بھول گیا تھا۔ براہ کرم آپ لیتے جائیے گا۔“ میں نے کہا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا کوئی چیز آئی تھی کیا؟“

”جی ہاں۔“ میرے ذہن میں بھی کوئی کسی قسم کی بات نہیں تھی۔ اس لیے صاف دلی سے میں ان کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔

”کیا آیا تھا؟“ انہوں نے پھر پوچھا۔

”غالباً بھابی نے کوئی سالن بھیجا تھا۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ اچھا۔“ فرید صاحب نے جواب دیا۔ لیکن



اب ان کے جان دار ہونٹوں پر بے جان سی مسکراہٹ تھی۔ جسے میں نے بخوبی محسوس کیا تھا۔

بہر صورت میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن دو تین دن تک کوئی چیز نہیں آئی اور یہ خلاف معمول تھا۔

اور پھر چھٹی کا دن آیا تو فرید صاحب صبح سے غائب رہے۔ وہ میرے پاس نہیں آئے تھے۔ حالانکہ کئی بار میں نے ان کی آواز بھی سنی تھی۔

پھر جب میں انتظار کرتے کرتے تھک گیا تو میں نے خود ہی انہیں آواز دے لی۔

”فرید الدین صاحب!“ اور وہ باہر نکل آئے، مصنوعی انداز میں مسکراتے ہوئے شیری ان کی گود میں نہیں تھا۔

اور وہ میرے کمرے میں آگئے۔ اور میں نے متحیرانہ انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے فرید صاحب؟ آج کچھ زیادہ مصروفیت تھی کیا؟“

”ہاں کچھ ایسے ہی معاملات ہیں۔ بہر حال کوئی خاص بات نہیں ہے آپ کہیں گئے نہیں۔“

”بس سوچ ہی رہا تھا۔ اجانے کے لیے آپ جب نہیں آئے تو مجھے تعجب ہوا آپ کی طبیعت وغیرہ ٹھیک ہے۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ فرید صاحب سنجیدہ لہجہ میں بولے۔

میں نے اس وقت بھی ان کے بدلے ہوئے انداز پر غور نہیں کیا تھا۔ لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے ہلکا سا احساس ہوا کہ شاید فرید صاحب کسی بات پر پریشان ہیں۔

بہر صورت پڑوسی تھے اور پڑوسیوں کے معاملات میں اتنا گھسنا بھی مناسب نہیں ہے چنانچہ میں نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی اور وقت گزر گیا۔

دوسرے دن میں حسب معمول بینک چلا گیا۔ شام کو واپس آیا تو شیری بھی میرے دروازے تک نہیں آیا۔

بہت دیر ہوگئی تو میں نے خود ہی دروازے پر دستک دی اور چند ساعت کے بعد اندر سے آواز سنائی دی۔

”فرمائیے؟“

”بھابی میں ناصر جمال ہوں۔“

”جی کیا بات ہے؟“

”شیری کہاں ہے؟“

”گھر میں ہے۔“ جواب ملا۔

”میرے پاس نہیں آیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ناصر جمال صاحب ایک شرمناک بات عرض کرنا چاہتی ہوں۔“ اندر سے آواز آئی اور میں چونک پڑا۔

”جی۔“ میں حیران سا تھا۔

”ہاں ناصر صاحب! فرید صاحب کو شیری کا آپ کے پاس جانا پسند نہیں ہے اور وہ اس بات کو بہتر نہیں سمجھتے۔“

”ارے لیکن کیوں بھابی؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”بس کیا بتاؤں ناصر جمال صاحب! بہر حال وہ دکان دار قسم کے آدمی ہیں۔ چھوٹا سا ذہن چھوٹی سی سوچ رکھتے ہیں۔ آپ براہ کرم محسوس نہ کریں۔ ہمیں ہر قسم کے لوگوں سے رابطہ رکھنا ہوتا ہے۔ فرید صاحب اسی ذہنیت کے

انسان ہیں جو ہمارے درمیان پسندیدہ نہیں ہوتی۔“

”اوہ۔“ میں نے سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹ سکڑے۔ خاتون نے دوبارہ کہا۔

”ناصر صاحب حالانکہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس میں نے کہا نا کہ زندگی کا انحصار سوچ پر ہے۔ ان کی سوچ کی

بجائے کہ وہ مرد اور عورت کے رشتوں میں سے صرف ایک رشتے پر یقین رکھتے ہیں جو صرف آدم اور حوا کا رشتہ ہے اس روز انہوں نے آپ کے ہاں برتن دیکھ لیے تھے۔“

اس سے انہوں نے کچھ محسوس کیا۔ اسی دن سے وہ ناراض ناراض سے ہیں چند سست اور سخت باتیں بھی کہہ چکے ہیں۔ اس لیے میں آپ سے از حد شرمندہ ہوں اور کچھ

وجہ ہے کہ میں آپ کے خلوص کا کوئی جواب نہ دے سکی۔“

”ارے تعجب ہے۔ فرید صاحب تو ایسے انسان نہیں تھے اور بھابی آپ بھی مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔“

”جی ہاں۔ میں جانتی ہوں۔ لیکن افسوس! وہ تعلیم کے

مرد سے نا آشنا ہیں وہ خلوص کی باتوں کو نہیں سمجھتے۔ ان کو ایک زبان کا عمل بے عمل ہے آپ مجھے معاف

فرمائیے میں اپنے شوہر کے بارے میں آپ کو سب کچھ بتا رہی ہوں۔ لیکن اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے۔ میں

اس تصور سے آپ کو بتا رہی ہوں کہ آپ ایک تعلیم یافتہ انسان ہونے کی حیثیت سے میری مجبوریوں کو سمجھتے

ہو گئے۔“ میں نے آہستہ سے کہا اور واپس لوٹ آیا۔

فرید الدین صاحب اس کے بعد چھٹی کے دن بھی نہیں آئے تھے اور اس کے بعد میں نے بھی انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ البتہ میں نے ایک بات اپنے اندر ضرور محسوس کی

تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ اس خاتون کو میری وجہ سے بہت پریشانی ہو رہی ہے جب تک میں وہاں رہوں گا۔ فرید

صاحب مجھ پر شبہ کرتے رہیں گے۔ چنانچہ بہتر یہی ہوگا کہ میں دوبارہ مکان تلاش کر کے ان خاتون کو اس زحمت

و لہجہ سے دلائی جائے اس سلیبی ہوئی عورت کے لیے بہت تنہا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ بہتر یہی

کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔

اس صاحب سے اس سلسلے میں کچھ نہ کہا اور اپنے طور پر ایک مناسب مکان تلاش کرنے لگا۔ لیکن مکان کی تلاش

بے حد مشکل تھی۔

البتہ اب میرے پاس کچھ پیسے جمع ہو گئے تھے۔ جن سے میں مکان کا ایڈوائس دے سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ

میں علاقے میں رہوں جہاں بھی جاؤں لیکن جلد از اس علاقے کو چھوڑ دوں۔ چنانچہ کافی عرصے بعد ایک

مکان ملا جس سے میں نے رابطہ قائم کیا ہوا تھا پاپوش نامی ایک علاقے میں قبرستان کے پیچھے مجھے ایک مکان

ملا اس نے کہا ایک مکان خالی ہے چھوٹا سا ہے۔ لیکن

بہت زیادہ ہے۔

دفتر تک کا کرایہ ہفتے میں ایک یا زیادہ سے زیادہ دو بار

سنیما، کچھ سگریٹیں، کچھ پان اور کچھ کھانے کا پکڑا اور

بس۔

تختہ مناسب تھی۔ جس میں ہا آسانی ایک چھانچھان کی

گزر رہی ہو سکتی تھی۔ ہاں میں اپنی تنہائی کو دور کرنے کے

لیے ان پیسوں میں کم از کم اس سہارے کے بارے میں

نہیں سوچتا تھا جو دائمی ہوتا ہے بہر صورت اسٹیٹ ایجنٹ کے ساتھ مکان دیکھنے گیا۔

دو کمروں اور ایک صحن کا صاف ستھرا مکان تھا مجھے پسند

آیا اور میں نے فوراً اس کا ایڈوائس ادا کر دیا جو تقریباً چھ ماہ

کا تھا۔

میں نہایت خاموشی سے اس مکان میں منتقل ہو گیا۔

مکان میں منتقل ہونے کے بعد میں نے نیاز احمد کو اس

بارے میں بتایا تھا اور نیاز صاحب بے چارے حیران رہ گئے۔

”ارے اچھا۔ لیکن..... لیکن یہ کمرہ تم نے کیوں

چھوڑا۔ میرا خیال تھا تمہیں وہاں زیادہ آسائیاں تھیں۔

دفتر بھی قریب تھا اور بینک بھی..... موجودہ علاقے میں

آنے جانے کے لیے تمہیں خاصی وقتیں ہوا کریں گی۔“

”نہیں نیاز صاحب ایسی کوئی بات نہیں ہے بس کچھ

صورت حال ایسی ہی تھی۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔“

”اچھا بہر صورت اگر تم وہاں خوش ہو تو کوئی حرج نہیں

ہے۔ بس ذرا صبح کو جلدی اٹھنا پڑا کرے گا تاکہ بینک

وقت پر پہنچ سکو۔“

”جی ہاں میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ میں پہنچ

ہی جایا کروں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

جس علاقے میں یہ مکان واقع تھا۔ وہ زیادہ صاف

ستھرا نہیں تھا۔ ہاں کچھ قاصدے پر اچھے مکانات موجود تھے۔

کچھ تعمیر ہو رہے تھے۔

جس جگہ میں رہتا تھا وہ جگہ بہت گندی تھی۔ میرے

مکان کا دروازہ ایک پتلی سی گلی میں کھلتا تھا۔ سامنے ہی



لیکن اپنی محبت اور کسی معصوم بچے کی اسیت کی خاطر  
میں کسی گمراہ خاتون جو سلجھی ہوئی تھی کی زندگی برباد نہیں  
کر سکتا تھا۔ فرید الدین جیسے گندے لوگ گندگی کے

پینا اور اس قسم کے دوسرے مسائل جس میں تمہارے  
خامسے پیسے خرچ ہو جایا کرتے ہیں اور یہی پیسے اگر تم  
گھر میں خرچ کرو تو میں سمجھتی ہوں کہ تمہوڑی سی تکلیف

تویر صاحب بے چارے اس قدر عظیم انسان تھے کہ  
میں ان کی تعریفیں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ میری شام کی  
تنہائیاں انہوں نے دور کر دی تھیں اور بہ اصرار مجھے کہا گیا  
تھا کہ میں رات کا کھانا انہی کے ساتھ کھایا کروں۔

نہ ہی میرے لیے کیونکہ کنوئیں کی کافی مشکلات تھیں۔  
تنویر صاحب نے مجھے یہ بھی پیش کش کی تھی کہ اگر میں



چاہوں تو ان کے مکان کے چھوٹے کمرے میں رہائش اختیار کر لوں اس سلسلے میں ڈوہ پر غلطی تھی اور کافی حد تک مانوس بھی اور جناب تنویر صاحب کی نیت پر شک کرنا میرے لئے غلطی تھی براہ راست۔ پھر بھی کم از کم میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس خاندان پر اور زیادہ بوجھ بن جاؤں۔ کیونکہ یہ لوگ میرے یہاں رہنے کے بعد اور زیادہ بوجھ سے دب جائیں۔ جس کا بہر صورت مجھے اندازہ تھا۔ کیونکہ ناشتہ دوپہر کا کھانا میرے کپڑے رات کا کھانا اور اس قسم کی بے شمار دوسری چیزیں۔

ہر انسان اپنے مسائل رکھتا ہے ان سے بچتا بھی ہے۔ لیکن بعض لوگ صرف غلوں میں لٹتے ہیں۔ حالانکہ ضروریات ان کی بھی کافی ہوتی ہیں لیکن وہ اپنی ضروریات کو دوسروں کی خاطر پس پشت ڈالتے ہیں۔ اس طرح میں اگر ان کے گھر رہائش اختیار کر لیتا تو میری ضروریات کی تمام چیزیں ان کے سر پر آ پڑتیں۔ کیونکہ وہ لوگ تھے ہی اس قسم کے اس لیے میں نے اس مسئلے میں تھوڑی سی بد اخلاقی کا ثبوت دیا اور ان کی بات بے پناہ اصرار کے باوجود قبول نہیں کی تھی۔

شروع میں وہ لوگ میری اس بات پر ناراض بھی ہوئے تھے۔ لیکن بعد میں خاموش ہو گئے بہر صورت دنیا ساز تھے۔ اسی دنیا میں رہتے تھے اور دنیا کے بارے میں جانتے بھی تھے اور یہ بھی تھا کہ میں انجینی ہوں۔

حالانکہ خود ان کے جذبات میرے لئے ایسے نہ تھے کہ وہ مجھے انجینی سمجھتے ہوں لیکن بہر حال دنیا کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بہر صورت اس شکل میں اور میں زیادہ جب کہ بھابی کی جوان بہن بھی اس گھر میں موجود تھی۔ اکثر کبھی کبھی میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ بھابی کہیں اس لڑکی کی خاطر ہی تو مجھ پر اتنی عنایتیں نہیں کر رہیں۔ لیکن بعد میں۔۔۔ میں اپنے اس خیال پر خود ہی شرمندہ ہو جاتا تھا۔ یہ تجسس اس دن ختم ہوا۔ جس دن بھابی نے ایک نوجوان سے میرا تعارف کراتے ہوئے

کہا۔

”ناصر جمال۔“

”جی بھابی۔“ میں نے اوب سے کہا۔

”ان سے ملو یہ عظیم صاحب ہیں۔“

”اوہ بھابی! کوئی عزیز ہیں آپ۔“ میں نے عظیم سے ہاتھ ملاتے ہوئے بھابی سے پوچھا۔

”ہاں بھی عزیز ہیں۔ عزیز ہی ہیں اور اور بھی زیادہ عزیز ہونے والے ہیں۔“ بھابی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں سمجھا بھابی۔“

”اوہو بھی سلطانہ کے منگیتر ہیں۔ ان کی منگنی چار سال پہلے ہوئی تھی۔ باہر گئے ہوئے تھے اب واپس آئے ہیں اور ہمیں کاروبار کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”اوہو۔ اچھا۔۔۔۔۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر عظیم صاحب!“ میں نے بہت ہی گرم جوشی سے عظیم سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

اور اس رات جب میں گھر واپس آیا تو میرے ذہن میں بہت ساری شرمندگی اور پشیمانی تھی۔ ہم لوگ کتنے برے ہوتے ہیں کتنے اچھے لوگوں کے بارے میں ہماری رائے کتنی بری ہوتی ہے حالانکہ دنیا میں بسنے والا کوئی بھی انسان برا نہیں ہوتا۔ صرف ہم برے ہوتے ہیں جو دوسروں کے بارے میں اپنے دل میں برے جذبات رکھتے ہیں۔ ان کے معصوم جذبات سے بے خبر۔ میں نے ان نفس لوگوں کے بارے میں اس برے انداز سے سوچا ہی کیوں تھا کہ وہ سلطانہ کی شادی میرے ساتھ کرنا چاہتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ وہ خاموش خاموش سی جھکی جھکی نگاہوں والی لڑکی میرے دل میں ایک بہن کی سی محبت تھی۔ میں نے اس کے بارے میں ہمیشہ بھابی کی بہن سمجھ کر سوچا تھا۔ گویا بھابی کی بہن اپنی بہن کے مترادف۔ چنانچہ مجھے اس خیال سے کافی شرمندگی ہوئی۔

اور جب میں لیٹا تو بہت دیر تک اس بات سے شرم سار ہوتا رہا کہ میں نے اتنے نیک لوگوں کے بارے میں ایسا

سوچا ہی کیوں۔

اور اب ایک نمایاں تغیر جو مجھ میں ہو ادھر یہ تھا کہ اب وہ لوگ میرے سامنے کچھ اور فرشتہ صفت بن کر آ گئے تھے اور زمین پر فرشتوں کے وجود سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا۔

اور معمول کے مطابق تنویر صاحب کے خاندان سے میرے تعلقات جاری رہے۔ تمام مشاغل حسب معمول تھے۔ پھر سردیاں آ گئیں۔

سردیوں میں رات کے گیارہ بجے یوں لگتا ہے۔ جیسے آدمی رات گزر چکی ہو اور ان دنوں سردی تو کچھ زیادہ ہی پڑ رہی تھی۔ میں ٹھیک گیارہ بجے اٹھ جاتا تھا حالانکہ تنویر صاحب کو سخت اعتراض تھا۔ اس بات پر کہ میں اس وقت گھر جاتا ہوں کہیں سردی وغیرہ نہ لگ جائے۔ باہر سواری کی دشواریاں بھی تھیں لیکن خود تنویر صاحب بھی بے چارے بینک کے منیجر ضرور تھے لیکن بہر حال ان کے مسائل مجھ سے کچھ زیادہ ہی تھے کیونکہ ان کے ساتھ کچھ دوسرے افراد بھی منسلک تھے ان کے پاس بھی اپنا کوئی کنونینس نہیں تھا جو مجھے وہ گھر تک چھوڑ جاتے۔

بہر صورت وہ لوگ بہت اچھے تھے۔ رات کے گیارہ بجے وہ لوگ مجھے دروازے پر خدا حافظ کہنے کے لیے آتے اور میں سڑک پر آ جاتا۔

ٹیکسی تلاش کرتا اور بیٹھ کر گھر کی طرف چل پڑتا۔ یہ میرا روز کا معمول بن چکا تھا۔

اس دن سردی شباب پر تھی۔ میں نے کوٹ کے کار کھڑے کیے اونٹی ٹوپی سر پر پہنی اور دونوں ہاتھ جیب میں ڈالے ٹیکسی کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ دور سے مجھے روشنیاں نظر آئیں اور میں آنکھیں پھاڑنے لگا کہ شاید ٹیکسی ہی ہو اور بہر حال مجھے میٹر بھی نظر آ ہی گیا اور میں نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔

ٹیکسی میرے نزدیک آ کر رک گئی۔

میں نے ڈرائیور کو اپنی مطلوبہ جگہ کا نام بتایا اور اس نے

گردن ہلا دی۔ میں پچھلا دروازہ کھول کر ٹیکسی میں دیکھ گیا اور ٹیکسی چل پڑی۔

راستے میں مکمل خاموشی رہی۔ ڈرائیور نے کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ سردی اتنی تھی کہ منہ کھولنے کو بھی دل نہ چاہ رہا تھا۔

بہر صورت چند جگہوں پر میں نے ڈرائیور کو گائیڈ کیا اور پھر قبرستان کے ٹوٹے دروازے کے سامنے میں نے ٹیکسی روکوا دی۔

ڈرائیور نے مجھے چونک کر دیکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی قدر ہوشیار ہو گیا ہے بہر صورت میٹر دیکھ کر میں نے مل ادا کیا اور قبرستان کے ٹوٹے دروازے کی جانب چل دیا جہاں سے گزر کر مجھے گھر تک پہنچنا ہوتا تھا۔

ٹیکسی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئی تھی۔ میں نے کوئی خاص بات محسوس نہیں کی۔ قبرستان کا جانا پچھانا راستہ حسب معمول تھا۔ میں اس راستے سے گزر کر اپنے گھر پہنچ گیا۔ آرام سے لباس وغیرہ تبدیل کیا اور سو گیا۔

دوسرے دن بھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی حسب معمول مصروفیات جاری رہیں شام کو تنویر صاحب کے گھر کا کھانا کھایا اور واپس چل دیا۔

قلبی اتفاق تھا کہ زیادہ دیر کھڑے نہیں گزری تھی کہ مجھے ٹیکسی آئی دکھائی دی اور میں نے اسے اشارہ کیا۔

ٹیکسی رکتے ہی میں اس میں بیٹھ گیا اور اپنے علاقے کا نام ڈرائیور کو بتایا تو ڈرائیور نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے اسے پہچان لیا وہی ٹیکسی تھی جو پچھلے روز مجھے ملی تھی۔ بہر صورت یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کیونکہ ایسے اتفاقات عام طور سے ہو جایا کرتے ہیں۔ یوں میں اجنبیوں سے زیادہ بے تکلفی کا عادی نہیں ہوں چنانچہ میں نے اس موضوع پر ٹیکسی ڈرائیور سے کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ چنانچہ میں نے ٹیکسی کو حسب معمول قبرستان کے گیٹ پر روکایا مل ادا کیا اور گھر کی طرف چل دیا۔

لیکن جناب بعض اوقات اتفاقات بھی خوب ہوتے



ہیں۔ تیسرا چوتھا پانچواں چھٹا ساتواں آٹھواں  
نواں۔ یہاں تک کہ بارہ دن گزر گئے اور وہ عکسی مجھے  
روزانہ ملتی رہی یہاں تک کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے  
کافی حد تک مانوس ہو چکے تھے لیکن نجانے کیوں ڈرائیور  
خاموش ہی رہتا تھا۔

میں نے کافی دفعہ اس سے بات کرنے کی کوشش کی  
لیکن وہ عام طور سے خاموش ہی رہتا تھا۔  
اس دن سردی کچھ کم تھی۔ میں نے ٹیکسی میں بیٹھنے کے  
بعد ڈرائیور کو دیکھا اور مجھے ایڈریس بتانے کی ضرورت  
پیش نہیں آئی۔ ڈرائیور نے مجھے دیکھا اور ٹیکسی خاموشی  
سے راستے پر ڈال دی۔

اس دن اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ ڈرائیور  
میری منزل سے واقف تھا چنانچہ میں بھی حسب معمول  
خاموش رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی قبرستان کے دروازے پر جا کر  
رک گئی اور ڈرائیور میری سمت دیکھنے لگا تب میں نیچے اترا  
اور جیب سے پیسے نکال کر ڈرائیور کو دیے لگا۔

پرس دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ آج اتفاق سے پیسے کچھ  
کم ہیں چنانچہ میں نے عجیب سے انداز میں جس میں  
شرمندگی پائی جاتی تھی۔ ڈرائیور سے کہا۔  
”معاف کرنا بھائی آج میرے پرس میں پیسے کچھ کم رہ  
گئے ہیں کیا تم تھوڑی سی تکلیف کر دے گے اور ڈرائیور  
چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

”آؤ میرے ساتھ ذرا تھوڑا سا فاصلہ طے کرو۔ میں  
تمہیں گھر چل کر پیسے دے دیتا ہوں۔ معاف کرنا  
بھائی۔“ میں نے آگے بڑھ کر اس کا دروازہ کھولا لیکن  
حیران کن سی بات تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے تیزی سے  
دروازہ بند کیا اور پھراتی رفتار سے ٹیکسی آگے بڑھائی کہ  
میں حیران رہ گیا۔

وہ بری طرح ٹیکسی اشارت کر کے بھاگا تھا۔ اتنی تیز  
رفتاری سے کہ اس نے سڑک بھی نہ دیکھا اور میں متحیر کھڑا رہ

گیا تھا۔

لیکن۔۔۔۔۔ پھر تو مجھے جو ہنسی آئی۔۔۔۔۔ تو بہ شدید ہنسی۔۔۔۔۔

بلاشبہ ڈرائیور کا اس طرح سے بھاگنا جائز بھی تھا رات  
کے اس مخصوص وقت میں ایک شخص روزانہ اسے سڑک  
کے کنارے کھڑا ملتا۔ پھر وہ ٹیکسی روکتا۔ اور ایک ہی  
ایڈریس بتاتا اور قبرستان کے کنارے اتر جاتا۔ خاموش  
اور پراسرار سا شخص جس کے بارے میں ڈرائیور کو کچھ نہیں  
معلوم تھا۔۔۔۔۔ اور وہ شخص اگر اسے قبرستان لے جانے کی  
کوشش کرے تو خود ڈرائیور کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے۔ یہی  
جواب بھی تھی اور کیا؟ یہ بات سامنے کی تھی یقیناً وہ مجھے کوئی بد  
روح سمجھتا ہوگا۔ میں نے سوچا اور مجھے عجیب سا احساس  
ہوا۔ میرے ذہن میں وہ واقعات آنے لگے جنہیں اخبار  
والے شہ سرخیوں سے شائع کرتے ہیں۔ ”رات کے  
ڈھانکی بجے وہ روزانہ آنے والوں کو ملتی ہے انہیں کسی ٹوٹے  
پھوٹے کھنڈر میں لے جاتی ہے اور اگلے دن وہ تمام لوگ  
جو اس کے ساتھ جاتے ہیں ہسپتال میں پائے جاتے ہیں  
اور اس کے بعد وہ کوئی بیان دیے بغیر دم توڑ دیتے ہیں۔  
واہ صاحب واہ۔“

بے چارہ غریب ٹیکسی ڈرائیور۔ بہر صورت ممکن ہوا تو  
کل میں اس کی غلط فہمی دور کر دوں گا میں نے سوچا۔ شاید  
اس کا بھی اسی وقت گزرنے کا راستہ ہے جب وہ اچانک  
مجھے مل جاتا ہے اور یقیناً کل بھی وہ مجھے ضرور ملے گا یا شاید  
نہ بھی ملے۔ قبرستان میں داخل ہو کر میں اس کے بارے  
میں سوچتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور مجھے اس کی کیفیت پر ہنسی  
آتی رہی۔

”میں تو اس قبرستان سے گزرنے کا عادی ہو چکا تھا  
لیکن کسی اجنبی شخص کے لیے یہ ذرا عجیب سی بات تھی۔  
اب اس بے چارے کو کیا معلوم کہ قبرستان کی دوسری  
طرف کی دیوار سے کہیں اور جانے کا راستہ بھی لکھا ہے۔  
چنانچہ اس کا خوف بجا تھا۔

میں ہنستا ہوا آگے بڑھتا رہا مجھے بے اختیار ڈرائیور کی

وہ اسی پر ہنسی آ رہی تھی لیکن ابھی میں زیادہ دور نہیں پہنچا  
تھا کہ اچانک قبرستان میں مجھے ایک ہلکی سی روشنی محسوس  
ہوئی اس سے قبل ایسا کبھی محسوس نہیں ہوا تھا لیکن یہ کوئی  
نہایت بات نہیں تھی قبرستان کے دوسری طرف بنے  
ہوئے مکانات کی کھڑکیاں اگر کبھی کھل جاتیں تو اس سے  
روشنی ہو سکتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات اچھی خاصی روشنی پھیل  
جاتی تھی۔

لیکن عموماً ان مکانوں میں رہنے والے قبرستان کی  
طرف کے دروازے نہیں کھولتے تھے شاید کسی وہم کی وجہ  
سے۔

چنانچہ میں نے توجہ نہیں دی لیکن دوسری بار پھر مجھے  
روشنی کے کچھ جھماکے سے محسوس ہوئی اور اس بار میری نظر  
اپنے ہاتھیں سمت کی جانب اٹھ گئی۔ یہ قبر ہی تھی اور ایک  
لٹے کے لیے میرا دل دھک سے ہو گیا۔

میں سن ہو گیا تھا۔

قبر سے چنگاریوں کی پھوارا اٹھ رہی تھی۔ میں نے متحیر  
لگا ہوں سے اس منظر کو دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے  
کوئی پرندہ ان چنگاریوں کے درمیان میں سے پرواز کرتا  
ہوا اوپر چلا گیا ہو یہ حیرت انگیز واقعہ عین میری نگاہوں  
کے سامنے تھا اور اس سے قبل میں نے ایسا کوئی واقعہ نہیں  
دیکھا تھا میں ششدر رہ گیا تھا۔

اگر میں پہلی بار اس قبرستان میں آیا ہوتا تو شاید خوف  
سے میری ہلکی بندھ گئی ہوتی لیکن میں چونکہ یہاں سے  
گزرنے کا عادی تھا یہ ہلڈنڈی میرے جیروں تلے  
نیکڑوں بار آچکی تھی اس لیے مجھے زیادہ خوف محسوس نہیں  
ہوا۔

میں اس سمت دیکھنے لگا جہاں سے چنگاریاں بلند ہوئیں  
تھیں۔ چنگاریاں وقفے وقفے سے اوپر اٹھ رہی تھیں۔  
دفعہ میں ایک بار پھر سن سارہ کیا۔

چنگاریوں کے پس منظر میں مجھے ایک سایہ سا محسوس  
ہوا۔ ایک انسانی سایہ۔ ادھر کیا آج میں کسی خاص واقعے

سے روشناس ہونے والا ہوں۔ میں نے سوچا۔

ان حالات کے بارے میں میں نے کبھی غور نہیں کیا  
تھا۔ قبرستان سے گزرتے ہوئے بھی میں ان قبروں سے  
بے نیاز ہی رہتا تھا۔ حالانکہ انسان کی حیثیت سے مجھ پر  
بھی یہ ساری چیزیں اثر انداز ہونی چاہیے تھیں لیکن وہی  
بات جو کہ ایک گورکن کی فطرت ہوتی ہے وہ قبرستان میں  
نہایت سکون سے رہتا ہے۔ زندگی کے تمام مشاغل میں  
معروف اور اس کے ذہن میں کبھی یہ بات نہیں آتی کہ وہ  
زندہ انسانوں سے دور مردہ انسانوں کے ساتھ زندگی بسر  
کر رہا ہے۔ اسی طرح میں بھی اس قبرستان سے گزرنے  
گزرتے مردوں کا اور مردوں کی قبروں کا اس طرح عادی  
ہو گیا تھا کہ کبھی میری توجہ اس طرف نہیں جاتی تھی لیکن  
آج۔۔۔۔۔

آج ان دو پراسرار واقعات نے پوری طرح مجھے اس  
طرف متوجہ کر دیا تھا۔ میں نے اپنی اندرونی کیفیت کو  
ٹھولا۔ کیا میں خوف زدہ ہوں۔

میں نے سوچا۔ احساس ہوا کہ میں اتنا خوف زدہ نہیں  
ہوں۔ جتنا کہ ایک عام انسان کو ہونا چاہیے تھا۔ پھر یہ  
سایہ۔۔۔۔۔

کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں  
خاموشی سے گزر کر اپنے گھر چلا جاتا اور آرام کی نیند سو  
جاتا لیکن نہ جانے کیوں میرے ذہن میں تجسس سا جاگ  
اٹھا۔ چند لمحات کے لیے میں نے یہی سوچا کہ زیادہ  
غور بننے کی کوشش مت کروں لیکن طبیعت نہ مانی۔ ممکن  
ہے اگر میں خاموشی سے یہاں سے گزر جاؤں تو میرا  
تجسس مجھے سونے بھی نہ دے۔

سایہ بہ دستور محسوس ہوا تھا خاموش خاموش سا کوئی  
آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ممکن ہے کوئی ایسا شخص ہو  
جو کسی کی قبر پر فاتحہ وغیرہ پڑھنے کے لیے آیا ہو۔ لیکن یہ  
چنگاریاں میرے لیے بہت تعجب خیز تھیں۔

چند لمحات تک میں اپنے حواس مجتمع کرتا رہا۔ پھر میں



نے فیصلہ کیا کہ اس سائے کی طرف دیکھوں یہ ہے کیا۔  
چنانچہ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ دل ہی دل میں  
ایک تھوراسا احساس بھی تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ معاملہ نہ ہو۔  
کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں لیکن بہر صورت اپنے  
تجسس کی توسکین کرنی ہی تھی۔ یوں بھی زندگی میں بے  
شمار ایسے واقعات آتے ہیں ایسی صورت میں کسی واقعے  
کے کسی فوری منظر سے ڈر جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ حالانکہ یہ  
بامقصد بھی ہوتے ہیں لیکن بس! بعض اوقات ان سے  
خاص مقاصد بھی نکل آتے ہیں۔

نہایت پرکشش اور خوب صورت لڑکی تھی۔ بالکل  
حسین کلیوں کی مانند لیکن اس کے چہرے پر ایسی  
تھی کہ دل لرز جاتا تھا۔ خوب صورت آنکھیں روڈ  
پیشانی کشادہ تھی۔ لیکن چہرے کی ویرانی.....  
ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی غم ناک واقعے سے دور  
ہوئی ہو..... جس انداز میں وہ بیٹھی تھی وہ بڑا پریک  
تھا۔ عجیب ٹوٹا ٹوٹا سا انداز جیسے کوئی انسان اپنا سب  
لٹانے کے بعد لٹے لٹے انداز میں بیٹھا ہو۔ اور کسی  
ہوئی چیز کو دیکھ رہا ہو۔

ہم سے میں آپ کے بارے میں جاننے کا خواہش  
ہوں ہاں بعض اوقات حالات اس قسم کے ہوتے ہیں  
جہاں کسی کو اپنا راز دار بنانا پسند نہیں کرتا۔ آپ کوئی  
ہوں اگر کسی سلسلے میں میری خدمات آپ کے کام  
میں مجھے خوشی ہوگی۔“

کے چہرے کی دشت اور ویرانی میرے لیے صدمے کا باعث ہے میری دلی خواہش ہے کہ میں آپ سے کچھ دیر باتیں کروں کیا آپ میرے ساتھ کچھ دور تک چلنا پسند کریں گی؟“

”نہیں..... نہیں ہرگز نہیں..... میں جا رہی ہوں۔“

اس نے جواب دیا۔



”اوہ..... تو پھر آپ نے وہ روشنی ضرور دیکھی ہوگی جو قبر سے بلند ہوئی تھی.....“ میں نے پوچھا۔  
اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی..... ”ہاں..... روشنی میں نے دیکھی تھی۔“  
”تو کیا آپ روشنی سے خوف زدہ نہیں ہوئیں.....“  
”نہیں.....“ اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔  
”تب میں یہی کہوں گا خاتون کہ آپ غیر معمولی طور پر مضبوط اعصاب کی مالک ہیں۔“ میں نے تعریفی انداز میں کہا۔  
”جی..... شاید.....“ اس نے جواب دیا..... اور پھر آگے بڑھنے لگی.....

”خاتون کیا آپ مجھ سے کچھ دیر گفتگو کرنا پسند کریں گی۔“  
”نہیں..... دیکھئے وقت بہت ہو رہا ہے براہ کرم مجھے اجازت دیں۔“ اس نے رکے بغیر کہا اور ایک طرف بڑھ گئی۔

میں پھر سا ایک طرف کھڑا رہ گیا۔ وہ سیدی قبرستان کے دروازے کی جانب جا رہی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے میرا دل چاہا کہ اس روح کا تعاقب کروں لیکن بہر صورت اب اتنا دلیر بھی نہیں تھا کہ ایک روح کا تعاقب کرتا چنانچہ میں تیزی سے آگے بڑھ گیا اور پھر اپنے گھر پہنچ گیا..... لیکن جناب اس رات کوشش کے باوجود مجھے نیند نہیں آ سکی تھی۔

بار بار میرا ذہن اس لڑکی طرف مائل ہو جاتا تھا۔ ایک عجیب سا احساس تھا۔ کیا اندوہ ناک چہرہ تھا۔ اس کا شدید غم سے بے جان ٹوٹا پھوٹا سا انداز میں لرز کر رہ گیا تھا۔ جس کھوئے کھوئے سے انداز میں وہ قبرستان میں ٹٹٹی ہوئی تھی۔ اس سے ایک عجیب سے دکھ کا احساس ہوتا تھا نہ جانے بے چاری کون تھی اور کس دکھ میں گرفتار تھی۔ دوسرے دن میں نے تنویر صاحب سے بھی اس واقعے کا تذکرہ کیا اور تنویر صاحب گردن ہلانے لگے۔

”بھئی قبرستان سے کیوں جاتے ہو ذرا لمبا فاصلہ کر لیا کرو۔“ انہوں نے کہا۔  
”نہیں ایسی بات نہیں ہے تنویر بھائی.....“  
”تو تم بہر حال میری بات مان ہی لو دوسرے سے جایا کرو۔ آخر لمبا فاصلہ طے کرنے میں کیا حرج بلا وجہ مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔“  
اس کے بعد تنویر بھائی خاموش ہو گئے بات ال ہو گئی۔ ہاں رات کو انہوں نے پھر اس بات کا تذکرہ اور گھروالے بھی کسی حد تک خوف زدہ ہو گئے۔ بھائی نے بھی مجھے حکم دیا کہ میں قبرستان کے اس حصے سے گزروں۔

میں نے صرف ان محبت بھرے لوگوں کو مطمئن کر کے لیے وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن بہر صورت میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جسے میں خوف کا دے سکوں۔ البتہ اس رات جب میں باہر نکلا تو مجھے ٹیکسی بھی نہیں ملی تھی۔ ڈرائیور نے شاید اپنا راستہ ہی لیا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر تک انتظار کرنا پڑا تقریباً آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد ایک آٹو رکشہ ملا اور میں اسے طرف لے آیا۔

بہر صورت تنویر صاحب سے تذکرہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھا۔ میں نے گزرتے ہوئے پھر قبرستان کے اس حصے کی طرف نگاہ ڈالی جہاں کل میں نے وہ منظر دیکھا لیکن آج وہاں کوئی سایہ نہیں تھا..... نہ ہی قبر چنگاریاں اٹھ رہی تھیں۔

میں گھر پہنچ گیا۔ گھر پہنچ کر کافی دیر تک مجھے وہ کچھ یاد آتا رہا۔ ایک عجیب سا احساس ذہن میں تھا۔ لڑکی کافی خوب صورت ہے میں سوچ رہا تھا کہ کاش وہ کوئی روح نہ ہوتی نہ جانے بے چاری کسی پریشانی میں مبتلا ہوگی۔

دوسرا تیسرا اور چوتھا دن بھی گزر گیا۔ اب وہ میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ میرا معمول روز کی طرح تھا۔

میں اسی جگہ پر آ کر رکنا اور وہاں سے گزرتا ہاں قبرستان سے گزرتے ہوئے میری نگاہ اس قبر کی طرف ضرور جاتی تھی۔

اس رات کافی دیر سے گھر پہنچا تھا۔ کافی دیر مجھے رکشہ یا ٹیکسی کا انتظار کرنا پڑا اس کے بعد میں جا کے مجھے ٹیکسی ڈرائیور سمیت ملی۔

میں اپنے مخصوص انداز میں اپنی جگہ پر اترا قبرستان میں داخل ہوا اور حسب معمول مجھے وہ قبر یاد آ گئی۔ تب اچانک میں اچھل پڑا آج پھر اس قبر سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور پھر کوئی پرعدہ چنگاریوں کے درمیان سے پرواز کرتا ہوا اڑ گیا۔

ممکن ہے یہ چمکا ڈھ ہو۔ لیکن بہر صورت اندھیرے کی وجہ سے مجھے نظر نہیں آ سکا تھا۔ لیکن میں نے اس سائے کو بہ خوبی دیکھ لیا تھا۔ کیونکہ چاند نکلا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ میں بے اختیار اس کی جانب بڑھ گیا۔

اور اس سے تھوڑے فاصلے پر پہنچ کر رک گیا وہی ویران سا چہرہ وہی لباس وہی بکھرے بال عجیب سا غم میں ڈوبا ہوا ویران سراپا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی جس سے میں مسحور سا ہو کر رک گیا۔

کافی دیر تک میں اسی طرح کھڑا رہا۔ شاید آج اس نے میرے قدموں کی چاپ بھی نہیں سنی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی اس قبر کی جانب بکتی رہی اور پھر جب اسے میری موجودگی کا احساس ہوا تو وہ وحشت زدہ ہو کر کھڑی ہو گئی اس نے خوف زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا اور نہ جانے کیوں مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر پیدا ہو گیا۔

اس نے شناسائی کے سے انداز میں گردن ہلائی اور پھر اٹھ کر آگے بڑھنے لگی۔

”سنو۔“ میں نے اسے روکا اور وہ رک گئی۔

”کیا بات ہے؟“

”دیکھو میں اس دن سے تمہاری تلاش میں تھا۔ میں

روزانہ اس طرف سے گزرتا ہوں میری نگاہیں یہاں سے گزرتے ہوئے ہمیشہ اس قبر کی جانب اٹھتی ہیں میں تمہیں یقین دلانا ہوں کہ میں کوئی برا انسان نہیں ہوں اور نہ ہی میں تمہیں کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور تم بھی یہ سوچو اگر تم کوئی بھوت وغیرہ ہو تو بھی میں تم سے خوف زدہ نہیں ہوں بلکہ اگر تم کوئی زندہ ہستی ہو تو میں تمہارے لیے غم زدہ ہوں۔ خاتون! ہم سب بڑی کمزور حیثیت رکھتے ہیں اور اتنے کمزور ہونے کے باوجود بے پناہ مسائل ہمارے لیے بوجھ بنادیے گئے ہیں حالانکہ ان مسائل کو بعض اوقات انسان اٹھانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔

درحقیقت ہر شخص ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہے لیکن بعض اوقات دل کا درد لے کر دینے سے ذہن کا بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ تمہاری اس طرح قبر کے نزدیک موجودگی تمہارا غم ناک چہرہ رات کا وقت یہ سب کچھ میرے لیے بہت حیرت انگیز اور پراسرار ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ تمہاری زندگی کے مسائل کو میں کم نہیں کر سکتا۔ لیکن خاتون ان مسائل کے بارے میں میں تم سے پوچھ کر میں تمہارے ساتھ اٹھتا ہوں اور یہی تو کر سکتا ہوں۔ کم از کم میرے تعاون سے تمہارے ذہن پر لپٹی ہوئی وہ دھند تو ختم ہو سکتی تھی جس کے زیر اثر تم رات کے بارہ بجے اس وحشت ناک ماحول میں موجود ہوتی ہو۔

یوں سمجھو کہ میں اس دن سے آج تک اس کے بارے میں سوچتا رہا ہوں اور خاصا الجھا رہا ہوں۔ بعض اوقات انسان ایسی الجھنیں پال لیتا ہے جو اس کے لیے کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتیں۔ لیکن بہر صورت اس کی زندگی میں ان کا خاصا گہرا رد عمل ہوتا ہے میں روز اس قبرستان سے گزرتا ہوں اور اس راستے کو ترک نہیں کر سکتا اگر ترک کرتا ہوں تو تم اور یہ قبریں یاد آتی ہیں اور اس کے بعد بے شمار الجھنیں میرے ذہن میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں بہت اچھا انسان ہوں اور تمہارا



بہترین دوست ہمدرد اور معاون ثابت ہوں گا۔ لیکن میری ایک درخواست ضرور ہے کہ تم کچھ بھی ہو مجھے اپنے بارے میں بتاؤ میں روز بروز کی الجھن اور تجسس سے نجات چاہتا ہوں۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن دوسرے کے مسائل سے اس قدر دلچسپی رکھنا بھی اچھی بات نہیں ہے۔“ اس نے کسی قدر خشک لہجے میں کہا۔

”آپ نے بالکل درست کہا۔ مجھے قاعدے سے خاموش ہو کر سنجیدہ ہو جانا چاہیے کیونکہ آپ نے مکمل طور پر مجھے اپنے مسائل سے نکال دیا ہے اور یہ درست بھی ہے اس طرح اگر انسان سب کو دوست بناتا پھرے سب پر بھروسہ کرے تو اسے بہت زیادہ آسانیاں نہیں ملتیں بلکہ بعض اوقات مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہر صورت میں نے آپ سے اپنی الجھن کا مکمل مانگا تھا۔ اگر آپ مجھے کسی قابل نہیں سمجھتے تو ظاہر ہے میں کسی بھی طور آپ کو پریشان نہیں کر سکتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”براہ کرم جناب آپ ناراض نہ ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ البتہ آپ خود سوچیں کہ میں آپ کو اپنے بارے میں بتا کر کیا کروں گی۔ یہ میری اپنی الجھن ہے جس کا سو فی صدی میری ذات سے تعلق ہے۔ میں اس میں کسی دوسرے کو کیسے ملوث کروں کروں بھی تو کس حیثیت سے؟

ہم لوگ تو ایک دوسرے کے نام سے بھی نا آشنا ہیں اتنے انجینی ہیں کہ ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ بلاوجہ آپ کو میری الجھن میں شامل ہو کر پریشانی و پشیمانی ہی ہوگی۔ کیونکہ میری الجھن کا حل کسی دوسرے کے پاس نہیں ہے میں جو کچھ ہوں اس قدر ہوں کہ اب کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔ براہ کرم مجھے جانے دیں یا تو آپ اس طرف کا راستہ ترک کر دیں یا اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔“

”میں شرمندہ ہوں کہ آپ کو اپنے مسائل سے آگاہ

نہیں کر سکتی۔“ اس نے کہا اور تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی قبرستان کے داخلی دروازے سے باہر نکل گئی۔

میں حسب معمول خاموش کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر میری جانب نہیں دیکھا تھا۔

نہ جانے وہ کہاں چلی جاتی تھی۔ بہر صورت اتنا اندازہ تو مجھے تھا کہ وہ جس طرف جاتی تھی۔ قبرستان کی اس سمت کسی سواری وغیرہ کا مل جانا ناممکن سی بات تھی۔ وہ کہیں باہر نہ جاتی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی قبر بھی کہیں قریب ہی موجود ہو اور وہ خاموشی سے اس میں روپوش ہو جاتی ہے۔

بہر حال میں دل میں ایک افسردگی اور تجسس لیے گھر واپس آ گیا اور اس کے بعد میں نے سوچا۔

ٹھیک ہی تو ہے خواہ مخواہ کسی کے مسئلے میں الجھ کر کیا کرنا بلاوجہ میں ایک ایسی پراسرار ہستی سے شناسائی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو کسی بھی طور ممکن نہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میرے لیے نقصان دہ ہی ثابت ہو خواہ مخواہ کسی روح کو زیادہ پریشان کرنا مناسب بھی نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں تک مسئلہ راستے کا تھا۔ مجھے اس گندی گلی سے گزرتے ہوئے سخت وحشت ہوتی تھی۔ چنانچہ راستہ ترک کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میں نے سوچ لیا کہ آئندہ اگر وہ مجھے نظر آئی تو میں اس سے کترا کر گزرنے کی کوشش کروں گا۔ خواہ مخواہ کسی پر بار بننے سے قاعدہ؟ کیوں الجھا جائے۔

البتہ گھر میں بیٹھ کر میں نے ایک بات اور سوچی تھی۔ وہ یہ کہ پچھلی بار جب وہ مجھے ملی تھی تو وہ دن بھی آج ہی کا تھا اور آج بھی وہی دن ہے ممکن ہے وہ ہفتے میں صرف ایک بار نظر آتی ہو۔ لیکن بہر صورت یہ اسرار ایسا تھا۔ مجھے جاننے کے لیے ذہن بے چین تھا۔ اب نہیں جان سکتا تھا۔ تو یہ بات دوسری تھی۔ یوں بھی بہت سارے مسائل ہماری زندگی میں ایسے آتے ہیں جن کی توجہ ہمیں نہیں مل سکتی۔ ہم ان کے لیے پریشان ضرور رہتے ہیں۔ لیکن ہم

انہیں حل نہیں کر سکتے اور بعد میں آہستہ آہستہ بھول جاتے ہیں۔

چنانچہ میں بھی بھولنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے سوچا کہ اس مسئلے کو ہی اپنے ذہن سے نکال دوں گا کوئی معاملہ مجھے اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

یوں مزید دن گزرتے رہے۔ غالباً اس واقعے کے پانچویں دن کی بات ہے کہ تنویر صاحب سے میری ملاقات ہوئی اور تنویر صاحب نے مجھے ایک بہت ہی افسوس ناک خبر سنائی۔

”بھئی نامر جہاں ایک بات سنو۔“  
”ہاں تنویر بھائی کہیے۔“ میں نے ادب سے کہا۔  
”نہایت ہی غم ناک خبر ہے۔“ تنویر صاحب نے کہا اور میں چونک پڑا تنویر صاحب جس طرح پڑ مردہ نظر آرہے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے شدید افسوس ہوا اور میں بولا۔

”کیا بات ہے تنویر صاحب۔“  
”میرا تباہ دل شام گھر کو دیا گیا ہے۔“  
”شام گھر؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔  
”ہاں اچانک ہی مجھے اطلاع ملی ہے۔“  
”لیکن اچانک کیوں؟“

”بس میں نہیں جانتا نامر میاں اس اطلاع کے دو تین دن کے اندر اندر جا کر چارج سنبھالنا ہے۔ یہ آرڈر بھی بینک کی طرف سے دیا گیا ہے۔“  
”لیکن بالکل غیر متوقع طور پر؟“

”ہاں بھئی کیا کیا جاسکتا ہے۔ سارے بندوبست بھی کر دیے گئے ہیں۔ یعنی شام گھر جانے اور وہاں میری رہائش کا انتظام بھی ہو گیا ہے۔ وہاں مکمل طور پر مجھے انچارج ہٹا کر بھیجا جا رہا ہے۔“

”وہ تنویر صاحب امیر کے لیے واقعی بہت دردناک خبر ہے۔ اس شہر میں آپ لوگ اتنے اچھے غم گسار ہیں کہ میری زندگی واقعی معمول پر آگئی ہے۔ اب میں پھر ہلک جاؤں گا۔“ میں نے پریشانی سے کہا۔

## کبھی نیشن (Combination) جلد کی ناک خواتین

یعنی ایسی خواتین جن کی جلد کہیں سے خشک اور کہیں سے چکنی ہوتی ہے انہیں اکثر سوچر انڈر کے استعمال میں یہ مشکل درپیش آتی ہے کہ جب یہ خواتین اپنی جلد پر سوچر انڈر کا استعمال کرتی ہیں تو کچھ دیر بعد ان کا چہرہ بہت زیادہ چمکنے لگتا ہے اور انہیں پسینہ بھی آنے لگتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ جلد کے خشک حصے تو سوچر انڈر کی اچھی طرح جذب کر لیتے ہیں لیکن جلد کے چمکنے والے حصے سوچر انڈر میں موجود روغن کو جذب کرنے سے قاصر رہتے ہیں جس کی وجہ سے جلد جگہ جگہ سے چمکنے لگتی ہے۔ ایسی جلد کی حامل خواتین کو چاہیے کہ ہر صبح آدھے چمچے شہد سے ہا قاعدگی سے 10 منٹ تک مساج کریں اور اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔ یا شہد کے علاوہ زیتون کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ زیتون کے تیل سے مساج کرنے کے بعد اس کو روئی سے صاف کر لیں۔ اس کے بعد سوچر انڈر کا استعمال یقیناً پریشان کن نہیں رہے گا اور آپ اپنی کبھی نیشن (Combination) جلد کی بہتر طریقے سے نگہداشت کر سکیں گی۔ Sebaceous غدود جلد کے پوٹنی حصوں پر محدود ہوتے ہیں اور یہاں سے حواتر کی رطوبتوں کا اخراج جاری رہتا ہے جبکہ T زون سے باہر کی جلد یعنی رخسار کپٹیاں اور جڑے کے اطراف کی جلد انتہائی خشکی کا شکار رہتی ہے کیونکہ یہاں پر کئی رطوبتوں کا اخراج T زون کی نسبت بالکل نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ ایسی خواتین کے چہرے کا T زون بہت زیادہ متحرک ہوتا ہے۔ T زون کو اس طرح سمجھیں کہ پوری پیشانی ناک کے ارد گرد کا قریبی حصہ ہونٹوں کا اوپری و مچلا حصہ اور تھوڑی متحرک T زون کے زمرے میں آتی ہے۔

”مجھے بھی افسوس ہے نامر لیکن تم ہی بتاؤ میں کیا کروں کوئی ترکیب بھی نہیں ہو سکتی اپنے طور پر کوشش کر رہا ہوں۔“  
”لیکن اس کی اطلاع آپ کو کب ملی۔“  
”کل شام کو لیکن میں نے اس لیے تذکرہ نہیں کیا تھا کہ



میں کوشش کر لیتا چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح سے تبادلہ رک جائے۔ لیکن آج چیز میں کے آفس میں مجھے طلب کر لیا گیا اور یہ آخری ہدایت جاری کر دی گئی کہ میں زیادہ سے زیادہ کل تک روانہ ہو جاؤں چونکہ تین دن کے اندر مجھے چارج لینا ہے۔“

میں سخت پریشان ہو گیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی بھرا پراگھرا جڑ گیا ہو۔ میرا تو اور کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ تنویر صاحب کا گھر تو میرا ایسا معمول بن گیا تھا کہ اب ان کے گھر کے بغیر زندگی گزارنا ہی مشکل معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ میں نے نہایت پریشان لہجے میں تنویر صاحب سے کہا۔

تنویر بھائی۔ میں خود بھی شام گھر آنے کی کوشش کروں گا۔ آپ لوگوں کے بغیر تو اب میرا دل بھی نہیں لگ سکتا۔ گو یہ ایک بڑا شہر ہے لیکن تنویر صاحب آپ کو معلوم ہے کہ میں اس وسیع و عریض شہر میں صرف آپ تک محدود ہوں۔

”ہاں نامصر مجھے یقین ہے لیکن میرے بھائی مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کروں۔ بچوں کو پالنے کے لیے سب کچھ ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں۔“

”ہاں۔“ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ اور اس شام گھر کا ماحول بھی بے حد غم ناک رہا تنویر صاحب نے یہ تفصیل گھر میں بھی بتا دی تھی۔ بھائی اور گھر میں موجود دوسرے افراد بھی بے حد پریشان ہو گئے تھے۔

بہر صورت تنویر صاحب نے کہا کہ سامان باندھا جائے اور تیاریاں کی جائیں۔ جانا تو ہے ہی جو کچھ ہوگا۔ اب تو بھگتنا ہی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے شام گھر جانے کے بعد دوبارہ یہاں آنے کی کوشش کی جائے اور کوئی کام بن جائے۔ لیکن فی الحال تو نوکری کو برقرار رکھنے کے لیے جانا ضروری ہے۔

”آپ چھٹی کی درخواست کیوں نہیں دے دیتے۔“

تنویر بھائی؟“ میں نے اچھے ہوئے انداز میں کہا۔ ”دیکھو بھی یہ افسروں کی خواہش مول لینے والی بات ہوگی۔ میری زندگی میں اس قسم کے واقعات بہت کم آئے۔ میں نے کہیں حکم عدولی کی ہو میرا ریکارڈ بالکل صاف ہے چنانچہ میں نہیں چاہتا کہ اب اتنی طویل سردی کے بعد کوئی ایسی راہ اختیار کر لوں جس سے میری نیک نامی پر کوئی حرف آئے چنانچہ مجھے جانا ہوگا۔“

”جی۔“ میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ بہر صورت میرا دل غم و اندوہ میں ڈوب رہا تھا۔ اس رات تنویر صاحب نے مجھے گھر نہ جانے دیا۔ دوسرے دن میں ایک بینک سے بھی چھٹی کی اور تنویر صاحب کی روانگی کی تیاریاں کرنا رہا۔

بھائی کئی بار روپوشی تھیں۔ بچے بھی مجھ سے بہت مانوس تھے اور سلطان بھی۔

سلطان کو میری کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ میں ان لوگوں کو کس طرح چاہتا ہوں چنانچہ اس کے انداز میں بھی ایک بہن کی سی کیفیت شامل ہو گئی تھی اور وہ بھی مجھے ایک بھائی ہی کی طرح چاہتی تھی۔

میں ٹوٹ گیا تھا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں ان لوگوں کے جانے کے بعد تو زندگی بالکل ہی دیران ہو جاتی چنانچہ میں سخت پریشان تھا۔ لیکن بہر حال یہ کڑوی گولی تو لگنا ہی تھی۔

میں ان لوگوں کو اسٹیشن پر چھوڑنے بھی گیا۔ بھائی نے رورو کر مجھے بہت سی ہدایتیں بھی کی تھیں اور یہ بھی کہا تھا کہ چند ماہ کی چھٹی لے کر شام گھر آ جاؤں اور ان کے پاس رہوں میں نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔

لیکن چھٹی کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہی تھا۔ بہر صورت ابھی چھٹی ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یہ لوگ چلے گئے اور میں دیران ہو گیا۔

کئی دن تک دل نہیں لگا تھا۔ سخت پریشان تھا کہ کیا کروں کس سے ملوں دفتر کے دوسرے لوگ تھے۔ لیکن

میر صاحب کا بدل کوئی نہیں تھا اور نہ ہی کسی سے میرے اپنے تعلقات تھے۔ بس گھڑی دو گھڑی دل بہلا لیتا تھا۔ سارے معاملات درہم برہم ہو کر رہ گئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں میں کبھی کہیں تو کبھی کہیں! کبھی پارک میں چلا گیا۔ کبھی سمندر کے کنارے چلا گیا۔ اس اسی قسم کی تفریحات میں وقت گزارتا رہا۔ سوچا کہ زندگی میں کوئی ایسی تبدیلی ضرور آنا چاہیے کہ کوئی راستہ نظر آئے لیکن اس سلسلے میں بھی میرا ذہن اکارہ تھا۔

سخت پریشان ہو گیا تھا۔ یہ تنہائی۔۔۔ کہاں ڈیو دوں اس کو بس اکثر سوچتا تھا۔

تنویر صاحب کے کئی خط آچکے تھے۔ بھائی نے بھی مجھے کئی بار خط لکھے تھے وہ سب مجھے بے حد یاد کرتے تھے۔ سو میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں شام گھر چلا جاؤں۔ دفتر میں چھٹی کی درخواست دی۔ لیکن خلاف توقع نام منظور ہوئی۔ تب میں اور زیادہ پریشان ہو گیا۔

ایک دن سراج نے مجھ سے پوچھ لیا سراج میرا آفس کو لگ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں اتنا پریشان کیوں ہوں بڑا بے تکلف ساتھی تھا۔ چلا پرزہ نو جوان تھا۔ بہر صورت میں تو زندگی سے بے زار ہی تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کن حالات سے دوچار ہوں کیا کیفیت ہے میری اور وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

”ارے واہ۔ تنہائی دور کرنا کون سا مشکل کام ہے۔“

”ہاں۔۔۔ اور پھر تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

”بس یہی ایک سوال ہے جو دنیا کرتی ہے میرے مسائل سے کسی کو آگاہی نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں شادی کیوں نہیں کر سکتا۔“ میں نے کہا۔

”اوہ خیر شادی کے علاوہ بھی بہت سارے مسئلے ہیں۔ جن سے آدمی تنہائی محسوس نہ کرے۔“ سراج نے مسکرا کر ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

”مثلاً؟“

”چلو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”کہاں۔“

”بس جہاں میں کہوں۔ دل لگے تو ٹھیک ہے ورنہ آگے تمہاری مرضی جاؤ یا نہ جاؤ۔“

”ٹھیک ہے یار چلو۔“ میں نے پریشان ہو کر کہا۔ ”اور اس رات سراج مجھے اس جگہ لے گیا جس کے بارے میں میں نے بہت کچھ سنا تھا۔ جہاں دن سوتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں۔“

ایک عجیب و غریب ماحول تھا۔ ناپنے گانے والوں کا سا۔ قلموں میں جو کچھ دیکھا تھا یا کہا نیوں میں جو کچھ بڑھا تھا۔ اس سے خاصا مختلف بس ایک اجنبی سی دنیا تھی۔ جہاں چہروں کے مصنوعی پردے الفاظ کی شکل تو رکھتے تھے۔ لیکن ان پر سے جھانکنا بہت ہی مشکل تھا۔ میک اپ سے لٹھڑے ہوئے شگفتہ شگفتہ چہرے۔ چہروں کے بارے میں سنا بھی تھا کہ ان چہروں کے پیچھے بڑی ویرانی ہوتی ہے۔ لیکن آخر وہ ان ویران چہروں پر اس قدر شگفتگی کیسے سما لیتی ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

مجھے بہر صورت یہ ایک دلچسپ مشغلہ محسوس ہوا پھر تو میں اکثر سراج کی خوشامدیں کرنے لگا۔ سراج خود بھی عادی مجرموں میں سے تھا۔ تقریباً ہم لوگ روزانہ ہی جاتے تھے۔ حالانکہ اس کے گھر والے بھی تھے۔ بیوی بچے بھی تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا دل اپنے گھر میں نہیں لگتا تھا۔ اور وہ روزانہ رات کو کسی نہ کسی بالا خانے میں موجود ہوتا تھا۔ گانا سننا، کسی پر خراج کرنا اور واپس چلا آتا۔

حالانکہ اس کے مسائل اتنے نہیں تھے۔ لیکن مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ کچھ اور بھی اور پر کے کام کرتا تھا۔ جن سے اس کی آمدنی بہت بڑھ جاتی تھی۔ اس نے مجھے بھی اس کا مشورہ دیا۔ لیکن میری سمجھ میں اس کی بات نہ آ سکی۔ بہر حال میں اس کے اخراجات بھی اٹھانے لگا۔ جلد ہی وہ اور میں گھرے دوست بن گئے میری جتنی تنخواہ تھی اس



میں سے خرچ بھی سب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اب تک تنویر صاحب نے میرا بہت سا خرچ سنبھالا ہوا تھا اور یوں میں کافی رقم پس انداز کر چکا تھا اور اس پس انداز رقم کا اب ہم صحیح استعمال کر رہے تھے۔

سراج نے مجھے جگہ جگہ بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پلایا تھا۔ بہت سارے لوگوں سے میری شناسائی ہو گئی تھی۔ میری برادران لوگوں سے ہے جو رات کو جاگنے والے ہوتے ہیں۔

مشغلہ وہی تھا۔ بارہ بجے ہالا خانے پر اور اس کے بعد اپنے گھر۔ لیکن میں اتنا اسی جگہ تھا یعنی قبرستان کے ٹوٹے ہوئے دروازے پر جہاں سے ہو کر میں اپنے گھر جاتا تھا۔ اس کے بعد بھی کئی بار میرے ذہن میں اس طرح لڑکی کا خیال آیا۔ لیکن وہ مجھے نظر نہ آ سکی۔ نہ جانے اس نے اپنا مشغلہ ترک کر دیا تھا یا پھر وہ ایسے وقت آتی تھی جب میں وہاں نہ ہوتا تھا۔

خاص طور سے میں اسے اس دن وہاں ضرور تلاش کرتا تھا جس دن وہ پہلی اور دوسری بار مجھے نظر آئی تھی۔ لیکن میری کوششوں کے باوجود بھی ان دنوں قبریں رات بھر خالی رہی تھیں اور وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی۔

لیکن پھر ایک رات یوں ہوا کہ سراج کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور وہ میرے ساتھ ہالا خانے کی طرف نہ جاسکا۔ اسے سخت بخار تھا۔ تب اس نے معذرت کر لی اور کہا کہ اگر میرا دل چاہے تو میں اکیلا چلا جاؤں۔

لیکن میں نے تنہا جانا پسند نہیں کیا۔ ابھی کچھ جھجک باقی تھی۔ سراج کی موجودگی اس جھجک کو کم کر دیتی تھی۔ سو میں نے ہالا خانے کا خیال ترک کر دیا اور میں نے گھر واپس چلنے کی سوچی۔

چنانچہ میں گھر کی طرف چل پڑا لیکن اس طرف کا راستہ شاؤد نادر ہی کوئی استعمال کرتا تھا۔ چنانچہ قبرستان کے راستے داخل ہو گیا۔

اور پھر اتفاقیہ طور پر میری نگاہ اس طرف اٹھ گئی جس طرف وہ قبر تھی۔ میں نے دیکھا وہ وہاں موجود تھی۔

قبر میں چنگاریاں نہیں تھیں۔ لیکن وہ اسی طرح خاموش اور دیران سا چہرہ لیے بیٹھی تھی۔ نہ جانے کیوں میرے ذہن میں ایک الجھل سی پیدا ہو گئی۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس سے آج دو دو ہاتھ کر لی لوں۔

چنانچہ میں اس کی جانب چل پڑا آج میں جان لینا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے۔ قبرستان کیوں آتی ہے؟ اور خاص طور سے اتنی رات گئے۔ جب کہ کوئی لڑکی جو کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہو اتنی رات گئے نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس روز چاند بھی ابتدائی دنوں کا تھا اور روشنی پھیل چکی تھی۔ اس کا چہرہ جتنا صاف آج میں نے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ جو چمکاسی کھڑی ہو گئی اس کی نگاہیں میری جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

میں اس کے سامنے خاموش کھڑا ہو گیا اور وہ بھی میری جانب خاموشی سے دیکھتی رہی پھر میں نے عجیب سے انداز میں کہا۔

”کیا آج بھی تم مجھے مایوس کر دو گی؟“

”میں نہیں سمجھی۔“

”دیکھو میں روزانہ تمہیں تلاش کرنے یہاں آتا ہوں میرا خیال ہے کہ یا تو تم نے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا تھا یا پھر تم نے اپنا وقت بدل لیا ہے۔ آخر کیوں؟“

”دیکھئے ہم دونوں ایک دوسرے سے نفسی طور پر ناواقف ہیں اور ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں کیا یہ مناسب ہے کہ ہم اتنی بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے سے گفتگو کریں۔“

”ہاں یہ مناسب نہیں ہے لیکن سنو میں تمہارے بارے میں اکثر سوچتا رہتا ہوں۔ میں شدید الجھن کا شکار ہوں۔ میں تمہارے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ سنو اگر تم نے مجھے اپنے بارے میں نہیں بتایا تو میرا دماغ پھٹ

جائے گا۔ کیا تم میری الجھن کو ختم نہیں کر سکتیں؟“

”دیکھیں جناب میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ دوسروں کے مسائل میں زیادہ دلچسپی کا اظہار بہتر نہیں۔“

”میں جانتا ہوں اگرچہ یہ بات آپ پہلے بھی کہہ چکی ہیں۔ لیکن خاتون میں نے بتایا تا کہ میں آپ کی طرف سے شدید الجھن کا شکار ہوں ایک انسان ہونے کے ناطے سے آپ میری یہ الجھن دور کر سکتی ہیں۔ میں اکثر آپ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ سو میں ایک تنہا انسان ہوں بالکل تنہا دنیا سے بیزار اس پوری دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتا چاہتا ہوں۔ میں اتنی سخت الجھن کا شکار ہوں کہ تم سے بیان نہیں کر سکتا اور اگر تم نے اب بھی اسی طرح اجتناب برتا تو یقین کرو کہ اس پوری دنیا سے میرا اعتبار ختم ہو جائے گا تم جو کوئی بھی ہو اگر زندہ ہو تو اور اگر زندہ نہیں ہو تو کم از کم اپنے بارے میں بتا دو۔ تا کہ میرے دل کی یہ خلش مٹ جائے۔“

”عجیب انسان ہیں آپ۔ نہ جانے آپ میرے بارے میں جاننے کے اس قدر خواہش مند کیوں ہیں؟“

”بس خاتون کہنا تاں اس کا کوئی گہرا مقصد نہیں ہے۔“

”آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟“ اس نے اداس لہجے میں کہا۔

”بس میرے ذہن کا تجسس ختم ہو جائے گا۔ براہ کرم اس سلسلے میں آپ میری مدد کیجئے۔“ میں نے کہا۔

”انسان کتنا خود غرض ہے۔ اپنی الجھنوں سے چھٹکارا پانے کے لیے دوسرے لوگوں کی ذہنی الجھنوں کو وسیع کر دیتا ہے۔ اپنے ذاتی مفاد کے لیے۔ دوسرے کے کچلے جانے کی پروا نہیں کرتا۔“ اس کا لہجہ بے پناہ سپاٹ اور دیران تھا۔

میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ چھوڑ دوں مجھے کیا پڑی ہے۔ لیکن پھر میں نے ایک اور فیصلہ کر لیا۔

میں نے سوچا کہ ٹھیک ہے اس وقت وہ نہ صرف مجھے خود غرض ثابت کر رہی ہے بلکہ مجھے بہت کچھ کہہ رہی ہے۔ یہ سب باتیں مجھے سہ لگتی چاہئیں۔ صرف اور صرف اس کا ماضی جاننے کے لیے۔ اس کا قبرستان میں رات کو اس طرح تنہا آنا کس بات کی نشان دہی کرتا ہے اس کے لیے..... اور جناب میں ڈھیٹ بن گیا اور اس کی کہانی سننے پر اصرار کرنے لگا۔

وہ گردن جھکا کر کچھ سوچ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گردن اٹھائی اور بولی۔

”بیٹھ جائیے۔“

اور اس کا یہ انداز مجھے بے پناہ بھلا محسوس ہوا اور میں اس کے سامنے ہی ایک قبر کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی مجھ سے تھوڑی فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ تب وہ میری جانب دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

”آپ کا نام کیا ہے جناب۔“

”میرا نام ناصر جمال ہے۔“

”خوب۔ بہر حال میں آپ کو اپنی کہانی سن رہی ہوں۔“ اور میں ہمتن گوش ہو گیا۔

”میں ایک ستم رسیدہ لڑکی ہوں۔ نام بتانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ آپ میرا کوئی بھی نام تصور کر لیں۔

درمیانے درجے کے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اپنے والدین کی تنہائی تھی۔ میری ماں کا کہنا تھا کہ میرا باپ ایک محنت کش انسان تھا۔ اچھے عزائم بھی رکھتا تھا۔ اس کے دل میں اولاد کی آرزو بھی تھی۔ لیکن میری ماں کے ہاں میرے علاوہ کوئی اولاد پیدا نہ ہوئی۔ اسے بیٹی کی بڑی آرزو تھی۔ لیکن اس کی قسمت میں کوئی بیٹا نہ تھا۔ ان کی قسمت میں صرف میں تھی جو ان دنوں کے لیے معمولی حیثیت رکھتی تھی۔

رفتہ رفتہ میرا باپ حالات سے بد دل ہوتا چلا گیا نہ جانے اس کا پس منظر کیا تھا۔ اس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتی۔



لیکن مجھ سے اس کی جب بھی اس مسئلہ پر بات ہوئی اس نے یہی کہا کہ چونکہ اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے اس لیے اس کا بڑھا پاپے حد تک ہے۔ چنانچہ اس نے میری ماں کے ساتھ بہت برا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ اس کہ پس پردہ صرف بیٹے کی خواہش تھی۔ میری ماں میرے باپ کو کوئی بیٹا نہ دے سکی۔ اس لیے وہ بری طرح جھنجھلا گیا تھا۔ میرا باپ شراب پیتا تھا جو اکیلے تھا اور اکثر برے لوگ ہمارے گھر آتے رہتے تھے۔

حتیٰ کہ میرا باپ شراب اور جوے سے آگے بھی چل نکلا اس نے بہت برا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ میری ماں کو اپنی کمائی کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا تا کہ اس کے بڑھاپے کے لیے کچھ پس انداز ہو جائے نہ جانے کیوں اسے اپنے بڑھاپے کی اتنی فکر تھی۔

اس ماحول میں میں جوان ہو گئی اور میرے باپ کی لگاؤ میں میری ماں سے ہٹ کر میری جانب اٹھنے لگیں۔ میری ماں مجھے اپنے سایہ عاطفت میں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ مجھے بری لگا ہوں سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرا باپ غیرت اور حمیت کے لفظ سے نا آشنا ہو چکا ہے۔ گھر میں آنے والے مردوں سے اسے کوئی عار نہیں تھی۔ بلکہ وہ اسی کوشش میں رہتا تھا کہ ان میں سے کوئی میری ماں کو پسند کرے اور اس کی جیب گرم ہو جائے۔

میری ماں انتہائی بدبختی کی زندگی گزار رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ سخت بیمار ہو گئی۔ لیکن اس کی بیماری کا بھی میرے باپ کو کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ صرف دولت حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ میں بھی ان معاملات کو اچھی طرح سمجھنے لگی تھی۔

ہمارے گھر بڑے سے بڑے لوگ آتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں کیا کیا تھا۔ تاہم صاحب اس کی تفصیل بتانا بے کار ہے لیکن اب ان سب کی نگاہیں میری ماں کی طرف سے ہٹ کر مجھ پر پڑنے لگیں تھیں۔

گو ابھی میری عمر زیادہ نہیں تھی لیکن میرے باپ کو سو طرح کے مشورے دیے جانے لگے۔ یہاں تک کہ ایک شخص نے اس سے کہا کہ اگر مجھے اسٹینج لائن کی طرف ڈال دیا جائے تو ممکن ہے میں قلم انڈسٹری کی طرف نکل جاؤں اور قلم انڈسٹری میں کام کرنے کے بعد سارے دلدور دور ہو سکتے ہیں۔

میرے باپ کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور اس نے اس شخص سے درخواست کی کہ مجھے اس سلسلے میں مزید تفصیلات بتائی جائیں۔

چنانچہ پہلی بار مجھے ایک اسٹینج ڈرامے میں حصہ لینا پڑا ابتدا میں یہ سب کچھ مجھے بھی برا نہیں لگا تھا۔ لیکن جب میرا باپ دھڑا دھڑا اسٹینج ڈرامے کنٹریکٹ کرنے لگا اور مجھے اسٹینج پر آ کر مختلف لوگوں کے ساتھ بار بار عشق و محبت کا تاہم کھیلا پڑا تو اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہ سب لوگ جو مجھے اتنے پر جوش انداز میں دیکھتے ہیں۔ باہر نکل کر میرے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔ تب ہی مجھے احساس ہوا کہ میں جن راستوں پر چل رہی ہوں۔ وہ اچھے راستے نہیں ہیں۔

چنانچہ میں نے اپنی ماں سے اس بات کی شکایت کی کہ طرح طرح کے لوگ میرے قریب آتے ہیں اور مجھ سے اس قسم کے مذاق کرتے ہیں کہ میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ میرا دل یہ کام کرنے کو نہیں چاہتا۔ تب میری ماں تڑپ گئی۔

اس نے میرے باپ سے کہا کہ وہ مجھے اس لائن میں کام کرنے نہیں دے گی۔ لیکن اس کے نتیجے میں میرے باپ نے میری ماں کو اس قدر مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئی وہ بالکل درندہ صفت ہو گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس قسم کی بات بھی نہ آ سکتی تھی کہ ایسے باپ بھی ہوتے ہیں۔ میرا باپ مجھے وحشی درندہ محسوس ہونے لگا۔ جس کی خونخوار نگاہیں ہر لمحہ میرا تعاقب کرتی تھیں۔

اگر اس کے کسی بھی حکم سے ذرا بھی سرتابی کی جاتی تو وہ

مجھے قیامت برپا کر دیتا تھا۔ ماں تو اب اس قابل ہی تھی۔ اس نے بہر حال میرے بارے میں بہتر انداز رکھا۔ لیکن وہ بد نصیب میرے لیے کچھ نہ کر سکی۔ کچھ اس کے بس میں نہیں تھا۔ اب تو وہ بول بھی مشکل کہتی تھی۔ ہر وقت خون تھوکتی رہتی تھی۔

میرے اپنے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد صرف اس کی تیار داری کرتی تھی۔ ماں اکثر مجھ سے کہتی تھی کہ مجھ سے از حد شرمندہ ہے کہ مجھے پیدا کرنے کے وہ مہری کی طرح تربیت نہیں کر سکی۔ میں اپنی ماں کو برا کرتی تھی۔ لیکن میرا دل خود بھی روتا رہتا تھا۔

میرا اپنی طرح کی لڑکیوں کو دیکھا کرتی جو اسکول جایا لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ بیش و آرام سے زندگی بسر کیا لڑکیاں اور اس کے بعد جب ان کے ماں باپ انہیں دوسرے دیس بھیج دیتے تھے تو خوشی خوشی گھریلو ملازمتی تھیں۔

میرے دل میں بھی یہی خواہش تھی کہ میں بھی ایسی ہی لڑکی اور شریف عورت کی سی زندگی بسر کروں اور میری اصل شہید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔ لیکن میرے دل خواہش بھی شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

ہانے کیسا باپ تھا۔ میں نے تو وہ باپ بھی دیکھے تھے۔ بیٹیوں کی جوانی کے سامنے سینہ پر ہوتے اور ایک میرا باپ تھا۔ جس نے خود میرے سر سے اتار دی تھی۔ جس نے اسٹینج پر دنیا کے سامنے بنگے لے کر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے مجھے بازار میں میری اتاری تھی اور اب وہ چاہتا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ اٹاؤں تاکہ ایک عمدہ سا گھر لیا جاسکے۔ اس کے بعد اور اس کے بعد نہ جانے کیا کیا۔؟

اس طرح کمانے کے لیے بہت سارے لوگ مجھے اپنے کے لیے تیار تھے اور انہوں نے میرے باپ کو

اس سلسلے میں پیش کش بھی کی تھیں۔ لیکن یہ سہارا جس قسم کا تھا۔ میں کم از کم اسے منظور نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ میرا باپ مجھ پر سختیاں کرتا رہا اور میں اپنی ضد پر اڑی رہی۔ یہاں تک کہ مجھے نوید مل گیا۔

نوید اسٹینج پر اداکاری کا شوقین تھا۔ کئی ڈراموں میں وہ میرے ساتھ ہیرو کا کردار ادا کر چکا تھا۔ سیدھا سادہ سا لڑکا تھا۔ اس کی فطرت میں بے باکی اور بے حیائی نہیں تھی۔ بہر صورت میں ذہنی طور پر اس سے متاثر ہوئی تھی۔ نوید بھی مجھ سے متاثر تھا اور پھر میرے اور اس کے تعلقات بڑھتے چلے گئے۔ نوید اکثر میری مدد کرتا تھا۔ وہ میرے باپ کی خواہشات بھی پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ حالانکہ اس بے چارے کے پہلے مسائل بھی مشکل سے حل ہوتے تھے۔ پھر بھی جو کچھ اس سے بن پڑتا ہمارے لیے کرتا۔

میرے لیے وہ بے حد فکر مند رہا کرتا تھا۔ مجھے کس طرح اس مصیبت سے نکالے ہم دونوں اکثر مستقبل کے پروگرام بنایا کرتے تھے۔ نوید میرے لیے بہت افسردہ رہا کرتا تھا۔ میرے سارے کوائف اسے معلوم ہو چکے تھے اور اس کی دلی خواہش تھی کہ مجھے اس گندے راستے سے دور لے جائے۔

ہم لوگ محبت کے راستوں پر آگے بڑھتے رہے۔ لیکن کوئی ایسا وسیلہ ہمارے ہاتھ نہ آ سکا کہ ہم یکجا ہو جائیں۔ نہ جانے کس طرح میرے باپ کو اس بات کا علم ہو گیا اور اس نے میرے اوپر سختیاں شروع کر دیں۔

آہ۔ باپ تھا کہ بس۔۔۔ باپ کے ساتھ جو تصور ذہن میں ابھرتا ہے تم یقین کر دو وہ اس کا مذاق تھا۔

اس نے زندگی کے کسی مرحلے پر میرا ساتھ نہیں دیا۔ بلکہ اس نے مجھے اپنی نکال سال بھر رکھا تھا۔ وہ ہر طرح سے مجھے ذلیل کرنے پر تیار رہتا تھا۔ نوید سے ملنے سے اس نے انتہائی سختی سے منع کر دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر تم اس سے ملیں تو میں تمہیں کوئی مار دوں گا۔ یوں بھی وہ زندگی



سے ہزار تھا۔ میں خود بھی اپنی زندگی سے دلچسپی نہیں رہتی تھی اب میں نوید کے لیے فکر مند ہو گئی تھی۔

میرا باپ یہ تو نہیں کر سکتا تھا کہ مجھے گھر بٹھالے اور نوید سے بچاتا لیکن اب ہر جگہ اس نے میری نگرانی شروع کر دی تھی۔

انتہائی مشکل سے زندگی بسر ہو رہی تھی۔ نوید کے لیے بے پناہ مشکلات پیدا کی جا رہی تھیں۔ البتہ میرے باپ کو نوید کی ذات سے جو لگاؤ تھا وہ صرف یہ کہ نوید وقتاً فوقتاً اسے اچھی خاصی رقم فراہم کرتا رہتا تھا۔ نہ جانے وہ بے چارہ اس رقم کے لیے کیا کیا تک و دو کرتا تھا۔

پھر ایک دفعہ میری نوید سے ملاقات ہوئی اور نوید پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا میں کیا کروں مجھے بتاؤ تم یہاں سے میرے ساتھ نکل چلو ہس میں تم سے شادی کر لوں گا۔ اس نے کہا۔

گو کہ میں یہ کر سکتی تھی بلاشبہ میرا باپ میرے لیے مصیبت بنا ہوا تھا۔

لیکن اس کے باوجود میں اپنی بیمار ماں کو کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ اس بے چاری کا کیا تصور تھا۔ میرا باپ اسے صرف میری وجہ سے زندگی سے دور کر دیتا تھا۔ اس لیے نوید کی بات پر میں آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکی اور میں نے کہا۔

”مجھے بتاؤ نوید میں اپنی بیمار ماں کو کس طرح چھوڑ دوں؟“

”تم ماں کو نہیں چھوڑ سکتیں اور تمہارا باپ تمہیں نہیں چھوڑ سکتا مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟“

”تمہیں میری مجبوریوں کا خیال رکھنا چاہیے نوید۔“

”میں رکھنا چاہتا ہوں لیکن کس طرح مجھے بتاؤ۔ تمہارے باپ کو قومات فراہم کر کے میں یہ سب کچھ بھی کر سکتا ہوں لیکن میں تمہیں اس کے چنگل سے بچانا چاہتا ہوں کیا تم پوری زندگی اپنے باپ کے ساتھ گزار سکتی ہو کیا تمہارا باپ قابل اعتبار ہے کہ میں تمہیں اس کے گھر میں

چھوڑ دوں وہ کسی بھی وقت غلیظ سے غلیظ راستے آ سکتا ہے اور اس وقت میری حیثیت میری خیرگی۔“

نوید نے پریشان لہجے میں کہا۔ درحقیقت میرا ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں شدید شکار ہو گئی۔

باپ کے مظالم اور ماں کی بیماری میری زندگی ہو کر رہ گئی تھی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ترین اذیتوں کا شکار تھی۔

انہی پریشانیوں میں وقت گزرتا رہا۔ حتیٰ کہ نوید بدول ہو گیا۔ میں اسٹیج ڈراموں میں کام کرتی تو لوگ میرے ساتھ کام کرتے اس وقت نوید ڈانسی شکار ہوتا تھا۔ اس نے کئی کئی بار مجھے منع کیا کہ ڈراموں میں کام کرنا چھوڑ دوں جو کچھ مجھے دیا ہے وہ مجھے فراہم کرنے کی کوشش کرے گا۔

درست تھا۔ لیکن میں اپنے باپ کا کیا کرتی تھا سے فوری طور پر معاہدے کر کے قومات لے لیا یہاں تک نوید نے مجھے کہہ دیا کہ وہ یہ شہر چھوڑ دے میں نے نوید کو سمجھانے کی کوشش کی میں نے کہا کہ وہ میری مجبوریوں کو بھی تو سمجھے۔ مجھے بتاؤ اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں صرف اپنا وجہ سے مجبور تھی۔

لیکن نوید بہت سخت پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے آخر وہ بھی تو انسان ہے اس کے دل میں بھی تڑپ ہے۔ نہ جانے کب میرے والد مجھے چھوڑیں گے جانے ماں کی زندگی مجھے نوید کی زندگی میں آئے گی یا نہیں۔ اس لیے وہ شہر چھوڑ رہا ہے۔ کیونکہ اپنے لیے سوچتی ہوں نوید کے لیے نہیں۔

نوید کو سمجھانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ خودکشی کر لے گا۔

مجھے کسی کوشش میں یہ بات نہیں تھی کہ نوید نے جو کہا اگر بھی لے گا۔

مگر تقریباً تین یا چار روز تک نوید مجھے نہ مل سکا میں لڑی ہو گئی تھی۔ باہر نکلنے کی ہر کوشش ناکام تھی میرے لیے اس کا موقع ہی نہ دیتے تھے کہ میں تنہا کہیں باہر جاؤں اور میں نوید کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے شکار ہو گئی۔

باپ کے ایک اسٹیج شو ہونے والا تھا اور اس کے لیے تھوڑی سی آزادی مل گئی۔ میں سب کچھ بھلا کر لاش میں نکل گئی۔

دلیرانہ فرسائیں جو مجھے ملی تھی وہ نوید کی خودکشی تھی۔ نوید نے خودکشی کر لی تھی وہ دیوانہ اس بات پر اس سے اڑ گیا کہ اس نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا میں نیم لڑی ہو گئی اور پھر نہ جانے کس طرح سے مجھے گھر پہنچا دیا۔

میں کچھ کرنے کے قابل نہ رہی تھی۔ نوید مر چکا تھا زندگی میں ایک چراغ روشن ہوا تھا اور وہ چراغ اب ہی ہاتھوں میں ہو گیا تھا۔

میں سخت پریشان ہو گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ نوید کی یاد ہر وقت میرے دل میں چکیاں مارتی تھی۔

اپنے باپ سے شدید نفرت ہو گئی اور اپنی ماں کی لاش سے بھی۔ میں اب کسی کا پیٹ نہیں بھرتی تھی۔ اب کسی کی حیا ر واری نہیں کرتی تھی۔ میرے والد نے کئی سلسلے میں مارا پیٹا۔ لیکن اب کسی بھی ڈرامے میں کام کرنے کو تیار نہیں تھی یہاں تک کہ چند لوگ جب میرے سلسلے میں ہمارے ہاں آئے تو میں نے ان پر مار مار کر دوا ایک کے منہ لوج ڈالے۔

میرے والد سخت پریشان تھے۔ ماں کی بیماری سخت تر ہو رہی تھی۔ ذریعہ آمدنی کچھ نہیں تھا اور اثبات فالتے رہتے تھے۔ ماں کی دوا کہاں سے آتی۔

میں ہر وقت نوید کو یاد کرتی تھی اور میرے باپ نے آخری بار میری ذات پر شدید ضرب لگائی۔

اس نے مجھے قتل کر دیا۔ ہاں اس نے مجھے قتل کر دیا۔ غیظ و غضب کی شدت سے دیوانہ ہو کر اس نے میرا وجود ہی ختم کر دیا۔ اور میں مر گئی۔ ہاں میں مر گئی۔ اس نے گردن جھکالی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

میں شدت غم سے گنگ ہو گیا تھا۔ اس کی کہانی اتنی دلہندہ تھی کہ میرے حواس جواب دے گئے۔ میں ساکت کھڑا رہا۔

آہ۔ میں اس مظلوم روح کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ جو پوری زندگی..... شدید پریشانیوں کا شکار رہی اور پھر اس نے بے بسی کے عالم میں ہی جان دے دی۔

میرے ذہن میں یہ تصور بھی نہیں رہا تھا کہ وہ ایک بے جان ہستی ہے۔ میں سخت پریشان تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس روح کو سکون کس طرح بخشوں۔ تب کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔

اور جب اس نے گردن اٹھائی تو میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا وہ تک تک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”تم بھی میرے لیے ٹھکنے ہو گئے۔“

”ہاں میرا دل شدت سے تمہارے لیے تڑپ رہا ہے۔“

”کاش..... کاش تمہیں سکون مل سکتا۔“

”ہاں۔ میں ساری زندگی سکون کے لیے تڑپتی رہی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”مجھے کچھ اور باتیں بتاؤں گی۔“

”ہاں پوچھو۔“

”تمہاری ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔“

”ہاں اور باپ کا بھی۔“ اس نے جواب دیا۔

”اوہ..... تمہارا باپ بھی مر گیا۔“

”ہاں۔ تم نے وہ قبر دیکھی ہوگی جس سے چنگاریاں بلند ہوتی ہیں۔“



”ہاں۔“

”میں جب بھی اپنے باپ کی قبر پر آتی ہوں تو میرا دل غیظ و غضب اور نفرت میں ڈوبا ہوتا ہے میں اس سے پوچھتی ہوں کہ آخر اس نے میری زندگی کا سودا کیوں کیا۔ اسے کیا حق تھا کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی روح پر مظالم کرتا اور شاید میری آہوں کا دھواں ہوتا ہے جو اس کی قبر سے چنگاریاں بن کر پھوٹتا ہے۔ اس کی روح چمکاڑ کی شکل میں پھڑپھڑاتی ہوئی چاروں طرف دوڑتی ہے وہ اس آگ سے پریشان ہوتا ہے جو اس کے سارے وجود کو سلاکتی ہے۔ میں خوش ہوں کہ مرنے کے بعد اس سے انتقام لیا جا رہا ہے۔ ٹھیک ہے اس دنیا میں انسان بہت کچھ بن جاتا ہے۔ مگر وہ اس بات کو بھول جاتا ہے کہ قبر کی گہرائیاں اس کی بے بسی کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں آج بھی میں جب اس قبر پر آتی ہوں تو میرے دل میں شکوہ ہوتا ہے۔ فریاد ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اور خدا میری اس فریاد کا جواب دیتا ہے اور میرے باپ کی روح پھڑپھڑاتی رہتی ہے۔ اس کی قبر سے چنگاریاں بلند ہوتی ہیں۔

میں غم و اندوہ کا مجسمہ بنا۔ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

”اور کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ اور کیا پوچھوں گا؟“

”تو اب مجھے اجازت ہے۔“

”میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“ میں نے درود سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ اب میں ان منزلوں سے گزر چکی ہوں۔ جب مجھے انسانی ہمدردیوں کی تلاش تھی۔“ اس نے کہا اور پھر وہ آہستہ آہستہ قبرستان کے ٹوٹے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

میں اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا تھا تھوڑی دیر بعد وہ حسب معمول میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔۔۔۔۔ اور میں دل پر بے پناہ بوجھ لیے گھر آ گیا۔

اس رات مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ اس کی کہانی عملی میں میرے سامنے تھی۔ ایک بے بس ولا چار لڑکی آہ۔۔۔۔۔ کیسی دیرانی بسی ہوئی تھی اس کی نگاہوں میں اس دیرانی کا راز پا چکا تھا لیکن افسوس وہ روح تھی اس کے لیے میں کیا کر سکتا تھا۔

دوسری صبح میری طبیعت بھاری تھی۔ تنہا صاحب نہیں تھے میرا کوئی ہمدرد نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ ملازمت چھوڑنا پڑی تو چھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔ بہاد پور جا کر ملازمت کر لوں گا کم از کم وہاں بھائی تو ہوں گی۔

میں اس دن دفتر نہ جاسکا۔ دوسرے دن بھی میں نہیں گیا۔ تیسرے دن دوپہر کو سراج میرے پاس آج ہاف ڈے تھا۔ اس نے تعجب سے مجھ سے پوچھا۔

”کیا بات ہے۔ تم دفتر کیوں نہیں آ رہے ہو۔“

”بیمار ہوں یار۔“

”کیا بیماری ہے بھائی۔“ اس نے مضحکہ لہجے میں پوچھا۔

بس سراج کچھ نہیں۔ ایسے ہی بس طبیعت پر اد ہے۔ دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ میں دفتر جاؤں۔“

”ٹیلی فون بھی نہیں کیا۔ میں بڑا پریشان ہو گیا۔“

”یہ تو بڑے اچھے خاصے نظر آ رہے ہو۔ ذرا ہاتھ تو بخار تو نہیں ہے؟“ پھر اس نے میرا ہاتھ دیکھا اور بولا۔

”کوئی بخار و خار نہیں ہے حضرت اکاٹلی نہیں چلے گی۔“

”نہیں یار اکاٹلی کی تو کوئی بات نہیں ہے۔“ میں نے ”چلیے اٹھیے۔“

”کہاں سراج۔“

”اٹھو یار منہ ہاتھ دھوؤ۔ دیکھو کیا صورت بیمار کی چلو شیو بناؤ جلدی کرو۔“ سراج نے کچھ اسی انداز رعب جھاڑا کہ میں ہنستا ہوا تیار ہو گیا۔ ظاہر ہے۔ ایک منزل تھی اور وہ تھی بالا خانہ۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم اس بازار میں تھے۔

”آؤ یار! آج ذرا جگہ تبدیل کر لیں۔“ سراج نے کہا اور ہم بازار کے بالکل آخری سرے پر پہنچ گئے۔ میڑھیوں پر پہنچ کر ہم اوپر چڑھ گئے اور تماشا بینوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔

دفعتاً میری نگاہ ایک دروازے کی جانب اٹھ گئی اور جو کچھ میں نے دیکھا اسے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا تھا۔

ذرق برق لباس میں ملبوس وہ چمچم کرتی آرہی تھی۔ ہاں وہی تھی سوئی صدی وہی تھی ذرہ برابر تبدیلی نہ تھی اس میں۔

لیکن ہونٹ ہاں اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی مصنوعی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چمکا دی گئی ہو۔ وہ ہونٹ تو مسکراتی ہی نہ جانتے تھے لیکن یہ سب کیا ہے میں پاگل سا ہو گیا اس کی نگاہ بھی اتفاقیہ طور پر ہی

میرے اوپر پڑ گئی اور وہ ایک ننگ دیکھتی رہ گئی۔ اس کے چہرے پر بہت سے رنگ آئے تھے۔

پھر اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ جب اس نے جھک کر آہستہ آہستہ سازندوں سے کچھ کہا اور پھر اس کے پیروں میں بندھے ٹھنکروں کی جھنکار فضا میں گونج اٹھی اور میں شدت حیرت سے دیوانہ بنا اسے دیکھتا رہا تب اس کی دل

دور آواز ابھری۔

ہوں کو بے نشاط کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

اس کے ہونٹوں سے یہ دلدل نغمہ ابھر رہا تھا اور میں دیران صحراؤں میں بھٹک رہا تھا۔ جہاں خزاں ہی خزاں تھی چاروں طرف خشک درخت کھڑے ہوئے تھے ریت کے ذرات ہوائے اٹھ رہے تھے۔ دیرانہ ہر طرف

ویرانہ۔“

وہ ہنسی میرے سامنے جھکی اور بولی۔

”بایو جی۔ آپ دوسروں کے ساتھ نہ جائیے۔“ سراج نے مسکراتے ہوئے میری ران میں چمکی لی تھی۔

”لو بھی تمہارے تو عیش ہو گئے۔“ وہ خاص طور سے کاروباری اور تماشا بین ٹائپ کا آدمی تھا۔ نہ جانے کیا سمجھا تھا لیکن اس کے یہ الفاظ مجھے بہت برے لگے تھے۔

پھر جب رقص کا وقت ختم ہو گیا تماشا بین باہر جانے لگے تو سراج نے مجھ سے کہا۔

”کیا خیال ہے جنتاب! آپ تو بس گئے۔“

”سراج تم جاؤ۔ میں آ جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں ہاں بھائی! دعوت مل گئی ہے۔ لیکن سرکار یہ دعوتیں تو عام طور سے یہاں ملتی رہتی ہیں ان دعوتوں کے چکر میں زیادہ نہ پھنسنا۔“

”سراج! پلیز تم جاؤ۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا اور وہ ہنستا ہوا ہر چلا گیا۔ تب ناگہان قسم کی ایک عورت نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

”رکیں گے بایو جی۔“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا اور اس نے میرے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ جو کچھ میری بیب میں تھا میں نے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میں نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ میں نے اسے جو کچھ دیا ہے وہ کیا ہے۔“

بہر حال ناگہان مطمئن ہو گئی تھی چنانچہ اس نے اندر کسی کو آواز دی اور بولی۔

”شاہینہ ان کے ساتھ جائیں گی کمر اٹھیک کر دو۔“

میں نے پہلی بار اس کا نام جانا تھا۔۔۔۔۔ شاہینہ۔۔۔۔۔ میں نے زریب دہرایا۔ لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں پھر ہم ایک پیار سے کمرے میں پہنچ گئے۔ روشنی تھی لیکن سارا ماحول پیار پیار لگ رہا تھا۔ میں شدت حیرت سے اب بھی خاموش سا تھا۔ وہی لڑکی تھی لیکن اس نے کہا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔

اندھ پنچ کر میں کمرے کے درمیان کھڑا ہو گیا اور اس نے دروازہ بند کر لیا پھر اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

”میں لباس بدل لوں۔“

میں نے گردن ہلا دی اور رخ بدل لیا۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد پلٹ کر اس نے مجھے دیکھا اور رخ پلٹے دیکھ کر شاید اسے عجیب سا احساس ہوا۔ بہر



# معمِلہ

”پہلا نام۔ جب میں زندہ تھی۔“

”ہاں۔“

”مجھے مہرین کے نام سے پکارا جاتا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ تو مہرین میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”کو۔ لیکن میرے بدن میرے اعماز میری اداؤں

کے بارے میں ہی کچھ کہنا۔ اس کے سوا کچھ نہ کہنا۔“ اس

نے کہا اور میں خاموش ہو گیا۔

وہ پوری رات میں نے اس کے نزدیک گزاری لیکن کچھ

اس طرح جیسے کوئی کسی مقدس شے کے نزدیک ہوتا ہے۔

بہر صورت جب میں صبح کو وہاں سے چلا تو میرے

ذہن میں کچھ عجیب سے خیالات تھے میں سوچ رہا تھا کہ

اس کے لیے کچھ کرنا ہوگا اور میں اس شدت سے اس کے

بارے میں سوچ رہا تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

گھر واپس آ کر جو سب سے پہلا کام میں نے کیا تھا وہ

تویر صاحب کو ایک خط تحریر کرنا تھا۔ جس میں میں نے

مہرین کے تمام حالات لکھ دیے تھے اور تویر صاحب سے

درخواست کی تھی کہ کچھ بھی ہو کسی طرح بھی ہونا یہاں

آئیں۔ میں اس لڑکی کو اپنا چاہتا ہوں۔

اور آج میری زندگی انتہائی سرور اور پرسکون ہے۔

مجھے دلی مسرت ہے کہ میں نے ایک روح کو ایک مردہ جسم

کو نئی زندگی دے دی ہے۔ اس نئی زندگی کے لیے مجھے کیا

پاپڑ بیٹھے پڑے۔ وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔

تویر صاحب میرے بہترین معاون تھے اور بھالی آدمی

تو مجھ پر قربان ہو رہی تھیں اس وقت جب میں نے انہیں

تفصیل سنائی کہ میں اس لڑکی کو بالائے خانے سے اٹھا کر

اپنے گھر کی زینت بنانا چاہتا ہوں۔

آج بھی بھالی میری مصلحت کا اعتراف کرتی ہیں اور

مہرین میرے گھر میں انتہائی خوش ہے اس نے اپنا ماضی

بھلا دیا ہے اور اب وہ ایک وقار دار بیوی کی حیثیت سے

میرے گھر میں زندگی گزار رہی ہے۔

☆☆☆☆

صورت وہ میرے قریب پہنچ گئی اور بولی۔

”آپ ابھی تک کھڑے ہیں بیٹھ جائیے۔“

”شکریہ۔“ میں اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔ میں مسہری

کے ایک سرے پر بیٹھ گیا اور وہ دوسرے سرے پر بیٹھ گئی۔

”کیا تم مجھے پہچانتی ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے سر دھچکے میں کہا۔

”لیکن تم نے تو مجھ سے کہا تھا کہ تم مر چکی ہو۔“ میں نے

جذبائی اعزاز میں کہا اور اس نے میری طرف دیکھا وہی

دیران اور ادا اس آنکھیں میں لرز گیا۔

”تو کیا میں تمہیں زندہ نظر آتی ہوں۔“ اس کے یہ

الفاظ میری سماعت پر ایک خوف ناک دھماکا بن گئے اور

سارا مفہوم میری سمجھ میں آ گیا۔ پھر میں نے اس کا ہاتھ

پکڑا اور بولا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”شایینہ۔“

”نہیں تمہارا اصلی نام؟“

”میں اپنی اصلیت تو کبھی کی کھو چکی۔ میں نے جس

کے بارے میں تمہیں بتایا تھا وہ تو اسی دن مر گئی تھی۔ جسے

جس کے باپ نے طوائف کے ہاتھوں فروخت کر دیا

تھا۔ ہاں میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے باپ نے ایک

آخری کوشش کی تھی وہ یہ کہ اس نے مجھے قتل کر دیا۔ اس

نے مجھے بالاخانہ پر پھینک دیا تب کیا میں خود کو زندہ کچھ

سکتی تھی۔ میری قیمت چکا دی گئی تھی۔ میرا باپ میری

قیمت لے کر روپوش ہو چکا تھا اور اب ایسا کوئی نہ تھا جو

مجھے سہارا دے سکتا تھا۔ چنانچہ میں مجبور ہو گئی۔ یہاں پر

میرے ساتھ بڑے بڑے مقام ہوئے اور مجھے اس بات

پر آمادہ کر لیا گیا کہ میں خود کو اسی ماحول کا پروردہ سمجھوں

اور جب میں نے مجبور اس ماحول میں خود کو ضم کر لیا تو

میرے ذہن میں ایک ہی خیال تھا کہ میں مر چکی ہوں۔

میں اپنے اس روپ کو بھلا نہیں سکتی۔

”کوہ۔ کیا تم مجھے اپنا پہلا نام نہیں بتاؤ گی۔“



# محبہ

شمیم نرود

اک جہان دیگر اک داستان محب

حیرت انگیز اور پراسرار کہانیوں میں ایک منفرد کہانی

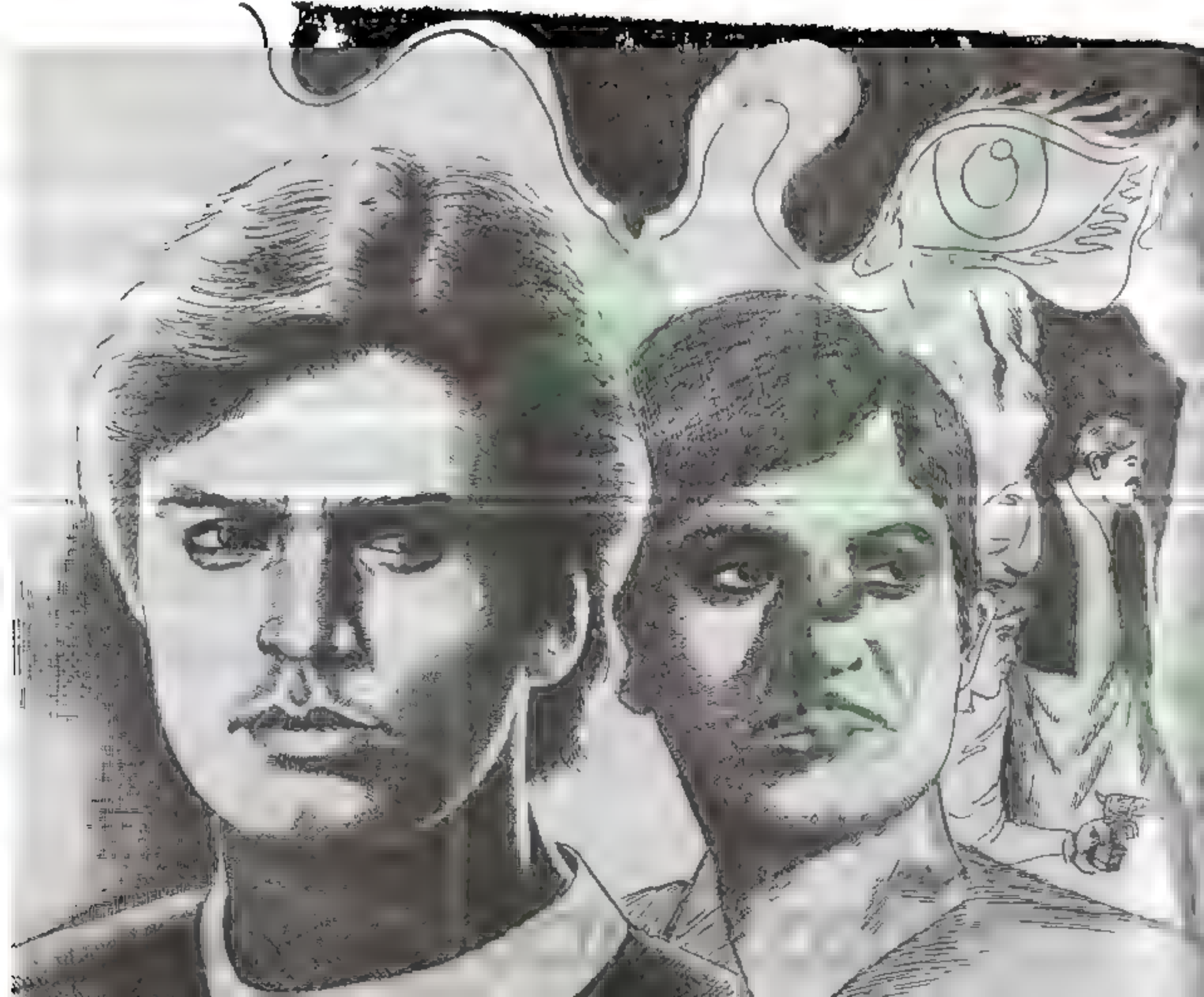
میرے استفسار پر باہر آتے ہی وہ بول اٹھی۔ کماری جی.....! آپ آگ سے نہ کھیلیں۔ مجھے اپنے جیون کی تو کوئی ایسی چٹا نہیں، پر آپ کو کچھ ہو گیا تو یہ سہن کرنا مجھے دو بھر ہو جائے گا۔ مذکیری ہی میں رہتا ہے تو کہیں اور رہ لیں، اس مندر سے دور جہاں چندرموہن کا ٹھکانا ہے۔

میں اسی سے دو دو ہاتھ کرنے تو یہاں آئی ہوں یگی.....! میں نے اسے نرمی سے سمجھایا۔ نہ وہ تمہارا کچھ بگاڑ سکتا ہے، نہ اس میں مجھے نقصان پہنچانے کی ہمت ہے۔ تمہیں اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر یہ کیوں بھول رہی ہو کہ ہم اس کی نظروں سے ادھمیل رہیں گے۔ یہ تو ٹھیک ہے، کماری جی، پھر بھی میرا من بے چین ہے۔ کوتا کی آواز میں اب بھی خوف کی لرزش تھی۔

اچانک میں، چندرموہن کی آواز سن کر اچھل پڑی۔ وہ مجھی سے مخاطب تھا۔ اے معبلہ.....! کوتا کی بات مان لے کہ یہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ چندرموہن میری نظروں سے ادھمیل تھا مگر میں اس کی آواز سن رہی تھی۔ غصے کی شدید لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اسی کے ذریعہ میں چیخ اٹھی۔ بزدل بھگوڑے.....! سامنے آ.....! چمپ کیوں رہا ہے مجھ سے۔

جواب میں چندرموہن کا زہریلا قہقہہ سنائی دیا، پھر اس کی آواز آئی۔ تو بھی تو مجھ سے ڈر کے حصار میں چھپی بیٹھی ہے کہ تجھے دیکھ نہ سکوں.....! خیر، اب تو میرے پیچھے پیچھے یہاں تک آئی گئی ہے تو میں تجھے مایوس نہیں کروں گا۔ تیرے دشمن ڈیان کو بھی میں نے یہاں تیری آمد سے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ بھی اس پر بہت خوش ہے۔ تیرے خریدار انگریز بھی ہیں اور ڈیان بھی.....! جس سے بھی تیرے اچھے دام ملے، اس کے ہاتھ میں تجھے بیچ دوں گا، لیکن کب۔ یہ شاید تجھے بھی خبر ہے۔ چپا کو جو ضد تھی، وہ پہلے پوری ہوگی۔ تو میرا اشارہ سمجھ گئی نا.....! ان الفاظ کے ساتھ ہی ایک بار پھر چندرموہن کا زہریلا قہقہہ کونجا۔

عین اسی لمحے میں نے کوتا کے جسم کا توازن بگڑتے دیکھا۔ اس کے عقب میں گہری کھائی تھی۔ میں تیزی سے کوتا کی طرف لپکی۔ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔





اس حیار نے مجھے باتوں میں لگا کر اچانک کویتا پر حملہ کر دیا تھا۔ میں چند رسوہن کے اس غیر متوقع حملے کا مقصد اچھی طرح سمجھتی تھی۔ کویتا کو راستے سے ہٹا کر وہ گویا مجھے اپنی دانست میں بے سپر کرنا چاہتا تھا مجھے اگر کویتا تک پہنچنے میں چند لمحوں کی تاخیر بھی ہو جاتی تو وہ شاید زندہ نہ بچتی۔

نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود بھی چند رسوہن کی شیطانی قوتیں میرے لئے خطرہ بن گئی تھیں۔ یہ بات ہر چند کہ تشویش ناک تھی لیکن میرا حوصلہ پست نہیں ہوا چند رسوہن نے مجھے جو دھمکی دی تھی اس کا بھی میں نے اثر قبول نہیں کیا، ایسی دھمکیاں وہ پہلے بھی دیتا آیا تھا۔

کویتا کو اپنے حواس پر قابو پانے میں زیادہ دیر نہیں لگی میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مڈکیری پہنچنے سے پہلے میں کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہتی تھی کہ وقتی طور پر کسی چند رسوہن چکرا کر رہ جائے کویتا کو میں نے کچھ ہدایات دیں اور پھر چند ہی لمحوں بعد وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں نے جو قدم اٹھایا تھا اس کا رد عمل اسی روز ظاہر ہو جاتا۔ راجا چک دیر اس سلسلے میں فوری طور پر مدد حاصل کرنے کے لئے چند رسوہن سے رابطہ قائم کرتا اور پھر چند رسوہن کی بے بسی قابل دید ہوتی یہی سوچتی ہوئی میں عمار میں داخل آ گئی۔

حسب توقع میری تنہا داپسی پر عادل نے اظہار حیرت کیا تو میں بولی۔ سسٹما کو میں نے ایک کام سے بھیجا ہے۔

یہاں آتے ہی آپ نے کام دکھانا شروع کر دیا۔ عادل نے دھیمی آواز میں کہا تا کہ دور بیٹھا ہوا شام بابو اس کی بات نہ سن سکے۔

ہم یہاں کام دکھانے ہی تو آئے ہیں۔ میں مسکرائی۔ بس مجھ غریب پر رحم کیجیے گا دنیا میں ابھی بہت کام

نشانے ہیں کہیں اس سے پہلے ہی دی اینڈ نہ لگ جائے دی اینڈ تو ایک نہ ایک روز لگتا ہے کل نہ کسک سکی۔ میں ہنسی۔

فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے آپ تو شوق پورا کر لیں تو زیادہ بہتر ہے۔

تمہارے یا میرے ارادے سے کچھ نہیں ہو سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا میں ہرگز کوئی انبارا، بنجارا نہیں جو بنجارا یا بنجارا لاد چلے، میں بھلا کیوں ٹھاٹ پڑا چھوڑ جاؤں۔

اسی وقت شام بابو اٹھ کر قریب آ گیا اور عادل بیان خاموشی میں بدل گیا شام بابو نے مجھ سے کہ بارے میں معلوم کیا عادل ہی کی طرح میں اسے کئی یوں بھی وہ مجھ سے زیادہ کیرا کرادی نہیں کر رہا کویتا کو داپسی میں زیادہ دیر نہیں لگی اس کا دھمکنا دیدہ تھا میں ایک بار پھر عمار سے باہر نکل آئی تھانہ میں اس سے بات کر سکوں غار سے کچھ ہاتھ آنے کے بعد وہ ظاہر ہو گئی تو میں نے پوچھا۔ کام ہاں۔ اس نے جواب دیا۔

کوئی دشواری تو نہیں ہوئی۔ نہیں صرف چند پہریداروں کو بے ہوش کرنا آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے اسے پہنچا دیا ہے۔

تم نے اسے اپنے بارے میں کیا بتایا۔

یہی کہ میں ایک نیک روح ہوں اور اسے بچانا چاہتی ہوں اسی کے ساتھ میں نے اسے بھی کر دی تھی کہ وہ اپنگول کے محل سے نکلنے کی کوشش کرے محل کے گرد میں نے گھیرا ڈال دیا ہے

چند رسوہن اس کا سراغ نہ لگا سکے۔ کویتا نے بتائی۔ اپنگول شہر کے باسی یوں بھی راجا کی بہنوئی کے وفادار ہیں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر چین بسو بھی محل میں بے دھڑک آتا جا

امت کا باغی ہونے کے باوجود کوئی اس پر ہاتھ نہیں نہیں آج ہی شام ہونے تک ایک بار پھر مڈکیری جانا پھر میں اسے سمجھانے لگی کہ اس مرتبہ کیا کرنا ہے۔

اچا چک دیر کی مظلوم بہن دیو ما کو میں نے قید سے بل دلا دی تھی میری ہدایت کے مطابق کویتا نے اسے محل پہنچا دیا تھا جو گویا اس کا اصل گھر تھا یہ علاقہ لوں کا گڑھ کہلاتا تھا راجا اور اس کے کارندے ان کو باغی کہتے تھے اور وہ لوگ خود کو آزادی کے حق سمجھتے تھے۔ وہ راجا چک دیر کے ظلم و ستم سے ہات پاٹنے کی جدوجہد میں مصروف تھے اور انہیں ایمان کا ویری۔ کی حمایت حاصل تھی۔

اسی شام کویتا نے مڈکیری کا ایک پھیرا اور لگا دیا جو لائی میری توقع کے مطابق تھی۔ سخت ترین پہرے لگا دیے اور دراج محل سے دیو ما کے پراسرار فرار نے راجا کو کھلا دیا تھا اس سلسلے میں پہلے تو راجا نے لنگڑے ہاتھ کی خبر لی پھر اسی کے مشورے پر بہ ذات خود چند رسوہن کی خدمت میں حاضری دینے امرتا تھ کے لئے پہنچ گیا۔ چند رسوہن نے شام تک دیو ما کا سراغ لانے کا دعویٰ کیا مگر ناکام رہا اس سے راجا چک دیر کو دھمکا دیا کہ اگر وہ ناکام نہ بنا مراد مندر سے لوٹ آئے اب وہ باغیوں کے علاقے پر یلغار کرنے کے لئے بے ہتار ہاتھ۔ اسے یقین تھا کہ دیو ما مڈکیری سے نہ ہرگز آتا ہوگا۔

مکمل شروع ہو گیا تھا مجھے معلوم تھا کہ وزیر دفاع اپنی عمارت ریاست کے ایک علاقے پر فوج کشی کے لئے ہرگز آمادہ نہیں ہوگا۔

رات کو امتیاد عدے کے مطابق آ گیا اور اس نے ہمیں راجا کے دامن میں متروک دھرم شالہ تک بہ حفاظت لایا اس دھرم شالہ کے کھنڈرات میں ایک کمرابہر حال ناقابل تھا جہاں ہم قیام کر سکتے۔ امتیاد ہمیں اس کے

بارے میں پہلے ہی بتا چکا تھا اس نے ہمارے لئے وہاں کھانے پینے کی اشیاء کا ذخیرہ بھی کر دیا تھا۔

یہ تو بھوت نگری معلوم ہوتی ہے۔ امتیاد چلا گیا تو عادل نے سرگوشی کی اس نے اپنا بستر میرے قریب ہی بچھایا تھا۔ خاموشی سے سو جاؤ ورنہ کوئی بھوت تم سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

پھر عادل نے میرا زیادہ مغز نہیں چاٹنا طویل سفر کے بعد یہ پہلی رات تھی کہ ہم سکون سے سونے والے تھے۔ سبھی خامسے تھکے ہوئے تھے اس لئے جلد سو گئے مگر تحکین کے باوجود مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ پھر بھی میں نے آنکھیں بند کر لیں اسی کے ساتھ میں اس پراسرار تجربے سے گزرنے لگی جواب میرے لئے دیا نہیں تھا کیے بعد دیگرے مجھے مختلف مناظر دکھائے جاتے رہے اور سرگوشیوں میں بہت کچھ بتایا جاتا رہا ان منظر کا تعلق ریاست کوڈگ اور راجا چک دیر سے تھا تاہم اس طرح مجھے ریاست کے ماضی اور حال سے آگاہ کیا جا رہا تھا اور اس کا یقینا کوئی نہ کوئی سبب تھا جس سے ابھی میں آگاہ نہیں تھی۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھی، محسوس کر رہی تھی۔

پہلا منظر کسی میلے کا سا تھا۔ لوگ گنگا اٹھان کر رہے تھے۔ ایک حسین دلو جوان لڑکی کا چہرہ میرے صفحہ ذہن پر ابھرا اس کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ اس کی مانگ بھری ہوئی تھی یعنی وہ شادی شدہ تھی سونے کے زیورات سے لدی ہوئی اس لڑکی سے کچھ ہی قاصلے پر میں نے راجا چک دیر اور لنگڑے بسو دیکھا کوڈگ کیا۔

اس لڑکی کے بارے میں پتا لگا کہ یہ کون ہے، کس گھر کی ہے۔ راجا چک دیر نے حریص نظروں سے لڑکی کی طرف اٹھاتے ہوئے بسو دیکھا کوڈگ کیا۔

خلاف توقع بسو دیکھا گھبرا سا گیا پھر کہنے لگا۔ پتا لگتا ہوں مالک.....! مگر وہ چاروں ٹھہر جائیں تو اچھا ہے گا۔ اچھا برا مجھے نہ سمجھا۔ راجا منہ بگاڑ کر بولا۔ جو کہتا



ہوں وہ کر زیادہ باتیں نہ بنا۔

مالک.....! یہ سا ہو کار شیشی کی بہو ہے۔ راج محل پہلے ہی شیشی کا مقروض ہے اس کی بہو پر ہاتھ ڈالنا کچھ ٹھیک نہیں رہے گا۔ بسودینا نے بتایا۔ سا ہو کار شیشی کے تعلقات بو پنا اور کشمی نارائن دونوں ہی دزیروں سے ہیں بات کہیں بڑھ نہ جائے۔

تو نرا لو کا پٹھا ہے.....! ابے ہر کام کے لئے راستہ نکالا جاتا ہے محل میں رانی کی سیوا (خدمت) میں لڑکی کو بھیجنے کے لئے بھی تو کہا جاسکتا ہے۔

سیوا کے لئے کہیں یا کچھ اور ان کے لئے ایک ہی بات ہے مالک.....! وہ سمجھ جائیں گے کہ یہ آپ کی خواہش ہے۔ شیشی کسی طرح دب کر مان بھی جائے تو بیٹا نہیں مانے گا، بیٹ بھی اگر مان گیا تو اس کی ماں نہیں مانے گی، بات بڑھ جائے گی مالک۔

ہم نے ریاست کے خزانے کے لئے شیشی سے کچھ رقم مانگی تھی یاد ہے تجھے کہ اس نے ہمیں کس طرح باتیں بنا کر بہلا دیا تھا اس وقت کے حیلے بہانے کا نتیجہ اب اسے بھگتے دے جو تجھ سے کہا ہے اس پر عمل کر لڑکی کا مطالبہ کر اس سے، بہانہ رانی کا بنا۔

جو حکم میرے مالک بسودینا نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔

منظر بدلا اور اب میں نے ایک ادیز عمر شخص کے سامنے بسودینا کو بیٹھے دیکھا ادیز عمر شخص کے چہرے سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔

بسودینا جی ہمارے راجا جی تو ٹھیک ہیں نا۔

ٹھیک ہیں شیشی جی۔ بسودینا نے جواب دیا۔ لیکن میں اس وقت ان کے پاس سے نہیں آ رہا ہوں مجھے رانی ماں نے بھیجا ہے۔

رانی ماں نے بھیجا ہے۔ ادیز عمر شیشی حیرت سے بولا پھر پوچھا۔ ان کا کیا حکم ہے۔

ان کا حکم ہے کہ آپ کی بہو کچھ دن کے لئے آ کر محل

میں راجکاری کے ساتھ رہے۔ بسودینا نے بتایا۔ شیشی کے چہرے سے واضح طور پر معلوم ہونے لگا کہ وہ بات کی تہ تک پہنچ گیا ہے اس کے چہرے پر اس فکر مندی کے ساتھ ہی خوف کی پرچھائیاں بھی تھیں۔ اچھی..... اچھی بات ہے بہو محل میں ضرور جا گی..... میں اسے خود..... خود بتا دوں گا۔

کل بھیج دیں گے یہ کہہ دوں۔

مم..... میں خود..... کیوں نہیں..... بتا دوں گا۔

بسودینا واپس چلا گیا شیشی نے فوراً ہی اپنی بیوی کو بلایا اس سے کہا کہ بیٹے اور بہو کو فوراً کل کوڈ (میسور) جانا ہے پھر میں نے اسی حسین و جوان اٹھارہ سالہ لڑکی ایک نو جوان کو دونوں کروں کے ساتھ لڑکیری کی حد سے نکلنے دیکھا اسی کے بعد مجھے شیشی راج محل میں نظر آیا وہ باادب سارا رانی گورما کے سامنے کھڑا تھا۔

کہیے کیا بات ہے شیشی جی۔ کیسے آئے۔ رانی۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

شیشی کہنے لگا۔ کچھ دن بعد جنگلوں کے انگریزوں کو بھوجن (کھانا) دینا ہے۔ سنا ہے کہ اس کے لئے پھر سامان چاہیے۔ انگریزوں کے لئے ضروری سامان جنگور ہی سے منگوانا پڑتا ہے پہلے سے تفصیل پتا چل جائے تو آسانی ہوگی اسی بات کی پرارتھا (درخواست) کے لئے آیا ہوں۔

ٹھیک ہے ہم بسودینا سے کہلا بھیجیں گے۔

ایک بات اور تھی رانی ماں۔ شیشی کی آواز دھیمے ہو گئی۔ سنا ہے آپ نے حکم دیا ہے کہ راج محل میں رہنے کے لئے ہمارے گھر سے کسی لڑکی کی ضرورت ہے کیا کام ہے۔ کے بھیجوں۔ یہ بھی پوچھتا تھا۔

رانی گورما کے چہرے پر یہ من کے ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ چند لمحے بعد وہ بولی۔ ہاں..... یہی نے کہا کہ راجکاری کے ساتھ دل بہلانے کی کوئی لڑکی چاہیے وہی بات شاید آپ تک پہنچی ہوگی ہم کہلا بھیجیں گے جہاں

ضرورت ہوئی تب تک کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ جو حکم رانی ماں۔ شیشی اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شیشی ہی کا چہرہ پھر مجھے ایک نئے منظر میں دکھائی دیا وہ لگزے بسودینا کو اپنی نشست گاہ میں بٹھار ہاتھ وہ بسودینا سے انگریزوں کو دی جانے والی دعوت کے بارے میں بات کرنے لگا تو بسودینا نے کہا۔ ابھی راجا جی نے یہ ارادہ لٹوئی کر دیا ہے۔ آپ یہ بتائیں بہو کو کب راج محل بھیجیں گے۔

گاؤں سے آتے ہی بھیج دوں گا۔ کس گاؤں سے۔ کل تو وہ یہیں تھی نا بسودینا حیران سا ہو کر بولا۔

گھر میں کون سی لڑکی ہے اور کون سی نہیں کیا یہ باتیں سب کو بتانے کی ہوتی ہیں رانی ماں نے بھیجنے کے لئے کہا ہے بھیج دوں گا۔ آپ یہ پوچھ رہے ہیں کہ کب بھیجوں گا تو کہہ دیجیے گاؤں سے واپس آنے کے بعد بھیج دوں گا۔

تو مجھے ساری بات صاف صاف بتانا پڑے گی۔ بسودینا نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ یہ راجا جی کا حکم ہے کہ وہ لڑکی ان کے خاندان کے ساتھ رہے۔

یہ تو بڑی عزت کی بات ہے ضرور بھجوائیں گے انہیں اطلاع دے دیجیے۔

شیشی جی یہ رانی ماں کی بات نہیں ہے شاید آپ جان کر بھی انجان بن رہے ہیں رانی ماں سے تو اس کا تذکرہ بھی نہ کریں۔

کل ہی بات کیوں نہیں بتائی تھی بسودینا جی میں تو رانی ماں سے یہ تذکرہ کر بیٹھا۔

تو یہ کہیے کہ آپ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ راجا جی کا حکم ہے۔ بسودینا کے لہجے میں طنز تھا۔

پھر میں نے مختلف مناظر دیکھے اور پتا چلا کہ شیشی کی بہو کا معاملہ کس حد تک طول کھینچ گیا۔ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ دونوں وزیر بو پنا اور کشمی نارائن نے رانی گورما سے ملنے کا فیصلہ کیا کہ راجا کی جگہ رانی ریاست

کی ذمہ داری قبول کر لے وہ دونوں اسی سلسلے میں گفتگو کر رہے تھے۔ کشمی نارائن ابھی پوری طرح اس فیصلے سے متفق نہیں تھا وہ بو پنا سے کہنے لگا۔ یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اس سے بغاوت کی بو آتی ہے۔

بغاوت نہیں ہونا چاہیے۔ یہی سوچ سوچ کر اتنا دقت گزار دیا کہا جاتا ہے شکایت راجا تک لے جانا چاہیے لیکن راجا جی غلطی کرے تو کس سے شکایت کی جائے۔ کسی لڑکی کو پکڑ لاتے ہیں، اسے خراب کرتے ہیں اور پھر محل سے باہر نکال دیتے ہیں۔ کون سی لڑکی خود آئی، کسے زبردستی لے جایا گیا اس پر ہم نے کبھی دھیان نہیں دیا آج شیشی کی بہو پر ہاتھ ڈالا جا رہا ہے تو پھر کل ہمارے گھر پر برسوں آپ کے گھر پر ہاتھ ڈالا جائے گا اسے روکنا بغاوت نہیں ہے۔ بو پنا سخت غصے میں تھا۔

کوڈ کی لڑکیوں پر اور برہمنوں کی بیٹیوں پر کیا آج ہی انہوں نے ہاتھ ڈالا ہے مگر اسے روکا کیسے جائے۔

میں کہہ تو چکا ہوں کہ راجا کو گدی سے ہٹا دیا جائے کیا پرانوں میں نہیں کہا گیا کہ شہر کے بچوں کو پانی میں ڈبو نے کی وجہ سے راج پتر کو جنگل میں بھیج دیا گیا۔ ویش کی جتنا کو تنگ کرنے کی وجہ سے کیا بین رس کا سر نہیں اڑا دیا گیا۔ میرا خیال اب بھی یہی ہے کہ رانی ماں کا رو بار حکومت چلا سکتی ہیں۔

اس سے بات نہیں بنے گی بو پنا جی.....! اپنی اگر یہ کہے کہ یہ کام کرنا ہی پڑے گا تو تپتی کو کرنا ہی پڑتا ہے اقتدار تو اس طرح راجا جی ہی کے ہاتھ میں رہے گا۔

اگر آپ سمجھتے ہیں تو راجکاری کو گدی پر بٹھایا جاسکتا ہے۔ یہ تو اور بھی برا ہوگا راجکاری باپ کا حکم کیسے ٹال سکے گی۔ یہ دونوں نہ سہی تو راجا کی بہن دیو ماسکی۔

آپ کو عورتیں ہی نظر آ رہی ہیں بو پنا جی کوئی عورت کس طرح حکومت چلا سکتی ہے۔

تو پھر اس سلسلے میں رانی ماں ہی سے مشورہ کرتے ہیں ممکن ہے وہ کوئی بہتر صورت نکال سکیں۔



دونوں اس پر متفق ہو گئے پھر میں نے انہیں راج محل میں رانی گورما سے بھی گفتگو کرتے دیکھا ابھی یہ گفتگو ادھوری تھی کہ بغل کے دروازے پر کسی کا سایہ دکھائی دیا۔ آنے والا راجا چمک دیر تھا جو چہرے سے نشے میں غرق لگتا تھا اسی کے ساتھ بسودیا تھا۔

تو کیا حرای پن کر رہی ہے یہ پتا لگانے میں خود ہی چلا آیا۔ راجا سخت برہم لہجے میں چیخا۔ کیا کر رہی ہے حرام زادی اس برہمن کے ساتھ۔ اس نے لکشی نارائن کی طرف ہاتھ اٹھایا پھر بو پٹنا کی طرف غصے سے دیکھ کر کہا۔ یہ تیرا رشتے کا بھائی کیوں آیا ہے یہاں۔

رانی دونوں وزیروں کی طرف رخ کر کے بولی۔ یہ سب باتیں آپ لوگوں کے سننے کی نہیں ہیں بو پٹنا جی اور پنڈت جی یہ ہمارے گھر کی بات ہے۔ یہ کہہ کر وہ راجا کی طرف مڑی۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی یہاں کوئی جرم نہیں ہوا۔

راجا چمک دیر اور بھی غضب ناک ہو گیا۔ جرم نہیں ہوا بتا دوں گی سب کچھ۔ پھر وہ کہنے لگا۔ تو بتائے گی مجھے۔۔۔۔۔ ٹھہر جا تجھے تو میں بھنگیوں کے آگے ڈالوں گا۔ بو پٹنا تیرا رشتے کا بھائی ہے اور تو اس کی رانی ماں ہے۔۔۔۔۔ خوب ہے اس سے تیرا رشتہ، کیا تجھ سے چھیڑ چھاڑ کرنے، جی بہلا نے آیا ہے تیرا یہ بھائی۔۔۔۔۔ بولو تم کیوں آئے ہو یہاں۔ راجا غصے کے عالم میں بو پٹنا کی طرف بڑھا۔

بو پٹنا کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو گیا وہ جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ لکشی نارائن نے اسے روک دیا۔ بو پٹنا جی آپ کچھ نہ بولیں۔

رانی گورما اب بھی پرسکون معلوم ہو رہی تھی وہ راجا سے مخاطب ہوئی۔ وزیروں کو میں نے بلایا تھا، کام تھا، یہ سب میں بعد میں بتاؤں گی۔ اس وقت آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ذرا بیٹھ جائیے بعد میں بات کریں گے۔ رانی بو پٹنا اور راجا کے درمیان میں آ گئی۔

حرام زادی اپنے باپ کو بچاتے آرہی ہے یہ کہہ کر نے رانی کو ناراض کرنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔

بو پٹنا نے راجا کو روکنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر نارائن نے اٹھنے پیچھے سے کھینچ لیا۔

راجا کا ہاتھ رانی کے سر پر لگا۔ رانی نے اسے دھڑکاتوں سے پکڑ لیا مانتے میں غصے سے ہانپتے ہوئے ایک طرف جھک گیا اور پھر جھکنا ہی چلا گیا۔

رانی نے ہاتھ پھیلا کر اسے گرنے سے بچایا۔ بولی۔ ادھر آؤ بسودیا، راجا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں یہاں سے لے جا کر لٹانا ہے۔

راجا چمک دیر بے ہوش ہو گیا۔ رانی اسے اٹھا کر ملازمین کی مدد سے اندر لے گئی۔ بو پٹنا لکشی نارائن کے ساتھ وہاں سے چلا آیا اور راج محل سے نکلے اس کا غصہ ابل پڑا وہ بولا۔ آپ نے دیکھا یہ بھگ

راجا کیا کیا بکواس کرنے لگا ہے۔ ایک کوڑی عورت اس کی ماں تھی اور کوڑی عورت ہی اس کی بیوی ہے اس کے باوجود یہ ابھی تک کوڑیوں کو سمجھ نہیں سکا کیا یہ بیٹھ ہی راجا بتا رہے گا۔ آپ بتائیں پنڈت جی کیا میں اتنی ذلت سہہ کر بھی اس کا منتری (وزیر) بن رہی ہوں۔

بو پٹنا جی آپ نے ابھی تک راجا کو نہیں سمجھا، ان کی تربیت کسی اچھے ماحول میں نہیں ہوئی، مناسب تعلیم بھی نہیں ملی ایسی باتیں سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں یہ راجا اسے اپنے گھر کا معاملہ ہے ہمارا آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں اگر ہی بات بات پر غصہ کرتے رہیں تو دیش کا کچھ ہوگا۔

دیش کی بات اور ہے پنڈت جی۔ اس کی کہانی ایک روز ختم ہوتی ہے ایسے راجاؤں کے ہاتھوں میں دیش کبھی نہیں پہنچتا یہ راجا تو بھگ منکا ہے خزانے کے لئے جب دیکھو سا ہو کاروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا رہتا ہے بھگ منگوں میں بڑا پن کیسے آ سکتا ہے راجا بننے بھی بڑا پن نہیں آ سکا۔ اسی سرزمین نے بڑے بڑے

ہاں کو دیکھا ہے جنہوں نے اس کا نام روشن کیا اب لیزا پیدا ہوا ہے جو کیشک کی ہیرہ میں گم ہونام کر رہا ہائی نہ کوئی اس کا سر صرف کچلے گا یا اسے ختم کر دینے گا۔ اند ساز پنڈت لکشی نارائن نے بے بیشکن بو پٹنا کا لہذا کیا اور اسے کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے روک دیا۔

لکشی بند آنکھوں نے اس رات آخری منظر دیکھا اٹھارہ راجا چمک دیر سے مخاطب تھا۔ میں بھگوتی کے پاس پوجا کرانے جا رہا ہوں رانی ماں کی بھی اس میں دل ہے تمام بند و بست ہو چکا ہے مالک

ہماڑ میں جا اب ان باتوں اور پوجا پاٹ سے کیا

لاندے کے لئے ہی تو جا رہا ہوں راجا جی اگر بھگوتی کی پوجا سے فائدہ ہو جائے تو کئی جوانی واپس آ جائے گی۔

واپس آئے گا تیرا سراپ اس جسم میں رکھا ہی کیا ہے۔۔۔۔۔ تیرے ساتھ جوانی کا کھیل کھیل کر میں اب نہ لاش بن گیا ہوں جسم میں نام کو طاقت نہیں رہی کتنے دن سے کمزوری کے سبب اسی طرح بستر پر پڑا ہوں۔

میں ایک دفعہ آپ ٹھیک ہو چلے تجھے مگر دید کی بات مانے نہ میری رن واس جالیا۔ دوراتوں کے سکھ کی خاطر کتنی راتیں جاگ کر گزارتا پڑیں پھر بھی فکر کی کوئی بات نہیں وہی دن رات پھر لوٹ آئیں گے ہر مات کو رن واس (خواب گاہ) پہلے ہی کی طرح مہا کرے گی ابھی سے آپ کی دل بنگلی کے لئے میں نے انتظام کر لیا ہے۔ طبیعت کا کیا ہے آج خراب ہے تو کل ٹھیک ہو جائے گی آپ دیکھتے رہیں بھگوتی کی پوجا کا کیا اثر ہوتا ہے۔

تجھے منع کس نے کیا ہے۔ جو کر سکتا ہے، جا کر۔ روانگی سے قبل بسودیا نے پوجا کا سامان دس آدمیوں کے سر پر اٹھوا کے بھیج دیا آدی واپس آ گئے تو

بسودیا اکیلا بھگوتی کے آشرم پہنچا۔ کھڑے سے اتر کر وہ پیدل ہی سامنے پہاڑی کے واس میں نظر آنے والے آشرم کی طرف بڑھا۔

آشرم کے چاروں طرف کھنی جھاڑیاں تھیں اندر جانے کے لئے جھاڑیوں کے درمیان ہی سے ایک راستہ تھا وہاں ایک عورت کھڑی تھی وہ لنگڑے کو اشارے سے بلا کر اندر چلی گئی۔

پہاڑ کی تلہی میں واقع زمانہ قدیم کی یہ ایک کچھا تھی جسے لوگوں نے اب بھگوتی کا آشرم کہنا شروع کر دیا تھا بھگوتی نے اس کچھا کے سامنے لکڑیوں سے دیوار بنوائی تھی کچھا کے سامنے ایک دروازہ تھا دروازے پر ایک ڈھلوان پتھر تھا اس پر بیلین بھلی ہوئی تھیں اس جگہ کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ کوئی خاص اور جبرک مقام ہے۔

آشرم کے دروازے پر بھگوتی کی صورت دکھائی دی تو بسودیا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے نمنسکار کیا اور آگے قدم بڑھایا۔

بسودیا لنگڑاتا ہوا دروازے کے پاس آ رہا تھا تو بھگوتی اسے ٹھنکی بائیں دیکھ رہی تھی۔ ادھیڑ عمری کے باوجود وہ ایک باوقار اور حسین عورت لگتی تھی۔ چہرے کے نقوش خنکے اور پرکشش تھے لنگڑا بھی بھگوتی کے پر وقار حسن سے متاثر معلوم ہو رہا تھا وہ بھگوتی کے قریب پہنچا تو اندر آنے کا اشارہ کر کے بھگوتی مڑ گئی۔

بسودیا کو بھگوتی کچھا میں لے گئی۔ درمیان میں جو دروازے والا ایک کمر تھا وہاں دیے کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ بائیں طرف کے کمرے میں روشنی کم تھی مہتمی دیوار کے ایک ہالے میں کوئی تصویر تھی جس کے سامنے دیا بھل رہا تھا۔

بھگوتی نے بسودیا کو دروازے کے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اندر چلی گئی کمرے کے درمیان میں دروازے کے رخ ایک مورتی رکھی تھی جو لوہے کی بنی ہوئی تھی مورتی چمکدار تھی اور عام مندروں میں پائی

109



جائے وہاں سورہوں سے صفحہ سی۔

بسودیا کے چہرے سے خوف سا جھلکنے لگا وہ فضا کی ایسی تھی بھگوتی مورتی کے سامنے ایک کتاب کھول کر بیٹھ گئی اس نے مورتی کے دونوں طرف کی قیوں کو ٹھیک کر کے روشنی بڑھائی بسودیا کی طرف دیکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود کتاب سے منتروں کا جاپ کرنے لگی۔

یہ جاپ خاصی دیر تک چلا۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ بھگوتی مورتی کے چہروں میں پھول چڑھاتی جاتی تھی اور مورتی پر نظریں جما کر ہاتھ جوڑتی تھی۔ پوجا نہایت پرسکون انداز میں ختم ہوئی اور بھگوتی اٹھی اس نے بسودیا کو بھی کھڑے ہونے کا اشارہ کیا پہلے سے تیار رکھا کا نور آرتی کی قمال میں جلا کر بھگوتی نے مورتی کی آرتی اتاری، آرتی اتارتے ہوئے بھی وہ کچھ پڑھ رہی تھی۔

آرتی اتار کر بھگوتی نے چار پانچ مٹی پھول محل سے آئی ہوئی قالیوں میں ڈال دیئے اور پھر انہیں لا کر بسودیا کے سامنے رکھ دیا۔

آج کی پوجا ختم ہوئی۔ بھگوتی نے کہا۔ یہ پوجا کم سے کم پانچ دن چلے گی۔

ٹھیک ہے۔ بسودیا نے جانے کے لئے قدم اٹھایا۔ اسی لمحے بھگوتی نے حمزہ سے آگے بڑھ کر بسودیا کو اپنی ہاتھوں میں سمیٹ لیا پھر یوں لگا جیسے بھگوتی سسک رہی ہو۔ چند ہی ساعتوں کے بعد بھگوتی کی ہاتھوں کا حلقہ کھل گیا اور وہ بسودیا سے دور جا کھڑی ہوئی

اب یہاں مت ٹھہرو، جاؤ یہاں جو کچھ ہوا ہے کسی سے مت کہنا۔ یہ کہتے ہی بھگوتی پوجا گروہ میں چلی گئی اور بسودیا اسے حیران حیران سی نظروں سے دیکھتا رہا۔

پھر کوئی منظر میری بند آنکھوں میں نہیں جاگا میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس عورت کا رویہ میرے لئے بھی پراسرار تھا وہ عورت کون تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو

کیوں تیر رہے تھے۔ متعدد سوالات میرے ذہن گردش کرنے لگے مجھے یہ مناظر کیوں دکھائے تھے۔ میں سوچنے لگی اور پھر مجھے سرگوشیوں میں سے متعلق سب کچھ بتا دیا گیا۔ مجھے یہ جان کر بڑی بڑ ہوئی اور زبان کے سوتیلے بھائی جذیل کا چہرہ آنکھوں میں گھوم گیا۔

اس کے بعد میرا ذہن پرسکون ہو گیا اور آنکھ لگ لگی دوسرے ہی دن صبح میں عظیم منکھن کی تاکید مطابق بھگوتی سے ملنے اس کے آشرم میں پہنچ گئی سے مجھے بہت کچھ معلوم ہوا تھا۔

بھگوتی اس وقت پوجا کر کے باہر آ رہی تھی مجھ سے پڑتے ہی وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

کون ہو تم۔ اس نے مجھ سے سوال کیا۔ تمہیں نے پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔

بھگوتی کیا بیٹھنے کو نہیں کہو گی۔ میں نے اسے دانا نام لے کر مخاطب کیا۔

تو میرا نام بھی جانتی ہو تم۔ بیٹھو۔

فرش پر ردی بٹھی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گئی، بولی۔ تم ایک روشن ضمیر عورت مشہور ہو بھگوتی، تمہارے اندر اندر ایسی اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔

کیا مطلب ہے اس سے تمہارا۔ بھگوتی کی تیر پریل پڑ گئے۔

تمہارے اندر اتنا حوصلہ بھی نہیں کہ اپنی اولاد کو اپنا کہہ کر بولو کیا ایسا نہیں ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالا۔

تم..... تم کیا کہہ رہی ہو میں کبھی نہیں۔ وہ گھبرا سی گئی۔ شاید تم سمجھ کر بھی نہیں سمجھنا چاہتیں ٹھیک ہے پھر خود ہی بسودیا کو بتا دوں گی کہ تم اس کی ماں ہو۔

نہیں..... وہ تقریباً چیخ اٹھی۔ ابھی ایسا ہرگز نہ کہنا بھگوتی کی آواز دھیمی ہو گئی۔ لیکن تم..... تم میرے چہ کو کیسے جانتی ہو۔

میں تو اور بھی بہت کچھ جانتی ہوں بھگوتی۔ میں

معنی خیز لہجے میں کہا۔ کیا راجا چک دیر کا باپ لنگ راج تمہارا شوہر نہیں تھا اور اپنی جان کے خوف سے تم راج محل چھوڑ کر بھاگ نہیں گئی تھیں۔ لنگ راج نے تمہارے بیٹے کو بھی ایک رات نشے اور غصے کے عالم میں مارنا نہیں چاہا تھا۔ اس نے بسودیا کا ہیر موڑ دیا تھا اور تم نے اپنے بیٹے کو مرنے سے بچالیا تھا اس شرط پر کہ تم لنگ راج کی زندگی سے نکل جاؤ گی لنگ راج نے تمہیں دھمکی دی تھی کہ اگر راج محل چھوڑ کر نہ گئیں تو وہ تمہیں اور تمہارے بیٹے کو قتل کر دے گا۔ محض اس لئے لنگ راج تمہیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ تمہارا تعلق کسی معزز گھرانے کی بجائے کانے بھانے والے ایک خاندان سے تھا۔ بھگوتی.....! تم نے ایک معمولی مغنیہ ہو کر اقتدار پر اپنے حق کا دعویٰ کیا تھا یہی تمہارا جرم ٹھہرا لنگ راج تمہیں اپنی پہلی بیوی دیو کا کے برابر حق دینے پر آمادہ نہیں تھا لنگ راج کو مرے برسوں بیت گئے تو اب تم لوٹی ہو تاکہ جو حق تمہیں نہ مل سکا اپنے بیٹے بسودیا کو دلا سکو یہی بات ہے نا۔

میری باتیں سن کر بھگوتی پرستہ سا طاری ہو گیا، پھر اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آنے لگے اس کے خوف کی وجہ سمجھتا میرے لئے مشکل نہیں تھا میں نے اس سے جو کچھ کہا تھا اگر راجا چک دیر کے علم میں آ جاتا تو پھر اس کے بیٹے بسودیا کو قتل کر دیا جاتا اور خود اسے بھی زندہ نہ چھوڑا جاتا۔

سنو بھگوتی۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ڈرو مت میں بہت دور سے دیوتاؤں کے حکم پر تمہاری مدد کرنے آئی ہوں۔ میرا نام کرن کماری ہے اور میں دیوتاؤں کی چیتنی ہوں اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے تمہارے ماضی کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوتا۔

تم نے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں کہا۔ بھگوتی آخر کار بول ہی اٹھی۔ تم واقعی گئی اور دیوتاؤں کی چیتنی ہو۔ بھگوتی مرعوب لگ رہی تھی اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ مگر کماری یہ کس طرح ممکن ہے۔

لنگ راج کا بڑا بھائی جی تو اپنے بیٹے دیرنا تو ریاست کی گدی پر بٹھانا چاہتا ہے وہ یہاں سوای جی کا بھیس بھرے پھرتا ہے اس نے میرے سوتیلے بیٹے چک دیر کے خلاف ایک تنظیم پر بھی توجہ نہ جھالی ہے اس تنظیم کا نام فرزند ان کا دیری ہے تمہیں پتا ہی ہوگا۔

ہاں معلوم ہے۔ میں نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ سوای جی کی شخصیت سے بھی پردہ اٹھ گیا تھا۔

لنگ راج کے بڑے بھائی کا نام کری اپا ہے میرا مطلب اصل نام سے ہے، اس کا بیٹا دیرنا اسی مذکوری میں سنیا سی بنا پھرتا ہے۔ بھگوتی نے مزید بتایا۔ مجھے یہاں آئے بہت دن ہو گئے ہیں اور میں بہت کچھ معلوم کر چکی ہوں۔ میں نے انگریز سرکار کو بھی اس سلسلے میں خط لکھے ہیں کہ میرا حق دلا یا جائے۔

تمہارے سوتیلے بیٹے راجا چک دیر کا بہنوئی جین بسو بھی تو حکومت کا دعویدار ہے اس نے بھی تو انگریز حکام کو خط لکھے ہوں گے۔

ہاں تم ٹھیک کہتی ہو کماری۔ مجھے تو کری اپا پر بھی یہی شبہ ہے کہ وہ راج پاٹ اپنے بیٹے کو دلانے کے لئے انگریزوں سے ساز باز کر رہا ہے اب کبھی بتاؤ کہ ایسی صورت میں اگر چک دیر کو گدی سے کسی طرح اتار بھی دیا گیا تو مجھے میرا حق کیسے ملے گا۔

تم ایک بات شاید اور بھول گئیں بھگوتی کہ مقامی باشندے جنہیں کوڑی کہا جاتا ہے، چک دیر کو گدی سے اتار کر رانی گورما یا اس کی بیٹی راجکماری پٹا کو بھی ریاست کا حکمران بنا سکتے ہیں رانی گورما بہر حال کوڑی ہی کی ہے سو یوں راجا چک دیر کے اقتدار سے ہٹنے کے بعد بھی حکمرانی کے پانچ افراد دعویدار ہو سکتے ہیں۔ ایک تو تمہارا ہی بیٹا بسودیا دوسرا چک دیر کا تایا زاد دیرنا تیسرا بہنوئی جین بسو چوتھی رانی گورما اور پانچویں راجکماری پٹا۔

پھر یہ بتل کیسے منڈھے چڑھے گی۔ تم کس طرح



میری مدد کرو گی۔ بھگوتی نے بے چین ہو کر پوچھا۔  
اس کا جواب تمہیں آنے والا وقت دے گا۔ یہ کہتے  
ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔  
کماری۔! تم یہاں مذکوری میں کہاں ٹھہری ہو۔  
وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

تم سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ میں نے مسکرا کر جواب  
دیا۔ فی الحال تمہارے لئے اتنی ہی جان لینا کافی ہے۔  
پھر کب آؤ گی۔ اس نے میرے ساتھ ساتھ چلتے  
ہوئے معلوم کیا۔

کچھ خبر نہیں۔ میں نے کہا۔ مجھے تم سے جو کہنا تھا کہ  
جکی اور دیوتاؤں کے حکم پر جو کرنا ہوگا اس کے لئے میرا  
تم سے ملنے رہنا ضروری نہیں۔

ہاں میں تمہیں ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی پچھلے  
بغض مجھ سے ایک انگریز افسر بھی آکر ملا تھا اس نے بھی  
مجھ سے میری مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا، اپنا نام شاید اس  
نے رابرٹ بتایا تھا رابرٹ کے ساتھ کچھ اور بھی لگا تھا  
جو مجھے یاد نہیں رہا۔

آگے بڑھے بڑھے میرے قدم جیسے خود بہ خود رک  
گئے میں چونک کر بولی۔ اپنا نام۔۔۔ پورا نام اس نے  
رابرٹ ایم تو نہیں بتایا تھا۔

ہاں یہی پورا نام تھا اس کا۔! کہہ رہا تھا کہ اس نے  
میسور کے کشتہ کے پاس میرا خط دیکھا تھا۔  
ایک بار مل کر پھر تو وہ نہیں آیا۔

نہیں۔ بھگوتی بولی۔ کیا تم اسے بھی جانتی ہو کماری۔  
ہاں بہت اچھی طرح۔ میرا لہجہ متنی خیز تھا۔

پھر میں بھگوتی کے پاس حیدر کی بیٹی نور چلی آئی عظیم  
مہمن نے بلا سبب مجھے یہ تاکید نہیں کی تھی کہ میں بھگوتی  
سے ضرور ملوں۔ بھگوتی سے مجھے بہت سے خفا کی کا علم  
ہو گیا تھا فرزند ان کا دیری کے بارے میں میرے  
اندازے بڑی حد تک درست ثابت ہوئے تھے۔ اس  
عظیم کی آڑ میں اقتدار کے حصول کا کھیل کھیلنا جا رہا تھا۔

موجودہ صورت حال میں میرے لئے یہ اندازہ لگانا  
کوئی مشکل نہیں تھا کہ ریاست کوڈگ کا مستقبل کیا  
ہوگا۔! اقتدار کے مختلف دعویداروں کی باہمی کشمکش  
سے قائمہ تھا کہ انگریز حکمران پورے ہندوستان کی  
طرح اس ریاست پر بھی قبضہ کر لیتے یہاں تک مٹری  
اشلی جنس کے سربراہ رابرٹ کے قدم پہنچ جانا اسی  
طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ریاست پر انگریزوں کے قبضے  
سے قطع نظر مجھے اب اپنے معاملے کی فکر تھی جس کی خاطر  
میں نے یہ طویل اور دشوار گزار سفر کیا تھا مجھے چند موبہن  
اور ڈیان سے غنا تھا جو مجھ سے زیادہ دور نہیں تھے۔

میں دھرم شالہ کے کنڈرات میں واپس پہنچی تو اپنی  
عادت کے مطابق عادل نے مجھے چھڑا۔ میں شام باہو  
سے ابھی کہنے ہی والا تھا کہ باہر جا کر آپ کو دیکھوں۔  
وہ کس لئے۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

آپ کو مجھے بہت دیر ہو گئی تھی اور بتا کر بھی نہیں گئی تھی کہ  
کہاں جا رہی ہیں یہ علاقہ بہر حال آپ کے لئے اچھی ہے۔  
ابھی جب آپ گئیں تو اتنی سواری جی کا پیغام لے کر  
آیا تھا سواری جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں اتنی آج  
شام پھر آئے گا۔ شام باہو نے بتایا۔

سواری جی کا بھید کل ہی کیا شام باہو۔ میں دیر سے  
سے طرہ انداز میں تھی۔ میں نے پہلے بھی آپ سے  
اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا تھا۔

جی ہاں مگر ہوا کیا۔ شام باہو نے حیرت سے پوچھا۔  
ہوا تو خیر کچھ نہیں لیکن۔۔۔ پھر میں نے شام باہو کو  
فرزند ان کا دیری کے اصل اغراض و مقاصد سے آگاہ  
کر دیا پھر بولی۔ اس کے باوجود ان لوگوں سے بگاڑنا

نہیں ہے بس اتنا ہے کہ سرفروش عظیم کو ان کے بارے  
میں جو غلط فہمی تھی وہ دور ہو گئی، وہ لوگ بھلا انگریزوں  
سے کیا لڑیں گے جو اپنے اپنے اقتدار کے حصول کی  
خاطر انگریزوں ہی سے مدد چاہتے ہوں۔! سارے  
ہندوستان میں انگریزوں کو پیر جمانے کا موقع ایسے ہی

لوگوں نے تو دیا ہے۔

پھر تو یہی لگتا ہے کہ یہاں عاصب انگریز آزما  
ہوئی چالیں چلے گا۔ شام باہو نے میری رائے سے  
اتفاق کیا۔ کویتا اس دوران میں کچھ نہیں بولی یہ باتیں  
اس کے کرنے اور سوچنے کی تھیں بھی نہیں، ایسے مواقع پر  
عموماً وہ خاموش ہی رہتی تھی اس کا جو بھی تعلق اور واسطہ تھا  
مجھے ایک تھا وہ کسی متعین حد سے تجاوز نہیں کرتی تھی۔

اس کے بعد میں نے شام باہو اور عادل کو حکومت  
کے دوسرے دعویداروں سے آگاہ کر دیا اور بھگوتی کے  
بارے میں بھی کچھ نہیں چھپایا اسی دوران میں رابرٹ  
ہیم کا ذکر بھی آ گیا اس پر عادل نے کہا۔ وہ شاید یہاں  
رکا نہیں ہوگا بھگوتی سے مل کر میسرور چلا گیا ہوگا۔

مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ شام باہو کے  
چہرے سے ابھرنے والا ہونے لگی۔  
کیا۔ میں نے پوچھا۔

بھگوتی کو اس نے اپنا صحیح نام کیوں بتایا۔ یہ حیثیت  
انگریز افسرہ کوئی بھی فرضی نام بنا سکتا تھا رابرٹ ہیم ایسے  
لوگ اچھے غافل نہیں ہوتے۔ شام باہو نے جواب دیا۔

ہاں یہ ایک نکتہ ضرور قابل غور ہے۔ میں نے  
اعتراف کیا۔ اسے خود یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔  
یہ کام تو وہ اپنے کسی بھی ایجنٹ سے لے سکتا تھا۔

عادل نے بھی مجھ سے اتفاق کیا اور بولا۔ کماری لگتا ہے  
کہ رابرٹ ہیم نے آپ کو الجھانے کے لئے یہ شوشہ چھوڑا  
ہے کہ آپ اس کی تلاش میں میسرور کا رخ نہ کریں۔

مجھے فی الحال میسرور جانے کی کیا ضرورت ہے میرا  
اصل شکار ڈیان تو یہیں کوڈگ میں ہے۔  
پھر میں خاموش ہو گئی اور حریف گفتگو نہیں کی۔ شام باہو

یا عادل نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ میں نے بھگوتی  
کی زبان کیسے کھلوائی۔  
وہ دن بھی میں نے رائیگاں نہیں گزارا میں نے کویتا

سے کام لیا حیا ش و ظالم راجا چک دیر کی قید میں جو

معصوم و بے گناہ لڑکیاں تھیں انہیں رہائی دلا دی۔ ایسا  
کرنا میرے لئے مشکل نہیں تھا راج محل میں ان  
لڑکیوں کے پاس اسرار فرار سے کھلی سی گنج مٹی کویتا کے  
ذریعے مجھے سب کچھ معلوم ہوتا رہا لنگڑے بے سودیا اور  
لڑکیوں کی نگرانی دوڑوں کی مصیبت آگئی۔

راجا چک دیر جون میں جلا ہو گیا اسی عالم میں اس  
نے اتنی کو بھی راج محل سے نکال دیا کیوں کہ وہی راج  
محل کے محافظ دستے کا نگرانی تھا چک دیر کا خیال یہ تھا  
کہ راج محل میں اس کے خلاف کوئی گہری سازش  
ہو رہی ہے جس میں اتنی بھی شامل ہو سکتا ہے۔

اتنی بہر حال وزیر دفاع بو پنا کا بھانجا تھا۔ اس پر  
سازش کا الزام یا عدم اعتماد کا اظہار معمولی بات نہیں  
تھی۔ مذکوری کے باشندے اب مکمل عام راجا چک  
دیر کے خلاف بولنے لگے۔ پہلے وہ ایسی باتیں کرتے

ہوئے ڈرتے تھے کیوں کہ ریاست پر تک برادری کی  
وجہ سے راجا کی گرفت مضبوط تھی اب اسی برادری یا  
ذات کے ایک نمایاں فرد کو راج محل سے نکال دیا گیا تھا  
اور اس کی جگہ ایک نچ ذات شخص کو دے دی گئی تھی یہ نیا

نگراں بے دینا کا خاص آدمی تھا۔  
شام ہوتے ہوتے مذکوری میں یہ افواہ گشت کرنے  
لگی کہ تک ذات کے لوگ اپنی اس بے عزتی پر خاموش

نہیں بیٹھیں گے۔ یہ بھی سنا گیا کہ ریاست کا وزیر  
دفاع بو پنا بھی اپنے عہدے سے استعفیٰ دے رہا ہے  
میں اس عرصے میں دھرم شالہ سے نہیں نکلی البتہ اس

کرنے سے کویتا کو ساتھ لے کر باہر ضرور آگئی جہاں  
عادل اور شام باہو موجود تھے۔ دھرم شالہ کے کنڈرات  
میں کئی ایسی جگہیں تھیں جہاں میں چھپی رہ سکتی تھی۔

حسب وعدہ شام کو اتنی آگیا اسے میں نے دور ہی  
سے کنڈرات کی طرف آتے دیکھ لیا تھا اور پھر میں اس  
کمرے میں آگئی تھی جس کی دیوار اور چھت سلامت

تھی میں نے محسوس کر لیا کہ اتنی کچھ فکر مند سا ہے لیکن



اس نے پہلی بات وہی کی جس کے لئے آیا تھا۔

تم نے پوچھا بھی سوای جی سے کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا زبان کوڑکی ہی بولی۔

آپ اس ریاست میں بہر حال ہماری مہمان ہیں اور سوای جی ہمارے سربراہ ہیں میزبان سے مہمان کی ملاقات ہی نہ ہو تو عجب ہی سا لگے گا سوای جی نے آپ کو آج رات کھانے پر بھی مدعو کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہلوایا ہے کہ موجودہ حالات میں اگر آپ سادھی تک نہ آنا چاہیں تو وہ خود بھی یہاں آسکتے ہیں اتنیانے مودب انداز میں اپنے سربراہ کا پیغام مجھ تک پہنچایا جس کی حقیقت سے میں باخبر ہو چکی تھی اس کا اصل نام کوری اپا تھا مگر فرزند ان کا دیری کو نہ اس نے اپنی اصلیت سے آگاہ کیا تھا نہ اصل نام بتایا تھا اتنیانے اور دوسرے نوجوانوں کو بس یہی معلوم تھا کہ اس کا اصل نام شوکار ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

لوگ اپنی اصل شخصیت چھپانے کے لئے کتنے پروے ڈالتے ہیں۔ میں نے سوچا.....! مجھے علم تھا کہ لنگ راج کے دو بھائی اور تھے سب سے بڑا راجا راجندر تھا پھر کوری اپا سب سے چھوٹا لنگ راج تھا تینوں بھائیوں میں سے دوسرے چکے تھے یعنی راجا راجندر اور لنگ راج ایک بھائی کوری اپا زندہ تھا۔ لنگ راج ایسے عیار و سفاک شخص نے اسے کس طرح زندہ چھوڑ دیا۔ یہ سوال بہر حال جواب طلب ضرور تھا، ہر چند کہ مجھے اب اس ریاست کے سیاسی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی پھر بھی کوری اپا کی دعوت قبول نہ کرنا خلاف مصلحت تھا فرزند ان کا دیری کی سمت سفر لاکھ غلط سہی میں مہمان انہی کی تھی، کچھ سوچ کر میں نے دعوت منظور کر لی۔

سوای جی کو یہاں آنے کی زحمت دینا ٹھیک نہیں۔ میں نے مزید کہا۔ یوں بھی میرے اندازے کے مطابق وہ خاصے ضعیف ہوں گے۔

جی ہاں ان کی عمر اسی سال سے زیادہ ہے مگر بھگوان کی کرپا سے اب بھی سیدھے چلتے ہیں۔ اتنیانے بتایا پھر خود ہی کہنے لگا۔ راجا راجندر کی سادھی کے ساتھ ہی سادھو سنتوں اور پوجا کرنے والوں کے لئے کسی زمانے میں پختہ کمرے بنوائے گئے تھے جو راج کرتا ہے واصل جتنا (عوام) اسی کو مانتی جانتی ہے گزر جانے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا سنا ہے کہ جب تک راجا راجندر کی پتری (لڑکی) دستو جی راج سنگھان پر براجمان رہیں تو سادھی پر پوجا ہوتی رہی پھر جب انہیں ملی چڑھا دیا گیا تو پوجا بند ہو گئی سادھو سنتوں نے بھی وہاں سے ڈیرے اٹھا لیے اس کے بعد جب سوای جی یہاں آئے اور انہوں نے رفتہ رفتہ ہمارے دل جیت لئے تو ایک بار پھر سادھی آباد ہو گئی سوای جی نے راجا راجندر کی سادھی پر رہنے کا فیصلہ کیا تھا بعد میں جب سوای جی کو ہم نے اپنی تنظیم کا سربراہ بنایا تو سادھو سنتوں کے ہمیں میں ہمارے کارکن وہاں رہنے لگے جواب بھی وہیں رہتے ہیں اس طرح سوای جی کی حفاظت بھی ہوتی رہتی ہے سوای جی اپنے ایک خاص چیلے کے ساتھ دو کمروں میں رہتے ہیں ان کمروں کے درمیان ایک بڑا دروازہ ہے جسے کھول لیا جائے تو دو کمرے کا ایک کمرہ بن جاتا ہے سوای جی کا چیلہ کیوں کہ سنیا سی ہے اس لئے مستقل طور پر سوای جی کے ساتھ نہیں رہتا سوای جی کو بھگوان نے ایسی شکتی (طاقت) دی ہے کہ وہ اگلے پچھلے سب زمانوں کا حال بتا دیتے ہیں ہماری تنظیم میں بھی ان کے بہت سے چیلے بن گئے ہیں۔

تو گیری اپا نے بھی اپنے گرد روحانیت کا حصار کھینچ رکھا ہے میں نے اتنیانے کی بات سن کر سوچا یہی حربہ بھگوانی نے بھی آزمایا تھا میرے لئے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ محروم اور ان پڑھ لوگ بہت جلد ایسے جعلی افراد کی باتوں میں آ جاتے ہیں سچ کی آڑ میں جھوٹ

لی تو بولا جاتا ہے یہ شخصیں ہر ایک کے بس کی تو نہیں راجی دراصل کہاں ہے اور اندھیرا کدھر۔ سوای جی خاص سنیا سی چیلے کے بارے میں بھی میں نے ارادہ کر لیا کہ وہ انہی کا بیٹا دیرنا ہوگا جسے وہ ریاست کی مسند حکومت پر دیکھنا چاہتے ہیں۔

ابھی میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ شیا م بابو نے دستو جی کی چڑھائے جانے کے متعلق پوچھ لیا۔

اتنیانے بتایا۔ سوای جی نے اپنی شکتی سے کام لے کر ہمیں اس واقعہ کی تفصیل سے آگاہ کیا تھا یہ کہ راج محل میں ایک بڑا عہدیدار سنیا بھی تھا دستو جی سے لہا عمر میں دو سال بڑا ہوگا۔ سنیا اور دستو جی کے مہمان راجا راجندر کے زمانے ہی سے پیار کی ڈوری تھی جب دستو جی نے حکومت سنیا کی تو سنیا مارا گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ غلطی سے کسی سپاہی کی گولی لہا کو لگ گئی اور اس سپاہی کو دوسرے سپاہیوں نے موقع ہی پر مار ڈالا، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ راج گمرانے ہی کے لوگوں نے بدنامی سے بچانے کے لئے سنیا کو مرادیا جو بھی ہو بات کھل نہ سکی دستو جی کو ان پر بڑا رنج ہوا اور انہوں نے راج پاٹ میں دلچسپی لے کر چھوڑ دیا۔ دستو جی کو ان کے چچاؤں نے سبھایا اور ایک نالک سے ان کی شادی کر دی پھر بھی وہ خوشی سے ناروا حکومت نہیں چلا رہی تھیں اسی وجہ سے ریاست کا سارا نظام بگڑ رہا تھا جو بھی جس کے جی میں آتا سو کرتا ایک طرف تو حکومت کے مسائل دوسری جانب دستو جی کا ذاتی دکھ انہی کے سچے جیسے پس جابری تھیں اب وہ ماں بننے والی تھیں تو ریاست کے معاملات ہی پیچیدہ شکل اختیار کر گئے معلوم نہیں راج گمرانے میں سے کس نے دستو جی کے ذہن میں یہ بات بٹھادی کہ وہ عورت جو ماں بننے والی ہو اگر بھیرو کی جینٹ بڑھادی جائے تو ریاست کے حالات درست ہ جائیں گے اس کے لئے ایسی عورت کا تعلق راج

گمرانے سے ہونا ضروری ہے دستو جی کا دل تو پہلے ہی ٹوٹا ہوا تھا سودہ خود اپنی ملی (قربانی) دینے پر آمادہ ہو گئیں ایک رات انہوں نے بھیرو کی سوری کے سامنے اپنے دل میں خنجر اتار لیا۔ دستو جی کی قربانی کے بعد ان کے شوہر بھی پر اسرار طور پر جانے کہاں غائب ہو گئے۔

اقدار کی کشش اور ہوس میں یہی سب کچھ ہوتا ہے خون کے رشتوں کو بھی لوگ فراموش کر دیتے ہیں میرے خیال میں دستو نے قربانی نہیں دی تھی بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا نہ صرف اسے بلکہ اس بچے کو بھی راستے سے ہٹا دیا گیا تھا جس کی وہ ماں بننے والی تھی یوں چک دیر کے عالم باپ نے اپنے سب سے بڑے بھائی راجندر کی توسل ہی ختم کر دی تھی رہا دوسرا بھائی کوری اپا تو جانے کیسے چھوٹے بھائی کی گرفت سے بچ گیا تھا اور اب تک زندہ تھا جو کچھ بھی ہوا اس میں کوری اپا قطعاً بے گناہ نہیں ہو سکتا میں نے سوچا اگر ایسا نہ ہوتا تو یوں یہ آسانی دستو کو راستے سے نہ ہٹایا جاسکتا میں نے یہ سوچا تو ضرور مگر اس کا اظہار نہیں کیا اتنیانے کے سامنے کچھ کہنے سے حاصل بھی کیا تھا اس سے تو مجھے کچھ اور باتیں کرنا تھیں۔

یہ بتاؤ اتنیانے کہ راج محل سے تمہارے نکالے جانے کا رد عمل یو پٹا جی پر کیا ہے۔ ظاہر ہے وہ تمہارے ماما ہیں انہیں یہ بتانا کہ گوار گزری ہوگی کیا یہ درست ہے کہ وہ وزارت سے استعفیٰ دے رہے ہیں۔ میں نے سوال کیا۔ خلاف توقع اتنیانے چہرے سے انتہائی حیرانی کا اظہار ہوا پھر اس نے جواب دیا۔ ماما نے پہلے یہی فیصلہ کیا تھا مگر بعد میں بدل دیا انہیں۔

راج محل میں رانی گورمانے بلایا ہوگا۔ میں بول اٹھی۔ جی..... کماری جی۔ اتنیانے حیرت زدہ ہو کر بولا۔ رانی ماں سے مل کر آنے پر ہی ماما نے استعفیٰ نہیں دیا ان کے ساتھ پنڈت کشی نارائن بھی رانی ماں سے ملے تھے، پنڈت جی ہی نے براداری سے کام لے کر



یہ معاملہ دفع دفع کر دیا اور نہ جانے کیا ہوتا لیکن برائے  
ماتیں کماری جی تو میں کچھ پوچھ لوں، اس بے ادبی کی  
پہلے ہی معافی۔

ہاں ہاں ضرور پوچھو جو پوچھتا ہے میں برا نہیں مانتی۔  
آپ کے علم میں یہ ساری باتیں کیسے آئیں۔ میری  
اطلاع کے مطابق تو آپ اس کنڈر کی حدود سے نکلتی ہی  
نہیں، صرف آج صبح ہی صبح بھگوتی کے آشرم تک ضرور  
گئی تھیں۔

میں مسکرا دی۔ تمہاری تنظیم کے جوارکان بھی ہماری  
حفاظت کی خاطر ہمیں بدل کے اس دھرم شالہ کی نگرانی  
کر رہے ہیں ان کی نظر میں آئے بغیر بھی یہاں سے  
نکلا جاسکتا ہے۔

اس پر احمیا نے طویل سانس لیا اور بولا۔ تو وہ لوگ  
آپ کی نظر میں آ گئے۔

ہاں۔ میں نے جواب میں کہا اور میرا جواب غلط نہیں  
تھا۔ صبح جب میں بھگوتی سے ملنے گئی تھی یہ بات محسوس  
کر لی تھی اور یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ کنڈرات کی نگرانی  
کرنے والوں کا تعلق فرزند ان کا دیری سے ہوگا ان  
کے سوا وہاں ہماری موجودگی کا علم اور تھا بھی کسے، چند  
لمحے توقف کے بعد میں نے احمیا سے دریافت کیا۔  
راج محل سے لڑکیوں کی پراسرار گمشدگی یا فرار کے بعد  
کیا راجا چک ویر نے امرتا تھ کے مندر میں قیام پذیر  
ہوئے مہاراج چندرموہن سے رابطہ قائم نہیں کیا۔  
ہوئے مہاراج تو ترنت مفرد لڑکیوں کا سراغ لگا لیتے  
۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بڑی ہلکی شالی اور گئی ہیں۔

یہ تو خیر بڑے مہاراج کے بارے میں آپ نے  
ٹھیک ہی سنا ہے ان کے کئی چنکار تو خود میں نے بھی  
اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ احمیا کے لہجے سے  
عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا میں پہلے ہی یہ اندازہ لگا چکی  
تھی اس لئے اپنے دشمن کا ذکر احمیا کے سامنے ذرا  
ادب سے کیا تھا جو لوگ ایسے افراد کو بھی پراسرار قوتوں

کا مالک سمجھ لیتے تھے جن کے پاس کوئی  
تھی اور محض زمانہ ساز تھے وہ چندرموہن اپنے  
کے گردیدہ کس طرح نہبتے چندرموہن تو واقعی  
شیطانی قوتوں کا مالک تھا اب احمیا میری ہا  
جواب میں کہہ رہا تھا۔ راجا جی نے اس واقعہ  
بعد سودنیاتی کو بڑے مہاراج کے پاس امرتا  
کے مندر بھیجا تھا مگر بات نہیں بنی بڑے مہاراج  
میں بیٹھے تھے اور چاب کے دوران میں وہ کسی  
بات نہیں کرتے۔

مجھے احمیا سے جو معلوم کرنا تھا وہ معلوم ہو گیا تھا  
اور حیران بھی پھیل چکا تھا اس لئے سوای جی سے ملنے  
ہو گئی کوئٹا کو میں نے مخصوص اشارہ کر دیا تھا کہ آتا  
اور شام باؤ کو وہیں چھوڑ کر میں تن تھا احمیا کے ساتھ  
وکی تھی۔

کنڈرات کی حدود ہی میں احمیا سے میں نے  
اب تو تمہاری یہ آرزو پوری ہو جائے گی کہ تم اپنی  
کے لئے سارا وقت دے سکو پہلے تو تمہیں سوای جی  
راج محل کا عہدہ چھوڑنے سے منع کر دیا تھا اب  
جی کیا کہتے ہیں۔ میرے پاس آنے سے پہلے تمہارا  
ملاقات تو ہوئی ہوگی ان سے۔

جی ہاں سوای جی سے مل کر آپ کے پاس آ جاؤں گا  
وہ کہہ رہے تھے کہ راج محل کی اندرونی خبریں جا  
کے لئے کوئی اور بندوبست کرنا پڑے گا۔

پھر میں نے احمیا سے کوئی بات نہیں کی ہم کنڈرات  
کی حدود سے نکل آئے تھے۔

راجا چندر کی سادھی بھی شہری آبادی سے خاصی دور  
مغرب میں تھی راستے میں کسی شخص سے نہ بھیڑ نہیں  
ہوئی یوں بھی میرے قیاس کے مطابق احمیا مجھے اپنے  
راستوں سے لے کر آیا تھا کہ کوئی ہمیں نہ دیکھ سکے دور ہی  
سے سادھی نظر آ گئی جہاں روشنی تھی سادھی کی ایک جانب  
گھٹا جنگل تھا اور ہم اسی جنگل سے گزر کر وہاں پہنچے تھے۔

اپنا حبابے کے باوجود بارعب نظر آیا۔ اس کا  
واکین سفید دھوئی باغیچے ہوئے تھارنگ  
کے باشندوں کی طرح سہا نولا اور چہرہ لیو ترا  
میں گئے سفید بال تھے اور چہرے پر بھی گھٹی داڑھی  
تھیں، آنکھیں چھوٹی مگر روشن تھیں۔ وہ بڑے  
سے ملا میں نے بھی یہ ظاہر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا  
کے خاص کرے میں دردی پریشانی تھی میرے علاوہ  
مزید چند افراد بھی وہاں موجود تھے۔

لڑکھو کے بعد کھانا لگایا گیا مجھے دیکھ کر حیرت نہیں  
گمانے میں گوشت بھی تھا۔ ہندوستان آ کر  
میں ہندوؤں سے میرا سا جہ پڑ چکا تھا جو گوشت  
کھانے میں نے ایسے بھی ہندو دیکھے تھے جنہوں نے  
کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ کھانا بس گوارا ہی تھا۔  
اور جنوبی ہند کے کھانوں میں زمین آسمان کا فرق  
اچھا طور پر مجھے شمالی ہند کے کھانے خوش ذائقہ اور  
معلوم ہوتے تھے میں کیوں کہ سوای جی سے  
میں نے کھانا کھا رہی تھی اس لئے ایک بار اس کی  
اب جگہ کے آہستہ سے بولی۔ آپ تنہائی میں بھی  
لہذا بات کرنے کا موقع دیں تو خوشی ہوگی۔

میں نے اس نے بھی دھیمی آواز میں جواب دیا۔  
سب کھانا کھا چکے تو کڑی اپا مجھے اپنے ساتھ برابر  
لے کرے میں لے آیا اور میانی دروازہ بھی اس نے  
کھلوا دیا تھا۔

کوئی ایسی بات ہوگی جس کے لئے تنہائی ضروری  
ہو۔ دردی پر میرے قریب آ کر بیٹھے ہوئے بولا۔  
میں نے اسی لیے بیچ کا ہوا تھوڑا بھی لگا دیا۔

اس کرے میں شاید دیر نکلتی رہتے ہیں وہ تو نہیں  
اپا نہیں کے اس سے۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر  
نہ خیر لہجہ میں کہا۔

کڑی اپا کے لئے میرے الفاظ کسی دھماکے سے کم  
نہیں تھے وہ ایک دم اچھپ پڑا، اس کی تیاریوں پر مل پڑ

مجھے پھر میں نے اس کے دائیں ہاتھ کو تیزی سے حرکت  
کرتے دیکھا دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں  
خطرناک کھلونا نظر آ رہا تھا یہ ریو اور یقیناً اس نے اپنی  
دھوئی میں اس رکھا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے کسی  
ایسے ہی شدید رد عمل کی توقع تھی۔

کون ہوا۔ اور دیرنا کو کیسے جانتی ہو۔ بوڑھے کڑی اپا  
کے لہجے میں سفاکی تھی، ریو اور کی نال میری طرف اٹھی  
ہوئی تھی۔

میں تو اور بھی بہت کچھ جانتی ہوں کڑی اپا جی۔  
تم۔۔۔ تم اگر مجھے بھی جانتی ہو تو۔۔۔ تو پھر تمہیں زندہ  
نہیں رہنا چاہیے۔ اس نے ریو اور کو مخصوص انداز میں  
میرے سینے کا نشانہ لینے کے لئے سیدھا کیا۔

میں اسی لمحے ریو اور اس کے ہاتھ سے نکل کر فضا میں  
بلند ہوتا چلا گیا اور پھر ایک خاص بلندی پر رک کر ریو اور کی  
نال کا رخ بدل گیا اب کڑی اپا ریو اور کی زد پر تھا اور پھٹی  
پھٹی آنکھوں سے ریو اور کی طرف دیکھ رہا تھا اس کا منہ  
بھی حیرت کی زیادتی کے سبب کھلا رہا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر مجھے واقعی ہنسی آ گئی پھر میں نے  
اسے مخاطب کیا۔ پتا منہ تو بند کر لیں کڑی اپا جی ورنہ کسی  
کھس جائے گی۔

وہ اس طرح چونک اٹھا جیسے سوتے سوتے جاگا ہو  
ایک جھٹکے سے اس کا منہ بند ہو گیا تھا۔

یہ ریو اور اس وقت تک آگ نہیں اگلے گا جب تک  
میں اشارہ نہ کروں اس لئے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔  
میں پر سکون آواز میں بولی۔ آپ کو یہ زیب نہیں دیتا  
کہ ایک مہمان پر ریو اور تان لیں، پر آپ بھی کیا  
کریں، ہیں تو تنگ راج کے بھائی۔

یہ۔۔۔ یہ کک۔۔۔ کیسے۔۔۔ کس طرح ہو گیا۔ کڑی اپا  
نے ریو اور کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا، اس طرح کہ  
ریو اور میرا کہنا مانا ہے۔ آپ کو تو اس پر حیران نہیں  
ہونا چاہئے فرزند ان کا دیری تو آپ کو بھی پراسرار



لوگوں کا مالک مانتے اور جانتے ہیں۔

تم..... تم..... تم..... اگر میری اصلیت جانتی ہو تو.....  
یہ..... یہ بھی جانتی ہوگی کہ..... کہ میرے پاس کوئی.....  
کوئی ہلکی نہیں۔

ہاں معلوم ہے کری اپاجی اور یہ بھی خبر ہے کہ آپ نے  
یہ ڈھونگ اپنی شخصیت چھپانے کے لئے رچا ہے۔  
تو پھر..... پھر تم شخصیت چھپانے کی وجہ بھی  
جان..... جانتی ہوگی۔

بالکل جانتی ہوں۔ آپ کو راجا چک ویر یعنی اپنے  
بھتیجے کی طرف سے جان کا خطرہ ہے اگر اسے پتا چل گیا  
کہ سوامی جی کے ہمیں میں اس کا تیا کریا ہے تو وہ  
آپ کو قتل کرانے میں لمحے بھر کی تاخیر بھی نہیں کرے گا  
ایسا ہی وہ تمہارے بیٹے ویرنا کے ساتھ کرے گا جو بہ  
ظاہر تمہارا خاص چیلہ اور سنیا سی بنا پھرتا ہے وہی ویرنا  
جسے تم اس ریاست کا حکمران دیکھنا چاہتے ہو۔ میں  
بات کرتے کرتے آپ سے تم پر اثر آئی اب اس  
بوڑھے کا احترام تجھ پر واجب نہیں رہا تھا جو چند لمحے  
پہلے مجھے قتل کرنے والا تھا اگر میں کویتا کو اپنے ساتھ  
آنے کا مخصوص اشارہ نہ کرتی تو شاید وہ بوڑھا مجھے ٹھنڈا  
کر چکا ہوتا بعد میں وہ اپنے معتقدوں کو کوئی بھی کہانی سنا  
کے مطمئن کر سکتا تھا مثلاً یہی کہ میں نے اس پر قاتلانہ حملہ  
کیا تھا اس بوڑھے کی بات کو بھلا کون جھٹلاتا۔

تم خطرناک حد تک باخبر ہو بوڑھا کری اپا اب غالباً  
اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔

اسی لئے تم مجھے سوچے سمجھے بغیر قتل کر دینا چاہتے  
تھے..... اب اگر میں تمہیں گولی مار دوں تو۔

تو تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاسکوگی۔  
دمکی دے رہے ہو مجھے۔

نہیں یہ حقیقت ہے میرے معتقد مجھ سے ایسی ہی  
عقیدت رکھتے ہیں۔

اور اگر میں انہیں تمہارا اصل چہرہ دکھا دوں۔

اس سے تمہیں کیا مل جائے گا۔ کیا تم ایک  
ظالم و جبر کو سچ سمجھتی ہو۔ کیا کسی حقدار کو اس کا  
ملنا چاہیے۔ اس کا لہجہ پراثر تھا۔

کیسا حق۔ کس کا حق۔ تم احمقوں کی جنت میں  
اپا، مجھ پر تمہاری جادو بیانی نہیں چلے گی، کیا وہ  
نہیں ہوا۔ اور کیا ظلم کرنے والوں میں تم شا  
تھے۔ کیا لنگ راج نے تمہیں اعتماد میں لئے بہ  
راستے سے ہٹا دیا۔ میری آواز تیز ہوتی گئی۔

وہ..... وہ اس نے..... دستوں نے تو خود ہی اپنی بلی  
جھوٹ بولتے ہوئے تم ہکھلانے کیوں گے  
گردن کیوں جھک گئی تمہاری..... سنو تم اس  
میں جھٹلانہ رہو کہ حقدار صرف تمہارا ہی بیٹا ہے اور  
ذہن سے اس خیال کو بھی جھٹک دو کہ تمہاری اصا  
سے کوئی واقف نہیں۔

نن..... نہیں مجھے..... مجھے کوئی..... کوئی نہیں  
کہ میں کون ہوں۔

پھر میں کس طرح جان گئی۔

تم..... تم پر اسرار تو لوں کی مالک ہو۔

میری بات چھوڑو کری اپا، نہ کیری میں ایک اور ہستی  
موجود ہے جو تمہیں اور تمہارے بیٹے کو پہچان چکی  
کون..... وہ کون ہے۔

یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گی، ہاں یہ ضرور بتا سکتی  
کہ اسے بھی تمہاری طرح اپنی جان کا خطرہ ہے ا  
کے بارے میں راجا چک ویر کو ظلم ہو گیا تو اسے بھی  
جہیں چھوڑا جائے گا وہ تم خود سمجھ سکتے ہو یا  
حکمرانی کے حق کا دعویٰ اسے بھی ہے۔

غلط ہے اس کا دعویٰ، وہ چاہے کوئی بھی ہو  
کری اپا نے فیصلہ کن سچے میں کہا۔

یہ تم کہہ رہے ہو دوسرے تو تمہارا یہ دعویٰ تسلیم  
کریں گے۔

کیسے تسلیم نہیں کریں گے۔ ہم تین ہی بھائی تھے

کی سل حتم ہوئی دوسرے کا بیٹا حکمران ہے اور تیسرا  
بھائی میں ہوں پھر حکمرانی کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔

پر جوش ہونے کی ضرورت نہیں کری اپا نہ میں اس  
طرح تمہارے دعوے کو غلط ثابت کرنے کے لئے کچھ  
بتاؤں گی سنو ماضی کبھی واپس نہیں آتا اور تم اسی خام  
خیال میں جھٹلاؤ تم نے اپنے بوڑھے بھائی راجا راجندر کو  
جو دھن دیا تھا کہ اس کی بیٹی دستو کے وقادار ہو گے سو  
اس عہد پر قائم نہیں رہے لنگ راج کی سازش کا شکار تم  
بھی ہو گئے بولو کری اپا کیا ایسا نہیں ہوا۔ کیا تم نے اپنے  
مرحوم بھائی کے ساتھ کیا ہوا عہد نہیں توڑا۔

ہاں..... کری اپا جیسے خود کھائی میں جھٹلاتا۔ مجھ سے  
یہ پاپ (گناہ) ہوا اور اسی کو دھونے کے لئے اب بھی  
اپنے بھائی کی سادگی پر پڑا ہوں لنگ راج نے مجھ سے  
دھوکا کیا وہ اپنے وچن سے پھر گیا کہ دستو راستے سے  
ہٹ گئی تو ہم دونوں بھائی ریاست کو آدھا آدھا بانٹ  
لیں گے اس لڑکی دستو کی وجہ سے راج گھرانے کی بھی تو  
بدنامی ہو رہی تھی کبھی پہلے راج گھرانے کی کسی کنینا نے  
پھیروں سے پہلے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا پر  
دستو نے یہ جرم کیا اور اپنی سزا کو پہنچ گئی۔

محبت کو تم لوگ جرم کہتے ہو..... اگر دستو کی شادی تمہارا  
سے ہی ہو جاتی تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑتا۔

بوڑھا کری اپا ایک بار پھر چونک اٹھا وہ جیسے کہیں  
بہت دور نکل گیا تھا میں نے قریب ہی موجود کویتا کے  
نادیدہ وجود کی طرف ہاتھ بڑھایا اس نے ریوالور مجھے  
تھما دیا، ریوالور کے چیمبر سے گولیاں نکال کر میں نے ایک  
طرف پھینک دیں اور اسے کری اپا کے سامنے ڈال دیا۔

اسے اٹھا لو کری اپا۔ میں نے پھر مخاطب کیا۔

اس نے کچھ کہے بغیر ریوالور اٹھایا اور کمر کے پاس  
ازس لیا معلوم نہیں کیوں اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوا  
جیسے کری اپا کی تپتی ہوئی کمر جھک گئی ہو اس کے چہرے  
کی جھریوں میں اضافہ ہو گیا ہو وہ جیسے ایک دم اور بھی

بوڑھا ہو گیا ہو میرا یہ اندازہ بعد میں غلط ثابت نہیں ہوا۔  
کری اپا تم جن لوگوں کو اپنی مدد کے لئے پکار رہے ہو  
جن سے اپنے حق کے لئے مراست گم رہے ہو انہیں تم  
نہیں جانتے۔ میں نے گویا آخری ضرب لگائی۔ وہ غیر ملکی  
تمہیں تمہارا حق دلانے کی بجائے اس ریاست پر خود  
قبضہ کر لیں گے۔

جب تک کری اپا اور اس کا بیٹا ویرنا زندہ ہے  
انگلیری راج گھرانے کے سوا کوئی کوڑک پر قبضہ نہیں  
کر سکتا۔ بوڑھا ایک بار پھر پر جوش نظر آنے لگا۔

تم میں یا تمہارے بیٹے میں اتنی ہی اہمیت ہوتی تم اتنے  
ہی بہادر ہوتے تو یوں چھپ کر ٹھکیری میں نہ رہتے.....  
صرف تم اور تمہارا بیٹا تو راجا چک ویر کا مقابلہ نہیں کر سکتے  
پھر ان غیر ملکی غاصبوں کے بڑھتے ہوئے قدم کیسے روک  
لو گے جنہوں نے حیدر آباد وکن اور اس خطے کے سوا  
سارے ہندوستان کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔

لیکن وہ..... وہ ایسا کیوں کرنے لگے۔ ان کے پاس  
زمین کی کیا کمی ہے۔

زمین کی کمی نہیں تھی تو انہوں نے جنوبی ہند کی دوسری  
ریاستوں پر اپنا پرچم کیوں لہرا دیا۔

کری اپا کے پاس میرے اس سوال کا شاید کوئی  
جواب نہیں تھا اس لئے وہ خاموش ہی رہا۔

ہوں..... مزید کی ہوں..... اقتدار و حکومت کی ہوں  
یہی ہوں تو انہیں سمندر پار سے یہاں لائی ہے۔

اگر..... اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہہ رہی ہو تو.....  
تو پھر چک ویر جیسا بھی برا بھلا ہے مجھے قبول ہے

وہی..... اگر وہ بھی حکمران رہتا ہے تو حکومت ہمارے  
ہی خاندان میں رہے گی۔ بوڑھے کری اپا کا انداز گفتگو

پھر ایسا ہو گیا جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

کری اپا یہ بھی تم خود کو قریب ہی دے رہے ہو، سنو  
کری اپا ظلم کوئی بھی کرے اور اس پر کتنے ہی پردے

ڈال دے ظالم کبھی پچتا نہیں ساری دنیا سے بچ جائے







کیا۔ اب کویتا کا انتظار نہ کرو لوٹ کر نہیں آئے گی۔ آج ہی شام اس پر سے میں نے اپنی نظر ہٹائی تھی کہ وہ دھوکے میں آ جائے دیکھ لے کہ وہ دھوکا کھا گئی اور تو جوتی سیانی بن رہی تھی تیرا بھی سیان پن دھرا کا دھرا رہ گیا، میرے چیلے اس وقت کویتا کے جسم کی ایک ایک پونی کاٹ رہے ہیں اور وہ چیخ رہی ہے زندگی کی بھیک مانگ رہی ہے اور کبھی موت۔ اسے بے ہوش بھی نہیں ہونے دیا جا رہا ہوش کھو بیٹھے گی تو پھر سزا کا کیا فائدہ تجھے سنو اتا ہوں اسکی بھیا تک چھینیں جس کی آڑ میں تو اتنے دن سے چھپی ہوئی تھی سن اگر تجھ میں سننے کی تاب ہے۔ وہ تجھے مدد کے لئے پکار رہی ہے۔ چل تو بھی چل کب تک مجھ سے بچی بچی پھرتی رہے گی۔

چندر موہن کے الفاظ کے ساتھ ہی روشنی بجھ گئی، اسی کے ساتھ میرے سارے جسم میں بجلیاں سی دوڑنے لگیں پھر مجھے واقعی کویتا کی چھین سنائی دینے لگیں۔ دیوی..... دیوی مجھے بچالو دیوی۔ چیختے ہوئے وہ فریاد کر رہی تھی۔

میں آ رہی ہوں کویتا آ رہی ہوں۔ میں بھی جوابا چینی اور مجھے خود اپنی ہی آواز جھنسی سی لگی۔

کویتا کی دردناک چھین جیسے میرے وجود کو دو نیم کئے دے رہی تھیں میں اپنے انجام سے بے پروا ہو کر کھنڈرات سے نکل کے اس راستے پر دوڑی چلی جا رہی تھی جو پتھر ملی میڑھیوں تک جاتا تھا۔ مجھے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا میں شاید اپنے حواس میں نہیں تھی۔

تیزی سے میڑھیاں چڑھتے ہوئے ان کے اختتام پر میری نظر پڑی اس وقت چاند بادلوں سے نکل آیا تھا مجھے وہاں چندر موہن کھڑا دکھائی دیا۔

آ جا..... آ جا معبلہ، تیرا شیدائی، تیرا چندر موہن یہاں تیرے ہی سوا گت کو کھڑا ہے۔ اس غبیٹ نے یوں اپنے دونوں ہاتھ آ کے بڑھائے جیسے مجھے اپنی بانہوں کے حلقے میں لینا چاہتا ہو اس کے بائیں جانب ذرا فاصلے پر مندر

کا کلس نظر آ رہا تھا اور دائیں جانب مندر کا وہ احاطہ جس میں غالباً پجاریوں کی سکونت کے لئے چھوٹے بڑے کمرے بنائے گئے تھے چاندنی میں مجھے سارا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا، اس وقت چندر موہن کے گرد کوئی بھی حصار نہیں تھا۔

چندر موہن! میں چوڑے پھل والا وہ تیر ہوں جو تیرے سینے میں تر اڑ رہا ہوں والا ہے مت بھول کہ میرا نام معبلہ ہے۔ میڑھیاں چڑھتے ہوئے میں چینی۔

یہی تو میری آرزو ہے معبلہ..... تو کسی تیر ہی کی طرح تو اس دل میں کبھی ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر وہ بے غیرتی سے ہنسا۔

میرے رگ و پے میں بجلیوں کی گردش اپنی انتہا کو پہنچنے لگی چندر موہن اور میرے درمیان اب صرف چند میڑھیوں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

معا چندر موہن پلٹا اور پھر مڑ کے مجھے سے بولا۔ آ میرے پیچھے پیچھے آ..... میں نے آج تیرے لئے اپنی خواب گاہ کو سجایا ہے مجھے یقین تھا معبلہ کو آج تو ضرور آئے گی ملن کی گھڑی آئی گئی تا اسی کے لئے تو میں نے ایک ایک دن گنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چند

موہن کے جسم کو فضا میں بلند ہوتے ہوئے رکھا۔ گویا تیزی سے اڑتا ہوا مندر کے اقامتی حصے کی طرف جا رہا تھا اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔

میڑھیاں چڑھ کر میں اس کی طرف دوڑی اسی لئے بجلیوں کی گردش میری دونوں آنکھوں میں مرکوز ہو گئی۔

آج فیملے کا دن ہے چندر موہن تو اپنی تقدیر سے کہاں تک بھاگے گا۔ میں نے جست بھری۔

نہیں۔ چندر موہن خوفزدہ آواز میں چیخا اور پھر اس جسم فضا میں ادھر سے ادھر ڈولنے لگا۔

میری آنکھوں سے موت کی روشنی نکل رہی تھی اور چندر موہن اس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے ساتھ اس کا جسم فضا سے نیچے کی طرف آتا جا رہا تھا۔

جدھر میری نظر پڑتی پھر پھیلنے لگتے، پتھروں سے ہوا اقامتی حصہ موسم کی طرح پکھل کر پہاڑ کی ایک

جانب بہنے لگا پھر مجھے ایک اور ہولناک منظر دکھائی دیا چندر موہن کے دونوں ہاتھ پتھروں کے بہتے ہوئے لاوے سے ٹکرائے اور وہ بری طرح چیخا۔ درگا.....

درگا۔ میرے وجود میں بجلیوں کی گردش چند ہی لمحے پہلے ختم ہو چکی تھی۔ موت کی روشنی میری آنکھوں میں سما چکی تھی مگر سنسناہٹ ابھی باقی تھی۔ اچانک اس کے جسم کو میں نے دوبارہ اٹھتے دیکھا۔ گھٹنوں تک اس کے دونوں ہاتھ غائب تھے دوسرے ہی لمحے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا اسی وقت میری سماعت سے ایک بار پھر کویتا کی درد بھری چیخ ٹکرائی۔

کویتا کی چیخ مندر کی طرف سے آئی تھی میں ادھر دوڑی۔ مندر سے پہلے ہی مجھے میڑھیاں نظر آئیں جو کہیں نیچے پہاڑ کے اندر جا رہی تھیں، چیخ پھر سنائی دی اور میری سمت سفر کا تعین کر گئی۔

میں تیزی کے ساتھ زینہ اترتی چلی گئی۔ اندر اندر میرا نہیں تھا مستونوں کے اندر بے ہوئے طاقوں میں ویسے چل رہے تھے۔

بہت جلد میں اس والان تک جا پہنچی جہاں ایک ستون سے کویتا بندھی ہوئی تھی اور دو جٹا دھاری سادھو اپنے ہاتھوں میں چھریاں لئے کویتا کے جسم سے گوشت کے پارچے اتارنے میں مصروف تھے وہ لہو لہان تھی چیخ جا رہی تھی مگر دونوں سادھو جیسے بہرے ہو گئے تھے وہ اس طرح درد کی کا وہ کھیل کھیلے جا رہے تھے گویا اس کے سوا انہیں دنیا میں اور کوئی کام نہ ہو میرے قدموں کی دھمک غالباً ان میں سے ایک نے سن لی اور غرا کر پلٹا۔

اس لمحے مجھے سادھو کا چہرہ غیر انسانی سا محسوس ہوا وہ آدمی کی بجائے کسی درندے کا چہرہ تھا اس کے دونوں ہاتھ خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ گیر والبادے پر بھی ٹون کے دھبے تھے اور دونوں آنکھوں کی جگہ جیسے انگارے دکھ رہے تھے فرش پر بھی خون پھیلا ہوا تھا۔

کون ہے تو کہ جس نے ہماری شانتی بھنگ کر دی۔

سادھو نے چھری فضا میں بلند کی اور میری طرف لپکا کر مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔

فرش پر پھیلے ہوئے خون کو وہ شاید بھول گیا تھا اور یہی بھول اس کے لئے مہلک ثابت ہو گئی وہ پھسل کر گر گیا۔ میں اس دوران اس پر چھلانگ لگا چکی تھی اس درد سے کے ہاتھ سے چھری چھیننے میں مجھے دیر نہیں لگی پھر میں نے وہی چھری اس کی گردن پر پھیر دی۔

چند ہی لمحوں میں سب کچھ ہو گیا، سادھو کا دوسرا ساتھی مجھ تک سنبھل سنبھل کے قدم اٹھاتا ہوا پہنچا اس کی آنکھوں میں خون اتر اٹھا تھا ہاتھ میں چھری تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ دوسرا درندہ جھک کر میرا کام تمام کر دیتا میں نے چھری کی نوک کو طرف سے پکڑا اور فرش پر پڑے پڑے ہی پوری قوت سے چھری چھینکی میں نے سادھو کے سینے کو نشانہ بنایا تھا لیکن اچانک جھکنے کے سبب اس کی گردن میں آ رہا ہو گئی اس کے حلق سے خرخر کی آواز سی نکلی اور پھر جسم میرے اوپر گرنے لگا میں پلٹا کھا کے ایک طرف ہو گئی۔

جب میں فرش سے اٹھی تو میرا لباس بھی کویتا کے جسم سے بہنے والے خون میں تر ہو چکا تھا۔

دیوی.....! کویتا کی ڈوٹی آواز مجھے جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دی۔

میں نے یہ مشکل اس کے زخم زخم جسم کو ستون سے کھولا اور جہاں خون بہہ رہا تھا وہاں سے دور ایک جگہ لے آئی میں اسے لٹانا چاہتی تھی مگر اس نے میرے گلے میں بانٹیں ڈال دیں اب وہ میری آغوش میں تھی۔

مرنے سے پہلے کویتا نے رک رک کر مجھے جو کچھ بتایا اس سے حقیقت کا علم ہوا کویتا کے جسم کی بو سے چندر موہن نے اس کی موجودگی کا احساس کر لیا تھا پھر اسے جان بخشی کا فریب دے کر حصار سے باہر لے آیا تھا کویتا نے اس غلطی کا اعتراف کیا جو اس کی موت پر منتج ہوئی وہ اس لالچ میں آ گئی تھی کہ چندر موہن اسے بخشی



چپا کی جگہ اپنی دست راست بنا لے گا۔ کویتا نے جو آخری بات بتائی وہ میرے لئے سوہان روح تھی چند موہن نے میرے دشمن ڈیان کو وہاں سے گذشتہ رات ہی فرار کر دیا تھا۔

مجھے وہ بوسہ شاید زندگی بھر یاد رہے گا جو کویتا نے میری پیشانی پر لیا اور پھر اس کے نرم و گرم ہونٹ ٹھنڈے پڑ گئے۔ امرتا تھ کے مندر میں اب کیا باقی بچا تھا جو میں وہاں رکتی، بو جھل قدموں سے میں دھرم شالہ کے کھنڈرات میں واپس آ گئی۔

شیام بابو اور عادل میرے انتظار میں جاگ رہے تھے اور چراغ روشن تھا انہوں نے مجھے دیکھا تو ان کے منہ سے حیرت زدہ سی چیخیں نکل گئیں انہیں یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ شاید میں ابوہان ہو کر لوٹی ہوں۔

یہ میرا خون نہیں ایک بادقلاڑی کا قاتل اخترم خون ہے۔ میں نے ان دونوں کو کویتا کے قتل سے آگاہ کر دیا پھر بولی۔ مجھے دکھ ہے کہ کویتا کا اصل قاتل شدید زخمی ہونے کے باوجود فرار ہو گیا وہاں ان دونوں سادھوؤں کو میں نے ٹھکانے لگا دیا جو بظاہر کویتا کے قاتل تھے۔ لیکن..... لیکن کیسے..... یہ سب کیسے ہو گیا۔ عادل جذباتی ہو گیا۔

کچھ مت پوچھو مجھ سے..... کچھ نہیں۔ میں ہاتھ اٹھا کر بولی اور پھر اس طرف بڑھ گئی جدھر پانی سے بھری ایک ہالٹی اور گھڑا رکھا تھا۔

کھنڈرات میں نہا کر میں نے لباس تبدیل کیا اور پھر خون آلود لباس کو جلا دیا۔ جب وہ لباس جل رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کویتا کی چتا جل رہی ہو۔

دوسرے دن صبح میں سو کر اٹھی تو بڑی حد تک خود پر قابو پائی تھی اس کے باوجود گزری ہوئی رات کے بھیا تک مناظر میری آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔

ناشتا کرتے ہوئے میں نے خود ہی شیام بابو اور عادل کو مخاطب کیا۔ اب ہمیں بھی واپس چلنا ہے آج

رات ہی یہاں سے نکل چلیں گے۔

اور وہ ڈیان۔ عادل نے سوال کیا۔

وہ اسی رات یہاں سے فرار ہو گیا تھا جب ہم نے اس دھرم شالہ کے کھنڈرات میں قدم رکھا تھا۔ میں نے جواب دیا۔

یہ تو بہت برا ہوا۔ عادل اظہار فسوس کرنے لگا۔ اس طرح تو طویل ترین سفر قطعی رائیگاں ہوا۔

ایسا نہیں ہے میں نے اپنے ایک بڑے دشمن کو زندگی اور موت کی کشمکش میں جلا کر دیا ہے سفر رائیگاں نہیں گیا اس کے علاوہ یہاں اور بہت کچھ ہوا ہے جس سے صرف میں واقف ہوں اور..... اور وہ واقف بھی جو..... جواب

اس دنیا میں نہیں رہی۔ میری آواز بھاری ہو گئی میرا اشارہ کویتا کی طرف تھا۔ کویتا ہی تو اس راز میں میری شریک تھی کہ راجا چک ویر کی مظلوم بہن دیوہا کو قید سے کیسے رہائی ملی اور وہ مظلوم و محسوم بے گناہ لڑکیاں راجا کے رن واس سے کس طرح پراسرار طور پر فرار ہو گئیں جنہیں راجا اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھانے کے درپے تھا نیک روح کی یہ پیش گوئی غلط نہیں تھی کہ مجھے بلا سبب نہیں بھٹکایا گیا عظیم تمہن نے پہلے کب کوئی ایسی بات کی تھی جو پوری نہ ہو سکے۔

ابھی ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تھے کہ اتنیا آ گیا اس کے چہرے سے بدحواسی کا اظہار ہو رہا تھا بیٹھے ہی وہ مجھ سے مخاطب ہو گا۔ سوای جی اپنے خاص چیلے کے ساتھ نہ جانے کہاں چلے گئے انہوں نے رات کو آپ سے تو اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ میں یہی پوچھنے آیا تھا۔

اس اطلاع پر میں چونک اٹھی میں نے یہ اندازہ تو لگا لیا تھا کہ کری اپا اپنی شکست قبول کر چکا ہے مگر یہ خیال نہیں تھا وہ مذکوری سے جانے میں اتنی جلدی کرے گا۔

نہیں انہوں نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے جواب دیا۔

ساری ذمے داری وہ میرے کاندھوں پر ڈال گئے۔ اتنیا نے اس سے لہجے میں بتایا۔ بھور سے جب سوای

جی کے سیوک حسب معمول ان کی سیوا کے لئے کمرے میں پہنچے تو بستر پر ایک خط ملا، اور باتوں کے ساتھ سوای جی نے ایک عجیب سی بات خط میں لکھی ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔

وہ خط ساتھ لائے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا۔

جی ہاں۔ اتنیا نے یہ کہہ کر جیب سے خط نکالا اور مجھے دے دیا۔

میں ایک شکست خوردہ شخص کی تحریر پڑھنے لگی خط کی عبارت یہ تھی۔

میرے بیٹے سان اتنیا! جگ جگ جیو۔

میرے بجائے کل منہ اندھیرے میرے بستر پر یہ خط ملے گا مجھ سے پہلے بھی کاویری مکمل کوٹ کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے سو اب یہ پد (عہدہ) میں تمہیں

واپس کر رہا ہوں اس مان کے ساتھ کہ تم اس پر کوئی حرف نہیں آنے دو گے اب تک کی جدوجہد کے نتیجے میں مجھے پتا چلا کہ راج گھرانے کے آپسی جھگڑے

ہمارے سب سے بڑے دشمن کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں، ہم جنہیں اب تک اپنا دوست سمجھتے آ گئے ہیں وہ ہمارے اصل دشمن ہیں جان لو کہ کبھی بددلی ہمارے دوست نہیں

ہو سکتے راجا چک ویر رہے یا کوئی اور مگر اسے راج گھرانے ہی سے ہونا چاہیے اسی میں ہماری جیت ہے

ہمارا اصل اور بڑا دشمن انگریز ہے جو ہماری ریاست پر نظریں جمائے بیٹھا ہے اس کے ناپاک قدم بھی اس

دلیش کی دھرتی پر نہ پڑنے دینا اگر بھگوان نہ کرے کوئی ایسا سے آجائے تو بہادر کوڈ گیل کی طرح لڑتے ہوئے جان

دے دینا، میں بہت تھک گیا ہوں اور اسی لئے مذکوری سے جارہا ہوں کہاں۔ یہ ابھی خود مجھے بھی معلوم نہیں

میرے پیچھے نہ آنا بھگوان تمہیں سدا سکھی رکھے۔ تمہارا سوای جی۔

اتنیا تمہیں اس خط میں کیا بات عجیب معلوم ہوئی۔ میں نے خط واپس دیتے ہوئے دریافت کیا۔

میں نے خط واپس دیتے ہوئے دریافت کیا۔

یہی کہ انگریز ہمارا اصل دشمن ہے انگریز سرکار تو ہماری دوست ہے اور اس نے آج تک ہمارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا راج نیتی میں کوئی سدانہ کسی کا دوست رہتا ہے نہ دشمن، یہ دوستی یا دشمنی وقت اور حالات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

میں اسے سمجھانے لگی۔ سوای جی تم سے زیادہ عمر کے تھے، ان کا تجربہ بھی تم سے زیادہ تھا، انہوں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے اگر وہ اصل دشمن کی نشان دہی کر

گئے ہیں تو یہ بات غلط نہیں ہو سکتی پھر یہ کہ وہ ایک بزرگ ہستی تھے ان کے پاس بھگوان کی دی ہوئی وہ شکتی

بھی تھی جس کے متعلق کبھی نے مجھے بتایا تھا سو جو کچھ سوای جی نے لکھا ہے اس پر عمل کرو۔

ٹھیک کہتی ہیں آپ میں نے خود بھی یہی سوچا تھا بھگوان کی کرپا رہی تو ہم اس دلیش پر آنے نہیں آنے

دیں گے۔ اتنیا کے لہجے میں اب مایوسی نہیں تھی ذرا توقف کے بعد وہ کہنے لگا۔ معلوم نہیں کیا بات ہے کہ

ان دنوں عجیب عجیب واقعات پیش آ رہے ہیں ابھی میں ادھر آ رہا تھا تو امرتا تھ جی کے مندر سے تین

ارتھیاں اٹھ رہی تھیں پوچھنے پر پتا چلا کہ کسی نے کل رات مندر کی ایک داسی اور دو بھکتوں کو قتل کر دیا اس

کے علاوہ پراسرار طور پر مندر کا وہ مضبوط حصہ بھی جانے کیسے ڈھس گیا جہاں بڑے مہاراج کا استھان تھا دیکھ کر

یوں لگتا ہے جیسے پہلے وہاں کچھ تھا ہی نہیں لنگڑے بسودیا کو بھی میں نے ادھر ہی جاتے دیکھا تھا پر میں

وہاں رکا نہیں کہ یہاں آنا تھا۔ پھر اتنیا کو جانے کس طرح یہ احساس ہو گیا کہ کویتا وہاں نہیں ہے سو اس نے

کویتا کے بارے میں پوچھا لیا۔ اسے میں نے آگے بھیج دیا اور اب ہم لوگ بھی

واپس جانا چاہتے ہیں۔ میں نے جواب میں کہا۔ کہاں کمار جی۔ وہ حیرت سے بولا۔



وہیں جہاں سے آئے تھے یعنی بمبئی۔

پر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ہمیں تو ٹھیک طرح سے آپ کی میزبانی کا موقع بھی نہیں ملا۔

آئندہ سہی ہم لوگ آتے جاتے رہیں گے اب ٹھکانا  
تو دیکھ ہی لیا ہے۔ میں نے مسکرا کر بات بنا دی۔

دو آپ کی ساتھی اکیلی سفر کر لیں گی۔

اسے صرف اگلے پڑاؤ تک بھیجا ہے اسی جگہ جہاں تم سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور تو نہیں ہے اکیلے مٹی ہے اس لئے کسی کو اس پر شبہ بھی نہیں ہوگا۔

ایک ایک کر کے جانے کی بجائے اگر آپ لوگ رات کو ایک ساتھ نکل جائیں تو زیادہ اچھا ہے اس عرصے میں ہم آپ کے لئے رستے میں کھانے پینے کا بندوبست بھی کر دیں گے۔

ٹھیک ہے ہم رک جاتے ہیں آج دن بھر۔ میں گویا راضی ہو گئی۔

اگر آپ اجازت دیں تو دوپہر کا کھانا میں کروں۔  
اتحیا کے لہجے میں غلوں تھا۔

میں اس پر بھی راضی ہو گئی اور اتنا چلا گیا اس کے  
جاتے ہی میں آرام کرنے لیٹ گئی عادل اور شام بابو کو  
بھی میں نے یہی مشورہ دیا تھا کیوں کہ ہمیں ایک دشوار  
گزار سفر درپیش تھا۔



بہشتی آئے ہوئے مجھے دوسری رات تھی میں نے رانی کی باندروہ والی کوشی میں قیام کیا تھا۔ پہلی رات سوتے گزری تھی اور دن بھی۔ رانی کو اسی لیے مجھ سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

وہ لڑکی کہاں گئی جو تمہارے ساتھ یہاں سے گئی تھی۔  
 رانی نے کویتا کے بارے میں معلوم کیا، ہم لوگ رات کا  
 کھانا کھا کر اٹھنے ہی والے تھے۔

اسے میں نے وہیں چھوڑ دیا جہاں گئی تھی۔ میں نے  
ٹھنڈا سانس بھرا گوشش کے یاد جو کویتا کے ذکر پر میں

خود کو سمیٹ کے نہ رکھ سکی۔

رانی نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا پھر بولی۔ میں  
 سمجھ گئی لڑکی خراج ہو گئی..... لیکن تم کیوں اداس ہو گئیں۔

رانی کے لئے اس کے کسی ساتھی کا ہمیشہ کے لئے  
بچھڑ جانا اداسی کا سبب نہیں تھا میں اس کے مزاج سے  
واقف تھی سو اس کے سوال کو نال مٹنی۔

شیام بابو ظاہر ہے میرے ساتھ رانی کی کوٹھی میں نہیں رکھا تھا، اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عادل البتہ اب بھی میرے ساتھ تھا وہ بھلا کہاں جاتا رانی کے سامنے اس کی حیثیت میرے ملازمین جیسی تھی اس لئے وہ سامنے والی ایک کرسی پر لا تعلق سا بیٹھا تھا۔

آؤ چلو لان میں ٹہلتے ہیں۔ میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے عادل کو مخاطب کیا۔

لیس میڈم۔ عادل جواب دیتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔  
اچھا میں چلی، مجھے ذرا ایک کام سے کھار کے اڈے  
نک جانا ہے تم تو ظاہر ہے شہل کر سوجاؤ گی کل تفصیلی  
ملاقات ہوگی دن میں ابھی تو تم رہو گی نا۔

کچھ کہ نہیں سکتی۔ میں محتاط لہجے میں بولی۔ ہاں صبح تک تو بہر حال موجود ہوں۔ کھار کے اڈے کے ذکر پر مجھے ولیم یاد آ گیا تھا اس کی زندگی کے آخری لمحات وہیں گزرے تھے۔

تاشے پر تو لوگ کیا اس کی بھی خبر نہیں۔ وہ دھیرے سے اُسی  
ہاں ہاں کیوں نہیں۔

رانی ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی عادل کو ساتھ لیے میں چہل قدمی کی خاطر عقبی لان میں آگئی۔ کوہتا سے عادل کی کوئی خاص وابستگی نہیں تھی یوں بھی وہ کسی روگ کو زیادہ عرصے پالنے کا قائل نہیں تھا اس لئے تنہائی ملتے ہی چبکتے لگا۔ اسے بہت دنوں بعد مجھ پر فقرے بازی کا موقع ملا تھا مجھے وہ اداس بلبل اور جانے کیا کیا القاب دیتا رہا مگر میرا موڈ بحال نہ ہو سکا۔ میں اس سے باتیں تو کر رہی تھی لیکن بے دلی کے ساتھ۔ بیجا وہ اکیلا چبکتے چبکتے تھک گیا میرے لئے

انیمیت تھا لان سے لوٹ آئی۔

امت کو ڈگ سے میں واپس تو آگئی تھی، مجھے اس  
قبل کے بارے میں بھی اندازہ ہو گیا تھا پھر بھی  
میں آمادہ نہیں ہو رہا تھا کہ میرے دشمن اسے ہضم  
نہیں اس کے علاوہ مجھے ڈیان کی فکر بھی تھی میرے  
مکے مطابق چند موبہن اگر زندہ بچ بھی گیا تھا تو

مرے کے لئے بستر علالت اس کا نصیب تھا۔  
 لمیٹیان اور چپا دونوں ہی سے میں نمٹ سکتی تھی۔  
 ۱۸۰۰ میں جب کہ خود اسی کی زندگی کا کوئی بھروسا  
 تھا تو میرے دشمن ٹیڈان یا چپا کی کیا مدد کرتا۔

کے بارے میں مجھے علم تھا کہ اسے چند روزوں میں  
مطبوعہ قلعے بنگال بھیج دیا تھا۔ بنگال میں اس کا مرکز  
اور مجھے یہ بھی پتا تھا۔ ٹریان کے متعلق بھی میرا یہی خیال  
چند روزوں میں اسے بھی وہیں روانہ کیا ہو گا انہی وجوہ  
سبب میں کلکتہ جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔  
انہی پہاڑوں سے اتار کر مجھے اسی شہر میں تو پہنچایا  
میرے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

اپنے کمرے میں آکر سونے کا ارادہ کر رہی تھی  
 کہ روح عظیم مہمکن کی سرگوشیاں سنائی دینے  
 لگیں۔ اے معجلہ اب تیری منزل زیادہ دور نہیں تو نے  
 ارادہ کیا ہے ٹھیک ہے تیرا دشمن وہیں ہے۔ اور

ہم اسی کی تقدیر سے لڑنے کی کوششیں کیوں کرتی  
ہیں؟ جی کو سنہال کے رکھا کر تیرا جی اس پر آمادہ

کہ ریاست کو ڈمگ پر تیرے دشمن قبضہ کر لیں تو  
 تو بھلا کون لکھے کوٹا لنے والی تجھے بتا دیا گیا تھا  
 یقین نہیں آیا۔ تو پھر اپنی آنکھوں سے خود اپنے  
 اہم بلندہ ہوتے دیکھ سن اور محسوس کر تو نے اب  
 اصل اور حال کو دیکھا کہ تیری آنکھوں کو یہی دکھایا  
 ایذای ضدی ہے اور جیتتی بھی ہے سو مستقبل میں  
 محاکہ دیکھ کہ اس ریاست پر کیا گزرنے والی ہے  
 تو لوٹ کے آئی ہے۔

اسی کے ساتھ میرے صفحہ ذہن پر مختلف مناظر ابھرنے لگے وہ جو ہونے والا تھا میری آنکھوں کو پہلے ہی دکھایا جا رہا تھا مجھے یہ مناظر جس تسلسل اور ربط کے ساتھ دکھائے گئے اسی طرح بیان کر رہی ہوں ان مناظر کے دوران میں مجھے بار بار عظیم مہمن کی سرکوشیاں بھی سنائی دیتی رہیں۔

پہلا منظر میں نے یہ دیکھا کہ ظالم و بدکردار راجا چک  
ویر نے اپنگول پر اچانک شب خون مارا راجا کی بہن  
دیو ما اور اس کا بہنوئی جین بسو بڑی افراتفری میں راج  
محل سے فرار ہو کر میسور کی طرف بھاگے اپنے بچے کو وہ  
اپنگول کی ایک غریب عورت کے پاس چھوڑ گئے تھے  
کہ کہیں وہ نہ مارا جائے مگر یہ راز مکمل کیا دو سالہ کدپا  
اپنے ماموں راجا چک ویر کے ہتھے چڑھ گیا اپنگول سے  
اس معصوم کو ڈکیری کے راج بھون میں لایا گیا۔

اس کے بعد مستقبل کے یہ مناظر بدلتے رہے ہیں  
نے اس بچے کو رانی گورما اور راجیکارمی پٹا کے ساتھ  
دیکھا چک ویرنے موقع پا کر ایک روز بھانجے کو مار دیا  
کہ وہ اس کے دشمن چین بسو کا بیٹا تھا یہ بات جھپ نہ  
سکی اور عوام تک پہنچ گئی یہ ظلم عوام کے لئے ناقابل  
برداشت تھا اس میں فرزند ان کا ویری نے بھی اہم  
کردار ادا کیا کہ عوام بغاوت پر کمر بستہ ہو گئے۔

انگریز حکومت نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ریاست پر دباؤ ڈھا دیا تو بیت یہاں تک پہنچی کہ ایک عیار انگریز جنرل فریزر کی کمان میں بنگلور کی طرف سے ریاست پر حملے کا آغاز کر دیا گیا یہ حملہ پانچ سستوں سے کیا گیا انہی میں سے ایک محاذ پر میں نے اتھیا اور اس کے ساتھیوں کو داد شجاعت دیتے اور پھر بہادری سے مارتے دیکھا راجا چک دیر کو مجبوراً ٹڈکیری سے بسودیا کے ساتھ فرار ہونا پڑا اور وہ مشتعل عوام اسے مار ڈالتے ٹڈکیری سے بھاگ کر چک دیر ٹالک ناڈہنچ کیا رانی اور راجکماری کو وہ خود غرض ٹڈکیری کے راج بھون ہی میں



چھوڑ گیا اس کا کہنا تھا کہ عوام ان دونوں کو قتل نہیں کریں گے کیوں کہ وہ کوڑی ہیں۔

بے راجا اور بغیر کسی سربراہ کے فوج کیوں اور کب تک لڑتی محاذ جنگ پر وزیر دفاع اور افواج کے کمانڈر انچیف بوپنا کو یہ خبر ملی کہ راجا چک دیوار حکومت سے فرار ہو گیا ہے اس نے سفید پرچم بلند کر دیا جواب میں جنرل فریزر نے بھی ایسا ہی کیا اور لڑائی رک گئی انگریز جنرل کو بھی راجا کے فرار کی خبر مل چکی تھی اس معاملے نے بوپنا کو پیغام بھیجا۔ آپ ادھر آئیں گے یا ہم ادھر آئیں۔ جو آپ کی مرضی ہو کہلوادیں ہم کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتے جس سے آپ کی عزت میں فرق آئے۔

بوپنا نے کہلویا۔ یہی وہاں آجائیں گے آپ کو رحمت کی ضرورت نہیں۔

پھر نصف گھنٹے کے بعد بوپنا انگریزوں کی چھاؤنی میں پہنچ گیا انگریز جنرل نے بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا اور اسے اپنے خیمے میں لے جا کر کرسی پر بٹھایا اور پھر خود بھی کرسی پر بیٹھنے ہوئے بولا۔ آپ ریاست کی فوج کے سربراہ ہیں اور ہمارے لئے قابل عزت ہیں۔ آپ کا تہا یہاں آنا بلند ہستی کی دلیل ہے ریاست کے عوام اگر آپ کو عزت و احترام دیتے ہیں تو بجا ہے۔ آپ خود بتائیے کہ انگریز حکومت اور کوڈگ کے درمیان جو یہ جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے کیسے ختم ہو۔ دباؤ آپ کی طرف سے بڑھایا گیا اور آپ کی حکومت نے ہماری ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی۔ بوپنا دلیری سے بولا۔

اور کیا آپ کے راجا نے ہمارے سفارتی نمائندوں کو گرفتاری کا حکم نہیں دیا۔ انگریز جنرل رداں کوڈگی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔

بلاشبہ ایسا ہوا مگر کیوں۔ محض اس لئے کہ ہمارے معاملات میں سفارتی نمائندوں نے ہی سے جواب طلبی کی، آپ کے نمائندوں کا کہنا تھا کہ ہمارے راجا نے

اپنی بہن اور بہنوئی پر ظلم ڈھایا ہے ان لوگوں کی حکومت سے فریاد کی اور آپ نے راجا بہنوئی کے جان و مال کی حفاظت اور اسے چھڑانے کے لئے ہم پر فوج کشی کرنا مناسب بات ہے۔

ہماری حکومت کے خیال میں یہی مناسب ورنہ ایسا نہ کیا جاتا۔ انگریز جنرل نے پرسک جواب دیا۔ آپ کے راجا نے اپنے بھائی کو دیا ہے انہیں سزا دینا اب ہمارا کام حکومت کی طرف سے کوڈگ کے روشن بھلائی کے لئے مناسب اقدام کرنا ہمارا فریاد کوڈگ کے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہمارا جاگیرداروں اور ساہوکاروں کا فرض ہے غیر حق نہیں دیا جاسکتا۔ بوپنا کے لہجے میں تنزلی عیار انگریز جنرل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جواب دہمے اور نرم لہجے میں بولا۔ جو بات کہ

لیڈروں کو پسند نہیں وہ بات ان سے ہمیں بھی کی خواہش نہیں ہے ہماری حکومت اس سے آگے کہ خود آپ لوگ اپنی ریاست کا نظم و نسق چلا رہے ہیں ایسے مواقع پر فیصلے میں تاخیر عوام کے لئے ہونے جانی ہے ایسے ہی معاملات کو نمٹانے کے دوست کام آتے ہیں ہم یہی بات آپ کو چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد آپ سے دوستی ہے نہیں۔

یہ تو خوشی کی بات ہے کہ آپ کی حکومت کوڈگ عوام کو اپنا سمجھتی ہے آپ اپنی حکومت کی بات بتائیں۔

راجا نے انگریز حکومت کی بے عزتی کی جنرل کے تیور بدل گئے وہ گرجت کی طرح رگڑا تھا۔ انگریز حکومت نے ان کی بہن اور بہنوئی حفاظت میں لے لیا تھا انہوں نے غصے میں آ

ان کو دیا اس بے عزتی کی سزا کے طور پر اسے محروم کرنا ہے خون کرنے کی سزا کے سزائے موت دی جائے یا اور کوئی سزا دی جائے گا۔

ہمارے کو قتل کرنے کے سلسلے میں آپ انہیں ان نہیں رکھتے کیوں کہ وہ انگریز حکومت کی ہیں۔

یہ ہمیں پتا چلا ہے کہ عوام خود راجا کو اس کی بات ہے ہیں اور آپ ہماری نظر میں عوام کی ہیں اگر آپ اس پر آمادہ نہیں تو ہم اس جھگڑے ہاتھ دے۔ انگریز جنرل نے پہلو بدلا۔ ایسی ہی ہمارے سفارتی نمائندوں کو بلانا خیر رہا ہے گا راجا کی بہن اور بہنوئی کے لئے ان کی کے مطابق رہنے کا انتظام کرنا ہوگا اس کے آپ کو تادان جنگ بھی ادا کرنا پڑے گا، آئندہ است میں ایسی بے چینی نہ پھیلے اس کے لئے ہمارے ہوئے لائحہ عمل پر چلتا ہوگا۔

یہ بے چینی نہیں پھیلنا چاہیے یہ تو ٹھیک ہے لیکن ہم

مگر تہذیب دینے ہوئے لائحہ عمل پر کیوں چلیں۔

اے کہ کوڈگ ہماری عملداری کے درمیان میں ہیں جو گڑبڑ ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی صورت ہمارے لئے ہونی چاہیے اثر انداز ہوتی ہے۔ ہمارے علاقے گڑبڑ کا شکار ہیں اس لئے آپ کو ہمارا مرحب کہہ لائے گا کہ راجا کو پھر وہ بوپنا کو خاموش دیکھ کر نری سے کہنے

آپ جس ڈھنگ کا دستور پسند کریں گے اسی پر عمل

آپ کی مرضی کے خلاف ہم ایک قدم بھی نہیں

ہم کے ہم اتنی دور صرف کوڈگی کے عوام کی بھلائی

لی خاطر ہی آئے ہیں آپ کے کہنے کے مطابق ہی

ہم کے مسند اقتدار کے اصل وارث کو مقرر کر کے ہم

ہم کی خدمت ہی کریں گے۔ راجا کے انتخاب اور

اس کے اقتدار سنبھالنے کے لئے نیز یہ جھگڑا مکمل طور پر ختم ہونے پر ہم دوستوں کی طرح آپ سے اجازت لے کر یہاں سے رخصت ہوں گے۔

تو کیا اس کے لئے آپ ٹڈی کیری آنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اسے بہتر نہ سمجھیں تو ہم نہیں آتے بلکہ ہمیں سے واپس ہو جائیں گے پھر آپ کو ان باتوں کا معقول بندوبست کر کے ہمیں یہیں بتانا پڑے گا۔

انہی بات ہے ہم سوچ بچار کے بعد اپنے فیصلے سے آپ کو آگاہ کرتے ہیں۔

دراخت کے موضوع پر سوچتے وقت آپ دونوں میں پر اور غور کر لیجئے گا۔ انگریز جنرل پھر مسکرا دیا۔ راجا کی بیوی اور بیٹی تو آپ کی فہرست میں ہوں گی ہی شاید تیسرا نام ہے راجا کی بہن کا، شاید کا لفظ ہم نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ ممکن ہے وہ آپ کی فہرست میں نہ ہو بہر حال انہی تک جن دونوں پر آپ نے غور نہیں کیا ہوگا ان میں سے ایک راجا کا تایا زاد ہے اور دوسرا ہے راجا کا سگا بڑا بھائی۔

راجا کے تایا کا نام کریا پاپا ہے یہ بات تو آپ کو معلوم ہی ہوگی۔

دو تو مرد دراز سے کم ہیں اس واقعے کو تیس برس گزر گئے لوگ تو کہتے ہیں وہ مر چکے ہیں۔

ممکن ہے ایسا ہی ہو۔۔۔ انگریز جنرل بولا۔ لیکن ہمارے ساتھ دو ایسے افراد ہیں جو خود کو کریا پاپا اور ویرنا بتاتے ہیں۔

کہاں ہیں وہ۔

اس وقت تو یہاں نہیں ہیں۔ انگریز جنرل نے پھر پہلو بدلا۔ اس کے لہجے سے جھوٹ کا ذرا بھی پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ دونوں ہماری اس فوج کے ساتھ ہیں جو ارکل کوڈگی طرف سے پیش قدمی کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔

تو آپ نے صلح کا پرچم بلند ہونے کے باوجود ابھی



تک اپنی افواج کو پیش قدمی سے نہیں روکا۔ بو پنا ایک اور ہی معاملے میں الجھ گیا۔

ابھی ہمارے اور آپ کے درمیان صلح کب ہوئی ہے۔ ابھی تو صلح کے لئے مذاکرات شروع ہوئے ہیں۔ پھر بو پنا پر مزید دباؤ ڈالنے کی خاطر انگریز جنرل نے بقیہ تین محاذوں کے بارے میں بھی بتایا جہاں ریاست کی فوج پسپا ہو کر پیچھے ہٹ رہی تھی۔

صورت حال کچھ ایسی ہوئی کہ بو پنا کو صلح ہی میں عافیت نظر آئی انگریز فوج ہر طرف سے ریاست میں گھس آئی تھی راجا کے ٹڈکیری سے فرار نے فوج کے حوصلے پست کر دیئے تھے پھر جب انہوں نے یہ سنا کہ عوام نے بھی بغاوت کر دی ہے تو ان کے حیرانہ کھڑ گئے۔ ہاری ہوئی جنگ جیتنے کے لئے صلح ضروری تھی سو بو پنا اس پر بھی راضی ہو گیا کہ فریز اپنی فوج کے ساتھ بحیثیت دوست ٹڈکیری چل سکتا ہے۔

اس معاملت کے بعد پھر وراثت پر گفتگو ہونے لگی انگریز جنرل کہنے لگا۔ آپ کے راجا کا ایک بھائی اور ہے اس ضمن میں ہمیں بہت سے خطوط ملے ہیں وہ سب خطوط ہم ساتھ لائیں ہیں ثبوت فراہم کرتے وقت جب آپ کو ان خطوط کی ضرورت پڑے گی دکھا دیئے جائیں گے۔

ان باتوں کو طے کرنے کے لئے آپ کا ٹڈکیری ہی میں رہنا مناسب ہے۔

یہ تو آپ کی مرضی پر منحصر ہے اگر آپ ہمیں وہاں بلائیں گے تو ہماری طرف سے کوئی اعتراض نہیں۔ شاطر انگریز بولا۔

آپ بھی سمجھئے کہ ہمارے بلاوے پر یہاں آئے ہیں بس یہ خیال رکھیے گا کہ معاملات ٹھٹ جانے کے بعد جب ہماری جنتا آپ سے واپس جانے کو کہے گی آپ کو واپس جانا ہوگا۔

واپس جانے کے لئے وہ حیار کب وہاں آیا تھا وہ

ایک کے بعد ایک چالیس چلا گیا اور پچھنے کے بعد یہاں تک ٹو بت پہنچ گئی کہ عوام اسے پنا نجات دہندہ سمجھنے لگے بہت سے ملی اور خود کو ظاہر کر دیا، بندر بانٹ شروع عوام نے خود مطالبہ کیا کہ راجا چک ویرا کو اس کی جگہ کسی اور کو ریاست کا سربراہ بنادیا ویرا کی گرفتاری کے لئے نالک ناڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس سے پہلے ہی بھگوتی نالک راج محل میں ایک خفیہ سرنگ کی نشاندہی کر قرعی جنگل میں نکلتی تھی وہ ایک مرتبہ نالک ساتھ اس راج محل میں رہ چکی تھی اس لئے بد سے وعدہ لے لیا تھا کہ راجا چک ویرا وزیراعظم ہوسونیا کو ہر قیمت پر زندہ گرفتار کیا انگریز جنرل نے فوجی دستوں کو یہی ہدایت راجا اور ہوسونیا کو زندہ پکڑا جائے ایک انگریز جیکسن ان فوجی دستوں کا انچارج بنایا گیا ہدایت دی گئی تھی کہ سرنگ کا جو دہانہ جنگل وہاں خود فوجیوں کے ساتھ موجود رہے خبر یہ تھی اور ہوسونیا کے ساتھی راج محل میں زیادہ سپاہی پسپا ہو کر وہ آخر کار سرنگ کے ذریعے فرار کوشش کریں گے۔

پھر میری آنکھوں نے مستقبل میں جہاں چک ویرا اور ہوسونیا کا جبریت ناک انجام دیکھا مجھے بدکردار عیاش راجا چک ویرا کا چہرہ نظر آئے شدید غصے کے آثار تھے، ابھی ابھی اسے بتایا ٹڈکیری سے کچھ فوجی دستے بڑھتے چلے آ رہے ان کا رخ نالک ناڈ کے راج محل ہی کی طرف دینے والا لنگڑا ہوسونیا تھا۔

ہوسونیا نے یہ خبر ملتے ہی اس پاس کے دیہا کوئی دوسوا دی یہ سوچ کر بلوا لیے تھے کہ فوج ارادے سے نہیں آ رہی ہوگی اس نے ان آدمی

ہر قطار بنا کر کھڑا کر دیا پھر اس انتظام سے راجا ہانہر سنتے ہی چک ویرا کا چہرہ اتر گیا اور اس نے الاز میں پوچھا۔ کیا اسلحہ اور گولہ بارود ہے۔

اگر میں مالک ہمارے سپاہیوں کا نشانہ بہت اچھا رت پڑنے پر ہم دو دن تک لڑ سکتے ہیں۔ لے نسل دی۔

لوہک ہے دیکھیں گے، ابے لنگڑے پہلے یہ تو اہ کون ہیں۔

ہوں معلوم مالک۔ ہوسونیا کا لیاں کھا کر بے لے والوں میں سے نہیں تھا۔

ہی دیر بعد فوجی دستے محل سے خاصے فاصلے پر اک گئے پھر ایک گھڑ سوار سفید جھنڈا لہراتا ہوا ہوا حادہ ایک انگریز فوجی افسر تھا۔

لہا کے پیچھے پچھنے کے بعد انگریز افسر نے بلند آواز لہا۔ راج محل سے کسی کو بھیججو، کچھ بات کرنا ہے۔ یہ اس نے انگریزی ہی میں ادا کیے تھے اسے مقامی لہا آتی تھی۔

دہانے محل سے ایک مترجم کو باہر بھیجا اس نے ہا آ کر بتایا۔ یہ فوج ہنگور سے آئی ہے انگریز جنرل نے ٹڈکیری پہنچ چکا ہے انگریز فوجی افسر کہہ رہا ہے کہ ہائی کو چاہیے کہ وہ خود کو ان کے حوالے کر دیں ورنہ لبر دہتی یہاں سے گرفتار کر کے لے جایا جائے

ہنٹے ہی چک ویرا مشتعل ہو گیا اور چیخاٹھا۔ لنگڑے ہا کا حوصلہ دیکھ رہا ہے کل تک یہ اپنی عورتوں کو لے نالکھانے بھیجتے تھے، ابے تجھے تو معلوم ہے کہ آج یہی اکڑ کے بول رہے ہیں دو چار کو بھون لے، سالوں کی عقل ٹھکانے آ جائے گی۔

ہر مالک کا حکم۔ ہوسونیا نے جواب دیا پھر زری سے ہمانا چاہا۔ لیکن مالک آنے والے ہنگور کے ہیں ان ہتھیار ہمارے ہتھیاروں سے اچھے ہوتے ہیں۔ یہ

ٹھیک ہے کہ ہم آڑ میں ہیں مگر ہم لوگ انہیں زیادہ دیر تک نہیں روک سکیں گے۔

اس پر چک ویرا مزید برہم ہو گیا۔ ابے کہیں تو بھی تو ان انگریزوں سے نہیں مل گیا۔ کیا مطلب ہے تیرا کیا گرفتار ہو جاؤں۔

نہیں مالک میرا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا۔

پھر کیا تھا تیرا مقصد۔ چک ویرا تھوڑا نرم پڑ گیا۔ چک ویرا کو نرم پڑتے دیکھ کر ہوسونیا کے دل کی بات زبان پر آ گئی، اس کا لہجہ رازدارانہ سا تھا۔ اگر مالک کی اجازت ہو تو میں خود ان سے جا کے بات کروں مترجم کو ساتھ لے جاؤں گا۔ میں ان سے کہوں گا کہ ہمارے مالک خود چلنے کو تیار ہیں گرفتار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اس طرح چلنے میں بے عزتی کی بات نہیں عزت کے ساتھ ٹڈکیری پہنچ۔

بڑا عقلمند سمجھتا ہے تو اپنے آپ کو لنگڑے اب تک تجھے ہمارا حکم ماننے کی عادت نہیں پڑی۔

ٹھیک ہے مالک جو حکم آپ کا لیکن اب آپ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں، ہو سکتا ہے کہ جو فوجی دستے ابھی خاصے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے ہیں کچھ دیر میں آگے بڑھ آئیں۔ یہاں نہ رہوں تو کہاں جاؤں۔ یہ بھی تو بھوک۔ رسی جل گئی مگر ابھی بل نہیں گئے تھے۔ چک ویرا کے لہجے میں وہی پہلے جیسا تکبر اور غرور تھا۔

لڑائی کی صورت میں دد ایک کھٹے میں ان لوگوں کو روک سکتا ہوں انہیں شبہ نہ ہو کہ آپ کا ارادہ فرار ہونے کا ہے اس کی صورت یہ ہے دور سے ایک آدھ بار درشن کرادیں آپ سرنگ کے راستے نکل جائیں تو اچھا ہے اگر ابھی ان کا سامنا نہیں کر سکتے جو ہنگور سے ریاست میں گھس آئے ہیں تو جنگل میں روپوش رہ سکتے ہیں، جنگلوں اور پہاڑوں میں برسوں وہ آپ کو نہیں ڈھونڈ پائیں گے، انگریز فوج کبھی تو واپس جائے گی ہی اس کی داپس کے بعد روپوشی سے نجات مل جائے گی رہا



عوام کا غصہ تو وہ اس حرم میں جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا مالک! عوام کا خاندان بہت کمزور ہوتا ہے زیادہ دن وہ کسی بات کو یاد نہیں رکھتے سب اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں پھر اگر کسی کو یہ بات یاد بھی رہ گئی کہ آپ کے ہاتھوں ایک بچے کا خون ہو گیا تھا تو اس کا بھی ایک توڑ ہے، لگان میں تھوڑی سی رعایت سے بھی لوگ خوش ہو جائیں گے۔

ابے لنگڑے، مجھے خبر نہ تھی کہ تو بھی راج نئی جانتا ہے پہل ہم نے تیری بات مان لی دو چار قاز کر دیا اور میری بددقت بھی منگوا چک دیر پر سکون نظر آنے لگا۔ بسودنیانے چک دیر کی بددقت لانے کو ایک ملازم سے کہہ دیا پھر وہ مترجم سے بولا۔ جا کر اس انگریز افسر سے کہو کہ راجا جی کو اس کی بات منظور نہیں اگر وہ لوگ زبردستی کریں گے طاقت سے کام لیں گے تو لڑائی ہوگی اس سے ان کے لوگوں کی جانیں بھی جائیں گی۔

چار دیواری پر بسودنیانے جن دو سو سچ افراد کو ایک قطار میں کھڑا کیا تھا انہیں بتایا کہ جب میری طرف سے تیار ہو جاؤ سنو فوراً قاز کرک شروع کر دو قاز خراج نہیں جانا چاہیے آڑ میں سے بیٹھ کر قاز کرنا ہے اس طرح کھڑے نہ رہنا ورنہ سارے جاؤ گے ایک گولی سے کم از کم ایک آدمی تو مرنا ہی چاہیے پھر اس نے محل میں موجود قریب ایک سو سپاہیوں کو بھی یکجا ہدایت دی۔ ملازم نے چک دیر کو بددقت لا کر دے دی بسودنیانے اس کے پاس جا کر کہنے گا۔ مالک آپ یہیں ستوں کی آڑ لے کر قاز کیجئے گا آگے نہ بڑھیں گے۔

ہونہ مجھے سمجھا رہا ہے لنگڑا بھول ہی گیا کہ میں نے جوتی میں شیلوں تک کاٹھا کر لیا ہے، یہ انگریز تو کید ہیں۔ اس دوران میں مترجم نے انگریز افسر کو بسودنیانے کا پیغام پہنچا دیا۔

ہمیں غم ملا ہے کہ راجا صاحب بددقت کے دیر پر غم کو کوئی نقصان نہ پہنچے ہم انہیں کوئی گزند نہیں پہنچانا چاہتے

اگر جنگ ہی کرنا ہے تو راجا صاحب اور ان کے کسی فیصلے تک پہنچنے سے پہلے سامنے نہ آئیں ہم کو صرف اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں چاہے وہ رضا ملیں یا انہیں گرفتار کرنا پڑے۔ انگریز افسر بولا۔ مترجم نے محل میں آ کر انگریز افسر کے کہے الفاظ دہرا دیے۔

بھون دو سالوں کو۔ یہ کہتے ہوئے پہلا قاز پنا ہی نے کیا، اس نے واپس جاتے ہوئے انگریز نشانہ بنایا تھا گولی نشانے پر ہی بیٹھی مگر چک بددقتی سے انگریز افسر صرف زخمی ہو سکا اس کا شاز گیا تھا اس کے سبب وائیں ہاتھ سے سفید پرچم ہیر کر نیچے گر پڑا اسی پرچم کو سنبھالنے کی خاطر انگریز گھڑ سواری کرتے ہوئے تھوڑا سا ایک طرف ہو گیا چک دیر اس وقت تک قاز کر چکا تھا۔

جس کے ہاتھ میں سفید پرچم ہو اس پر گولی ہا حملہ آور ہونا جنگی قواعد کے خلاف ہے مگر چک دیر لوگ کب کسی قاعدے کو مانتے ہیں۔

زخمی انگریز افسر جیسے تیسے گولیوں سے پچتا پچاتا فوجی دستوں تک پہنچ گیا۔ جیکسن کیونکہ وہاں سے جنگل میں نکلنے والی سرنگ کے وہانے پر تھا اس لئے فوجی دستوں کی کمان اس کا ایک ماتحت کرد ہا تھا انہوں نے زخمی افسر کو پیچھے بھیج دیا تاکہ طبی امداد مل سکے اپنے دستوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا ذرا ہی دیر میں دونوں طرف سے شدید قاز کرک ہونے لگی۔

نتیجہ ہی نکلا جو بسودنیانے پہلے ہی کہہ چکا تھا، انگریز حادی آنے لگی اور چک دیر کو سرنگ کے ذریعے محل لٹکا پڑا۔ بسودنیانے اس سے کہا تھا کہ موقع ملے ہی بھی جنگل میں مقررہ جگہ پہنچ جائے گا۔ سرنگ سے تہا ہی چک دیر گھوڑا دوڑاتا ہوا جنگل میں نکلا اسے گھیر لیا جیکسن یہاں موجود تھا راجا چک دیر کی شناخت کے وہ اندھیری سے اپنے ساتھ کوڑی سپاہیوں کو بھی لایا

ان نے تصدیق کر دی کہ وہ راجا چک دیر ہے تو اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر قریب پہنچا اس نے چک دیر کو جھکا کر تعظیم دی پھر بولا۔ راجا صاحب اب آپ ہاری قید میں ہیں۔ جیکسن کو بھی مقامی زبان بولنا آتی تھی۔ ہم آپ کو عزت و احترام کے ساتھ یہاں سے لے جائیں گے ہمیں امید ہے کہ آپ کسی جگہ سے کا نچ دیئے بغیر ہمارے ساتھ چلیں گے اس پر ہم آپ کے ممنون ہوں گے۔

مجھے بسودنیانے گرفتار کر لیا ہے نا۔ بلا ارادہ چک دیر لگا رہا ہے اس پر یہ سوال آ گیا اسی کے ساتھ اس کا ہاتھ کرک بندھے ہوئے پستول پر پہنچ گیا۔

راجا صاحب۔۔۔ جیکسن بول اٹھا۔ پستول سے ہاتھ ہٹا لیجئے اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو مجھ پر پستول لینا اے گا اس طرح آپ کی بے عزتی ہوگی جو میں نہیں ہاتا۔

چک دیر نے پستول سے ہاتھ ہٹا لیا اس کے چہرے سے غصے اور نفرت کا اظہار ہوا ہاتھ۔

جنگل سے نکل کر اس فوجی دستے نے ایک پہاڑی کا ٹکڑا اور محل کے مقابل آ گیا۔

بسودنیانے چک دیر کو ادھر سے دیکھ لیا کہ وہ انگریز فوجی دستے کے نرغے میں ہے وہ اپنے سپاہیوں کی ہمت مانتا ہوا اب تک لڑ رہا تھا چک دیر کو اس حال میں دیکھ کر اس کے چہرے پر سیاحی سی پھیل گئی وہ آخر جنگ ہار گیا تھا پھر معلوم نہیں اس نے کیا سوچا کہ قاز کرک بند کرادی اور گرتا پڑتا نیچے اتر اٹھا اور وہ کھلوا کر وہ بھاگتا ہوا راجا چک دیر کے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

ارے مالک! آپ ان کے ہاتھ کیسے پڑ گئے۔ چنٹا ہوا ہاتھ اٹھا کر راجا چک دیر کے سامنے آ گیا۔

چک دیر کے خیال میں سرنگ سے فرار کا علم صرف دنیا کو تھا انگریزوں کو اس کا علم نہیں ہو سکا تھا جب تک کہ بسودنیانے ان سے نہ مل گیا ہو سرکشوں میں

مجھے بتایا گیا پھر میں نے چک دیر کی غصیلی آواز سنی۔ خود مجھے گرفتار کر کے اب بھولا بن رہا ہے لنگڑے۔ چشم زدن میں اس نے بیٹی سے بھرا ہوا پستول کھینچا اور نشانہ لے کر گولی چلا دی لنگڑا بسودنیانے اپنے پر گولی کھا کر زمین پر گرا اور تر پنے لگا۔

جیکسن نے تیزی کے ساتھ چک دیر کا ہاتھ پکڑ لیا اس کا گھوڑا چک دیر کے گھوڑے کے برابر ہی کھڑا تھا۔

آپ نے ایسا کیوں کیا راجا صاحب۔ جیکسن اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔

چک دیر نے اپنے ہاتھ چھڑانے کے لئے جھٹکا دیتے ہوئے جواب دیا۔ یہ غدار ہے اس نے مجھے گرفتار کر دیا۔

آپ کا خیال غلط ہے۔

کیسے غلط ہے۔ اسی کے کہنے پر تو تم لوگ پہلے سے جنگ میں سرنگ کے وہانے پر موجود تھے۔

مجھے تو اس سرنگ کے حلقے کی خبر ہی نہیں بتلایا گیا تھا۔ بکواس کرتے ہو تم۔ چک دیر زور سے بولا اور اسی لمحے جیکسن نے اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔

ادھر تو راجا چک دیر گرفتار کر لیا گیا ادھر ٹھکیری میں جہز فریزر نے بساط سیاست پر ایسی چالیں چلیں کہ ریاست کے عوام کو بھی بہتر معلوم ہوا عارضی طور پر انگریز ہی کوڑک کا حکم وقت سنبھال لیں پوچھنا اور کشمشی نارائن بھی بے بس ہو کر رہ گئے کیوں کہ انگریز فوجوں نے مملہ پوری ریاست کا نظام سنبھال لیا تھا مالک ناڈ سے راجا کی گرفتاری کی خبر بھی آ چکی تھی۔ پوچھنا اور ریاست کے دوسرے بھی خواہوں کو بھی یہی قیمت معلوم ہوا تھا کہ انگریز جہز اب تک ریاست پر کوڑکیوں کے حق کو تسلیم کر رہا تھا رانی گورما اس پر آمادہ نہیں ہوئی کہ شوہر کی موجودگی میں عکرائی کرے انگریز جہز ہندوستانی تہذیب اور رسوم و روایات سے اچھی طرح آگاہ تھا وہ اسی لئے سداقت پر پہلا حق رانی کا



تسلیم کر چکا تھا رانی کی موجودگی میں بو پٹنا بھلا کیسے انگریز جنرل کی یہ تجویز قبول کر لیتا کہ انگریزوں کی سرپرستی میں وہ حکمران بن جائے اس نے صاف انکار کر دیا جنرل فریزر نے ایک ایک کر کے تخت سلطنت کے تمام دعویداروں کو عوامی حمایت کی آڑ میں الگ کر دیا راجا چک ویر کے گرفتار ہونے کی خبر ملتے ہی اس کا ایک خاص قاصد میسور روانہ ہو گیا میسور میں کری اپا اور ویرنا کو قید کے دوران میں قتل کر دیا گیا بو پٹنا سے اس نے یہ بہانہ کر دیا کہ وہ دونوں میدان جنگ میں مارے گئے چین بسو کا تعلق راج گھرانے سے نہیں تھا اس لئے عوام اور بو پٹنا اس کے حق میں نہ ہوئے، بہن سے زیادہ بیوی کا حق ہوتا ہے عوام نے شاطر انگریز جنرل کی یہ بات مان لی، جب رانی گورمانے انکار کر دیا تو پھر راجکمار پٹا ہی رہ گئی وہ ابھی نابالغ تھی سو کسی عارضی بندوبست کی بات سامنے آئی کہ جب راجکمار نابالغ ہو جائے گی تو اسے ریاست کا حکمران بنادیا جائے گا تب تک انگریز ہی ریاست کا کاروبار چلائیں گے اور راج گھرانے کے افراد میسور میں ان کے پاس رہیں گے۔

نالک ناڈ سے بسودیا کی لاش آئی تو عوام کو بھگوتی کے بارے میں سب کچھ پتا چل گیا، لنگ راج نے اس سے باقاعدہ شادی نہیں کی تھی بلکہ اسے صرف واسنتہ بنا کر رکھا ہوا تھا۔ بسودیا اس کی ناجائز اولاد تھا۔ بھگوتی کے فرار ہونے پر دو ڈونے بسودیا کی پرورش کی تھی۔ وہ اس راز سے واقف تھی۔ لنگ راج نے اس سے رازداری کا عہد لیا تھا بسودیا چک ویر کے ہاتھوں مارا گیا تو دو ڈونے عہد قائم نہ رکھ سکے اور زبان کھول دی۔

جنرل فریزر نے اس پر کہا کہ اگر بسودیا زندہ بھی بچ جاتا تو اسے حکمرانی کا حق نہیں تھا کیوں کہ وہ اپنے باپ کی جائز اولاد نہیں تھا۔ بیٹے کی موت کا بھگوتی پر اتنا زیادہ اثر ہوا کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور وہ اسی

حالت میں جنگوں کی طرف بھاگ گئی۔

پھر میری آنکھوں نے مستقبل کا آخری منظر دیکھا، یہ ایک خود سر عیاش ظالم اور بدکردار بددوراجا چک ویر کا انجام تھا اسے مذکیری لایا جا چکا تھا اگلے روز صبح سویرے جنرل فریزر نے بو پٹنا اور لکشمی نارائن سے ملاقات کے بعد چک ویر سے ملنے کا فیصلہ کیا وہ اکیلا ہی راج محل پہنچا تھا بو پٹنا وغیرہ میں سے کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا راج محل کی حیثیت اب ایک قید خانے کی ہی تھی۔ چک ویر کے کہیں آنے جانے پر پابندی تھی راج محل کو فوجیوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا یہاں تک کہ محل کے اندر بھی پہنچا تھا۔ چک ویر جس کمرے میں تھا اس کے دروازے پر بھی ایک مسلح کوڑی سپاہی موجود تھا۔ انگریز جنرل نے چک ویر کو اس وقت تک کئے جانے والے فیصلوں سے آگاہ کیا۔

مجھے ہی راجا رہنے دیں نا میں ہر طرح آپ کی حکومت کی اطاعت کروں گا۔ چک ویر کے لہجے میں بلا کی حسرت تھی۔ یہ ناممکن ہے۔ انگریز جنرل نے انکار کر دیا۔ زیادہ سے زیادہ راجکمار آگے چل کر یہاں کی حکمران بن سکتی ہے یہ بات بھی ہماری حکومت کے وائسرائے کی مرضی پر منحصر ہے۔ اب آپ کو مشکور جا کر اس سرکار عمارت میں رہنا پڑے گا جہاں ٹیپو سلطان کے بیٹوں رکھا گیا تھا۔ انگریز جنرل نے بتایا پھر مزید بولا۔ پہلے ہم آپ کو میسور میں رکھنا چاہتے تھے مگر وائسرائے بہادر کا فرمان اس سلسلے میں موصول ہو گیا ہے اور فرمان کی رو سے آپ کے ساتھ رانی اور راجکمار بھی وہیں رہیں گے۔

چک ویر کا سر جھک گیا اور ایسا جھکا کہ پھر جتنی وہ انگریز جنرل وہاں رہا وہ سراسٹاکے بات نہ کر سکا۔ وہ ٹیپو سلطان کے بیٹوں کا ذکر سنتے ہی سمجھ گیا تھا کہ اسے اور اس کے مختصر خاندان کو انگریزوں نے اپنا قیدی بنالیا ہے۔ راج محل سے انگریز جنرل کی واپسی کے بعد ہی پہلے

فار شدہ ایک اعلان کی منادی کرادی گئی اس اعلان میں لکشمی نارائن اور کوڈگ کے اہم دبا اثر افراد کے تھے سب سے اوپر جنرل فریزر نے دستخط کئے تھے ان مندرجہ ذیل تھا۔

راج کوڈگ کے عوام نے ایک ذہن ہو کر یہ خیال کیا کہ اب انہیں چک ویر کے نظام حکومت سے نہیں اس کی بجائے انگریز حکومت کو ریاست اسی حد اپنی حدود مملکت میں لے لینا چاہیے جس طرح ہندوستان کی دوسری ریاستیں اس کی حدود میں شامل ہیں۔ ہندوستان کے وائسرائے بہادر نے کوڈگ کے عوام کی اس درخواست کو قبول کر لیا ہے اس کی تاریخ سے یہ ریاست انگریز حکومت کے ماتحت رہے گی۔ حکومت اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ اگر کسی اور کسی بھی صورت میں ریاست کو سابق راجا پر واپس کرے گی، عوام کے مذہبی عقائد و معاملات بدل نہیں دے گی، حکومت عوام کی بہتری کے لئے کام انجام دیتی رہے گی۔

مستقبل کے سارے منظر میرے صفحہ ذہن سے ہو گئے عظیم محکم کی سرگوشیاں بھی معدوم ہو گئیں میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں کم پاور کا لمبہ دستور چل رہا تھا میری نظر سامنے لگے ہوئے نالک کی طرف اٹھی ہند سے نظر آ رہے تھے ابھی اورات نہیں گزری تھی۔

وقت میرے دل میں عجیب سی خواہش پیدا ہوئی میں اپنا مستقبل بھی دیکھ سکتی۔ میری آنکھوں میں رنصار کے چہرے گھوم گئے مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا یادوں میں سے کون میری تنہائیوں کا امین بنے گا۔

پھر روز منجناشتے کی میز پر میں نے رانی کو بتا دیا کہ رازداری سے جارہی ہوں۔ وہ سارا دن رانی کے ساتھ اس نے مجھے بھیجی کی خوب سیر کرائی کوئی تفریحی مقام لے نہیں چھوڑا عادل بھی ساتھ ہی تھا اور ہم دونوں ہی

میک اپ میں تھے وہ ایک طرح سے پکنک سی تھی۔ ☆

طویل عرصے کے بعد جب میں راجا استاد کے دروازے پر دستک دے رہی تھی تو مجھے عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے کمرے سے میری بہت سی شیریں اور سٹخ یادیں وابستہ تھیں۔ میں اکیلی ہی تھی عادل کو میں نے بھیجی سے دہلی بھیج دیا تھا میں دانستہ راجا استاد کے یہاں پہنچا تھا۔ آئی تھی مجھے اس کی اور ہمایوں کی کچھ ایسی غلط فہمیاں دور کرنا تھیں جنہوں نے میرے کردار کو ان کی نظر میں گرا دیا تھا، انہی غلط فہمیوں کی بنا پر خود میں بھی اپنی نظر میں گری گئی تھی حالانکہ میرا دامن بے داغ تھا اس وقت صورت حال ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ میں ان لوگوں کو حقائق سے آگاہ نہیں کر سکتی تھی، واقعات پے در پے پیش آ رہے تھے۔ لہذا چپا نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔ وہ مجھے ذلیل درسا کرنے کی خاطر پستیوں کی انتہا پر پہنچ گئی تھی ڈیان کوڑی دام لانے کے علاوہ میں چپا سے انتقام لینے ہی کے لئے کلکتے آئی تھی۔

وہ صبح کا وقت تھا، مجھے تو قلع تھی کہ راجا استاد اور ہمایوں دونوں ہی گھر پر ہوں گے، ان دونوں کے علاوہ اس گھر میں ایک اور پیاری سی لڑکی بھی تھی شانتی، وہی لڑکی جو ہمایوں کو زندگی بھر کے لئے اپنانے کی خاطر میرے ایما پر مسلمان ہو گئی تھی اس کا فرضی نام صبیحہ رکھا گیا تھا جو ہمایوں سے شادی کے بعد فرضی نہیں رہا تھا۔ دروازہ کھولنے والی وہی تھی۔ کس سے ملتا ہے جی۔ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

میرے چہرے پر میک اپ تھا اور میں ساڑھی باندھے ہوئے تھی وہ بھی ساڑھی ہی میں تھی۔ آپ ہی سے ملتا ہے جی۔ مجھے شرارت سو جھی اپنے دونوں سوٹ کیس میں نے ہاتھ سے رکھ دیئے تھے۔ میں آواز بدل کر بول رہی تھی۔



مجھ سے۔ وہ حیران سی ہوئی۔ پر میں۔۔۔ میں تو آپ کو نہیں جانتی۔

میں تو جانتی ہوں تمہیں میں مزید بے تکلف ہو گئی۔ یعنی تمہارے میکے سے آئی ہوں میں۔ ارے تم نے مجھے نہیں پہچانا شانتی، میں تمہاری دیدی ہوں راجپور میں تمہارے گھر کے سامنے ہی تو رہتی تھی۔۔۔ بڑی مشکل سے تمہارا پتا چلا یا ہے، تم جس نوجوان کے ساتھ راجپور سے بھاگی تھیں اس کے بارے میں وہیں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ کلکتے کے ایک نائی گرامی دادا راجا استاد کے ساتھ رہتا ہے یہاں آ کر راجا استاد کا ٹھکانا۔

ارے اوسیدہ کون عورت ہے یہ۔ اندر سے راجا استاد کی حیرت و سدا آواز آئی اس کے کمرے کا ایک دروازہ گھر کے صدر دروازے سے دور نہیں تھا اس نے یقیناً میری باتیں سن لی تھیں۔ تھکیٹ لے اسے بالوں سے پکڑ کر اندر میں ابھی آیا۔

اب مزید شرارت مہنگی پڑ سکتی تھی اس لئے میں نے فوراً خود کو صیغہ پر ظاہر کر دیا۔

ارے دیدی تم نے تو مجھے ڈرائی دیا تھا۔ وہ میرے گلے سے لگ گئی۔ مجھیں بھرنے اور آواز بدل کے بولنے میں تو تمہارا جواب نہیں۔

میں نے غلط تو نہیں کہا تھا، دیدی ہونے کے ناطے میں میکے والی ہی ہوئی نا۔

اسی وقت راجا استاد اپنے کمرے سے نکل آیا اس نے وہیں سے ہانک لگا لی۔ ابے او ہمایوں ڈراؤ کچھ تو کون آیا ہے ارے اپنی رانی آئی ہے رانی۔

ڈرائی دیر بعد میں، راجا استاد کے کمرے میں بیٹھی تھی اور ہمایوں بھی ساتھ بیٹھا تھا۔ صیغہ ہمارے لئے چائے بنانے گئی تھی مجھ سے مل کر میرے واپس آنے کی خوشی میں ان لوگوں کے چہروں پر ایسی رونق تھی جیسے کوئی گمشدہ خزانہ مل گیا ہو۔ وہ مجھے ابھی تک بھینکی کی رانی ہی سمجھتے ہوئے تھے آج یہ عقدہ بھی کھلتا تھا۔

اب یہ اپنے چہرے سے جھلی تو اتار دو۔ راجا استاد کہنے لگا۔ تمہارا چہرہ دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔

میں نے راجا استاد کی خواہش کو رد نہیں کیا۔ یہ ہوئی نا بات۔۔۔۔۔ ہمایوں بھی خوش ہو گیا۔

میں تو کہہ گئی تھی استاد کہ آپ سب میری کوششیں کر رہیں، وہاں پہنچی تو پچانک پر تالا پڑا تھا اس لئے سیدگ ادھر آ گئی۔

کوشش کی تعمیر کے بعد کچھ دن رہے تھے ہم وہاں۔ راجا استاد نے بتایا۔ مگر کسی کا دل ہی نہیں لگا وہاں مجبوراً ہمیں آگئے۔ بات یہ ہے رانی کہ ایک تو ہم لوگو تمہاری طرح کوشیوں میں رہنے کے عادی نہیں، دوسرے یہ کہ آدمی کو چاہے غل و ملے دور رہنے کو ہاں جھونپڑی کا سا آرام کہیں نہیں ملتا۔

ہاں یہ بات تو ہے استاد۔ میں بولی۔ پھر صیغہ چائے بنا کر لے آئی۔

تمہارا کپ کہاں ہے بھئی۔ کیا تم میرے ساتھ چائے نہیں پیو گی۔

ابھی ہمایوں کے ساتھ پی تھی دیدی تمہارے آ سے ڈرائی دیر پہلے، میں تو ویسے بھی زیادہ چائے کھ پیتی، جہیں معلوم ہے۔

اچھا تو پھر تم بیٹھو تو جاؤ یہاں مجھے کچھ باتیں کرنا، تمہارا بھی یہاں ہونا ضروری ہے۔

کوئی بہت خاص بات ہے کیا۔ راجا استاد نے ا کر کہا۔ خاص باتیں کرنے کی عادت گئی نہیں ابھی۔ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا میں نے اس کے لہجے کی معنی خیزی کو نظر انداز کرنا ہوئے گفتگو شروع کر دی۔ پہلی بات تو یہ سن لو کہ تم لو مجھے جو سمجھتے آئے ہو میں وہ نہیں ہوں۔

یعنی کیا نہیں ہو۔ بتاؤ نا صاف صاف بات کرو۔ استاد نے کہا۔

بھینکی کی رانی، میں بھینکی کی رانی نہیں ہوں۔

اس پر راجا استاد کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر وہ ہنستے ہوئے ہمایوں سے مخاطب ہوا۔ شانتی نے تھوڑی دیر یہ معلوم ہوگا کہ میں دراصل راجا استاد نہیں۔ وہ پھر زور سے ہنسا۔

میں سنجیدہ رہی اور راجا استاد کو رانی کے بارے میں بتانے لگی۔ آخر میں اس سے میں نے کہا۔ میں اس وقت بھینکی سے آرہی ہوں جہاں رانی کی مہمان تھی۔ پھر اسے یقین دلانے کی ایک تدبیر میری سمجھ میں آ گئی میں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

راجا استاد کے ساتھ ہمایوں نے بھی مجھے بے یقینی سے دیکھا۔ اس کے بعد راجا استاد بولا۔ کلکتے میں ایک آدمی ہے تو سہی جس نے بھینکی کی رانی کو ضرور دیکھا ہوگا، پرانا گھاگ ہے مگر اب اس نے یہ لائن چھوڑ دی ہے آدمی کو خراب ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ وہ اپنے ہی فقرے پر خود ہنسا پھر کہنے لگا۔ لیکن یہ سارا چکر چلانے کی ضرورت کیا ہے آخر۔

میری بات سنیں۔ ہمایوں بول اٹھا۔ چلیں مان لیا ہم نے تھوڑی دیر کو کہ آپ بھینکی کی رانی نہیں پھر۔ اس ماننے زمانے سے ہوگا کیا۔ اور یہ کہ رانی نہیں تو کون ہیں۔

میرا اصل نام معبد ہے۔ میں نے اپنا نام بتانے میں کوئی دیر نہیں کی۔ متحدہ لوگوں کو میرا نام معلوم تھا اگر انہیں بھی معلوم ہو جاتا تو کیا فرق پڑتا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا۔ میرا تعلق ہندوستان سے نہیں میں باہر سے ایک خاص مقصد کے تحت یہاں آئی ہوں وہ مقصد بھی بتا دوں کہ مجھے اپنے دشمنوں سے انتقام لینا تھا میرے دشمنوں میں اس ملک کے لوگ بھی شامل ہو گئے ان میں سے کچھ پراسرار شیطانی قوتوں کے مالک تھے مجھے بھی میرے خالق نے ان شیطانی قوتوں سے بچنے کے لئے چند قوتیں عطا کی ہیں سو میں اپنے دشمنوں سے لڑتی رہی میرے اہمی دشمنوں میں ایک خبیث اور بد کردار ہندو عورت ہاں بھی تھی۔ میں نے لعنتی چپا کی شیطانی قوتوں کے

معلق مختصر ایتایا۔

حیرت ناک اور ناقابل یقین سی باتیں کر رہی ہوں۔ راجا استاد دیدے کھما کر بولا۔

نہیں یہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔ اچانک میں لعنتی چپا کی آواز سن کر اچھل پڑی۔

میرے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ چپا میری ہی شکل و صورت اختیار کر کے ظاہر ہو چکی تھی وہ کچھ ہی قاصلے پر کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔

زندہ فحش گئی تو۔ میری آواز میں اس کے لئے غصہ بھی تھا اور تحقارت بھی۔

ہاں معبد۔ تجھے مارے بغیر میں کیسے مر سکتی ہوں۔ اب وہ میری ہی آواز میں بولنے لگی راجا استاد اور ہمایوں کی ساری دادا گیری دھری رہ گئی، وہ تصویر حیرت ہے ہوئے چپا کی طرف دیکھے جا رہے تھے صیغہ انتہائی خوفزدہ ہو کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگی معاً چپا نے اپنا ہاتھ بلند کر کے مخصوص انداز میں کھمایا۔ اسی کے ساتھ ایک روشن حصار میری اطراف قائم ہو گیا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ میں نے تجھے قید کر لیا اب تیری قوت کام نہیں کرے گی اس طرح میں تجھے یہاں سے نکالی گھاٹ کے مندر لے جاؤں گی جہاں درگا دیوی کے چلے حیرت انتظار کر رہے ہیں تجھے یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ ان کے انتظار کی وجہ کیا ہو سکتی ہے، جب میں تیرا غرور خاک میں ملتا ہوا دیکھ لوں گی تو تجھے قربان گاہ کے چبوترے تک لے جاؤں گی بہت دن سے کسی آدمی کو ملی نہیں پڑ جایا گیا، درگا دیوی خوش ہو جائے گی جب تیرے خون کے چھیننے اس کی سورتی پر پڑیں گے، اچھا کیا تو نے کہ خود ہی جادو کی اس سرزمین پر آ گئی۔

جواب میں میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ممکن نہ ہوا، نہ میں بول سکتی تھی نہ اپنے جسم کو حرکت دینے پر قادر تھی۔ اسی وقت معلوم نہیں راجا استاد کو کیا سوچھی اس نے







# مریم

اس قدر تھکاوٹ تھی یاد جو دم  
اولاد کی خوشی میں ساری تلخیاں بھول  
کر ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ ہمارے  
چہروں کی تازگی نے ہماری تھکاوٹ چھپا دی تھی۔  
گھر کے تمام لوگ ہمارے خوش و پرست  
چہروں کو دیکھ کر خوش تر ہو رہے تھے۔  
مگر کسی کی ہمت نہیں ہو رہی  
تھی کہ وجہ معلوم کریں۔

مصعود صدیقی

ایک مصعوم لڑکی کی داستان جو کسی سفال کی ہوس کا شکار ہو گئی

جتنا تک نقشہ صورت شکل اچھی تھی بلکہ حسین تھی۔ دیکھا  
یہی پرکشش اس کا جوان جسم بھی تھا۔ مگر بہت ہی غلیظ منی  
اور کچھڑ میں لت پت کئی کئی دن نہ نہانے اور گرد و غبار کی  
وجہ سے اس کے بالوں کی ٹیس بن گئی تھیں۔ دن بھر بازار  
میں گھومتی رات مسجد کی سیڑھیوں پر سو جاتی۔ نہ سردی کا اثر  
نہ گرمی بارش کی پردہ۔

دکان دار ترس کھاتے تو خالی یوریاں اس پر ڈال دیتے  
تاکہ سردی سے بچی رہے۔ کبھی کبھی دکان دار کچرا چھینے والی  
عورتوں کو کچھ پیسے دے کر اس کو تھلو ان دیتے چندہ کر کے  
ریڈی میڈ کپڑے پہناتے۔ کبھی چوٹی ہوتی تو یہ غلیظ مریم  
شہزادی لگتی۔ سب اس کو اماں اماں کہتے جو وہ مانگتی چاہے  
کتنی ہی قیمتی ہو خوشی خوشی اس کو دے دیتے۔ کیونکہ ان کا  
خیال تھا ان کا کاروبار اسی ماں کی دعاؤں سے چل رہا  
ہے۔ مگر سب کو انیسویں تھا کہ یہ پاگل ہے۔ اسی لیے یہ  
پاگل لڑکی ان سب کی اماں تھی۔

مگر یہ کس کو اماں کہتی اور کس کو اماں کہہ کر گئے لگتی۔ اس  
کے اماں ابابھی کبھی اسی محلے میں رہتے تھے۔ اچھے کھاتے  
پیتے کاروباری لوگ تھے۔ دولت ان کے اوپر تلے تاج  
رہی تھی۔ کون سی ایسی نعمت تھی جو اللہ تعالیٰ نے انہیں نہیں  
دی تھی۔ بس نہیں دی تھی تو اولاد نہیں دی تھی۔ ان دونوں  
میاں بیوی کو بڑا قلق تھا کہ اللہ میاں نے اولاد جیسی نعمت

سے محروم رکھا ہے۔

مریم کے باپ نے ہر اس ڈاکٹر یا اسپتال میں اپنا اور اپنی  
بیوی کا علاج کرایا چاہا۔ جہاں جہاں کے ڈاکٹر کا اس کو پتا  
چلا مگر ہر جگہ سے جواب یہی ملتا کہ وہ دونوں لا علاج ہیں  
دولت میں کھیتے تھے مگر اولاد جیسی دولت سے محروم۔

کسی کا بچہ یا کسی ادارے سے کسی مصعوم کو گود لینا  
چاہتے تو عجیب اتفاق کہ وہ بچہ ہی مر جاتا۔ انہوں نے  
اپنے آپ کو کوسنا شروع کیا۔ دل پر پتھر رکھ لیا اللہ کی مرضی  
پر اپنی خواہش کو چھوڑ دیا۔

ایک دن مریم کی ماں محن میں برتن صاف کر رہی تھی۔  
کہ ایک فقیر نے صدائے گائی اللہ کے نام پر کچھ دے دے  
مائی۔ اللہ تم کو بہت دے گا تیری ہر دعا قبول فرمائے گا۔  
اولاد نہ ہونے کے غم میں غڑ حال مریم کی ماں برتن پر  
کراہتی ٹپنے ڈپنے سے بچتی گراہ کھولی اور دس روپے کا  
نوٹ بابا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”بہت غم ہے اولاد کے نہ ہونے کا؟“ مریم ان کے  
قدموں میں سر رکھ کر گڑ گڑانے لگی۔ ”بابا جب آپ یہ جانتے  
ہیں کہ میں بے اولاد ہوں؟ تو یہ بھی ضرور جانتے ہیں کہ مجھے  
کیا کرنے سے اولاد مل سکتی ہے میں اولاد کے لیے اپنی جان  
بھی دے سکتی ہوں۔ میں نے بہت علاج کرایا مگر اس ترقی  
یافتہ سائنس نے ہم دونوں کو لا علاج بتایا ہے اب آپ ایسا





کچھ کریں مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ کیونکہ آپ اللہ کے قریب ہیں۔ مجھے یقین ہے اللہ آپ کی ضرورت سے گا۔ دیکھو بیٹی میں ایک گناہ گار بندہ ہوں۔ بھیک مانگ کر گزارہ کرتا ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر میری دعا سے تمہیں کچھ فائدہ ہوگا۔ اللہ سب کو معاف کرے وہ سب کی سزا ہے سب کو دیتا ہے دیر ہے اندھیر نہیں۔ اب چھوڑو میرے پاؤں خدا کی خدمت کر جانے دو۔ دیکھ میں اللہ کے قریب ہوتا تو یوں بھیک نہ مانگتا پھرتا۔ یوں ذلیل و خوار نہ ہوتا؟ تمہارا کیا خیال ہے کیا مجھے اس طرح بھیک مانگنا اچھا لگتا ہے؟ کیا میں اللہ سے اپنے لیے کچھ نہیں مانگتا؟ پھر بھی میں اس کی ذات سے مایوس نہیں! وہ ضرور سنے گا میری بھی اور حیرتی بھی۔ وہ بڑا بے نیاز ہے کس کو کب نوازے کچھ پتا نہیں۔“

”نہیں بابا میں آپ کو نہیں چھوڑوں گی۔ آپ میرے لیے دعا بھی کریں اور یہ بھی بتائیں مجھے کیا کرنا ہوگا؟ میں جان بھی دے سکتی ہوں اولاد کے لیے۔“

”اچھا تو سن! یہاں سے بارہ کوس دور مغرب کی سمت پہاڑوں کے بیچ ایک غیر معروف قبر ہے۔ ہر طرف دیرانی ہی دیرانی ہے۔ نہ کوئی پرندہ نہ چرند۔ اس ویران راستے میں تمہیں نہ کھانے کو ملے گا نہ پینے۔ قبر سے کچھ پہلے ایک مرد ناچتا ہوا ملے گا اس کے پاس پانی کے مشکے بھی ہوں گے۔ وہاں پانی بھی پیتا اور اس دیران قبر کا پتا بھی پوچھنا۔ وہ انکار کرے گا۔ مگر تم ایک ہی رٹ لگائے رکھنا ہمیں دیران قبر کا پتا بتا دو۔ جب وہ تم لوگوں کی سچی گن کا یقین کر لے گا تو تمہیں دیران قبر تک لے جائے گا۔ تم اپنے شوہر کے ساتھ فجر کی نماز پڑھ کر نکل جانا۔“

☆☆☆

”میں تمہیں قبر تک لے جاؤں گا۔ پھر بھی اچھا ہے کہ تم یہ ضد چھوڑ دو۔ کیونکہ وہاں بڑے بڑے زہریلے سانپ ہیں۔ رات کو آدم خور جانور رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ڈاکو بھی رہتے ہیں تمہیں لوٹ کر لے جائیں گے۔ پھر وہاں نہ کچھ کھانے کو ملے نہ پانی۔ معلوم نہیں بابا تمہیں کب بشارت

دے گا؟ جب تک بشارت نہ ہو تم وہاں سے ہٹاؤ اور جب بابا بشارت دے دے پھر وہاں رکنا نہیں رکھتیں شکرانہ پڑھ کر فوراً واپس ہو جانا۔ باقی بدلتے تمہیں خواب میں ملیں گی۔ ان ہدایات سے ذرا بھر ادھر ادھر نہ ہوتا۔ ورنہ برباد ہو جاؤ گے۔“

”اچھا بھائی ہمیں قبر تک لے چلو ہم ان سب باتوں پر خیال رکھیں گے۔ کیونکہ ذرا سی غفلت کرنا ہمارا ہی نقصان ہوگا اور ایسا ہم کیوں چاہیں گے؟“

”اچھا! تو آؤ تم اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ لو اور تم میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑنا۔ اپنی آنکھیں بند رکھنا جب تک میں کہوں مت کھولنا۔ چاہے کتنا ہی ڈر لگے۔ کیسی سرگوشیاں یا حیرت ناک آوازیں آئیں۔ ایک آنکھیں نہ کھولنا دوسرے ایک دوسرے کا ہاتھ نہ چھوڑنا اللہ نے چاہا تو ہم بابا تک پہنچ جائیں گے۔“

کافی دور چلنے کے بعد ہمارے رہنے والے آنکھیں کھول کر کہا۔ جب ہم نے آنکھیں کھولیں تو سامنے ایک پرانی قبر آئی۔ جس کی لمبائی دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یہ بہت پرانی ہے۔ ہم نے فی وی پر دیکھا تھا۔ شاید یہ فرعون کے زمانے سے ہوگی۔ اس قبر پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ ان کی پوٹا سن کر جھرجھری آئی تھی۔ مگر ہم ہمت کر کے ایک سال ستھری جگہ بیٹھ گئے۔ دور کتیں شکرانہ ادا کیا اس کے بعد اللہ کی اللہ میاں ہماری مراد پوری کر دے بابا آپ سے بھی دعا ہے ہماری کہ آپ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔ آپ کی تاریخ تو نہیں جانتے پھر بھی آپ کی عقیدت میں یہاں تک آئے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہمارے لیے دعا کریں گے۔ اللہ میاں ہمیں اولاد کی دولت سے مالا کرے۔ آپ اللہ کے خاص بندوں میں سے ہیں وہ آپ ضرور سنے گا۔ جب تک آپ ہم سے نہیں کہیں گے ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔ اپنے گھر واپس جب ہی جائیں گے جب ہمیں بشارت ملے گی۔“

دعا ختم کر کے پیچھے کی طرف دیکھا تو حیران رہ گئے

کیونکہ ایک حبشی کھانے کی ٹرے لیے کھڑا تھا۔ ہم کبھی کھانے کی ٹرے کو دیکھتے کبھی حبشی کو! شاید وہ ہمارے تذبذب کو سمجھ گیا تھا۔ اس نے کھانا ہمارے سامنے رکھا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مٹی کے برتنوں میں کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد مٹی کے لوٹے میں لایا ہوا پانی پیا۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ لوٹے میں پانی جوں کا توں بھرا تھا۔ رات کافی ہو چکی تھی ہم نماز سے فارغ ہو کر سو گئے۔

فجر کی اذان کی آواز پر آنکھ کھلی۔ اذان کی آواز برابر آ رہی تھی۔ مگر بندہ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی نے مٹی کے لوٹے والے پانی سے وضو کیا۔ دیکھا لوٹا پھر پانی سے بھرا ہوا تھا باجماعت نماز شروع ہوگی۔ قرائت کی آواز آتے ہی ہم نے نیت کر لی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو پلٹ کر دیکھا۔ تو ہمارے سوا کوئی بندہ تھا نہ بندہ بشر؟ یا اللہ یہ کیسے کیسے معجزے دکھا رہا ہے۔ ایک معجزہ ایسا بھی دیکھا کہ ہم صاحب اولاد کہلا گئے۔

رات کے کھانے کی طرح ہمارا ناشتہ بھی آیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم نے نقلی نماز شکرانہ ادا کیا۔ اللہ سے بھی دعا کی اور ان دیران بابا سے التجا کی کہ وہ ہمارے لیے دعا کریں کہ وہ ہمیں اولاد جیسی دولت سے مالا مال کرے۔ پھر ہمیں نیند آ گئی اور ہم سو گئے۔ خواب میں ایک بزرگ نے بشارت دی۔ اب آپ لوگوں کا کام یہاں ختم ہو گیا ہے آپ لوگ اپنے گھر لوٹ جائیں۔ اللہ بڑا بے نیاز ہے جانے کب اور کیسے نوازے اللہ حافظ بزرگ غائب ہو گئے۔ ہماری نیند بھی ٹپٹ ہو گئی، ہم بستر سے اٹھ کر ہاتھ منہ دھو رہے تھے کہ ہمارے سامنے وہی اللہ کا بندہ کھڑا تھا۔

آپ لوگ قسمت والے ہیں بہت جلد شنوائی ہوئی ہے ورنہ تو ہفتوں اور مہینے بھی لگ جاتے ہیں۔

مجھے آپ دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ میں آپ لوگوں کو لینے آیا ہوں کیونکہ آپ لوگوں کو اپنے گھر واپس جانے کو کہا گیا ہے۔ آپ لوگ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ مجھے میرا بانی کا بھی حق نہیں ہے۔ اللہ مالک ہے۔ پھر انشا اللہ تو

پھر چلیں؟ تھوڑی دیر بعد ہمیں آنکھیں کھولنے کا حکم ملا۔ ہم نے آنکھیں کھولیں تو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ہمارا رہنما غائب تھا۔

اس قدر تھکاوٹ کے باوجود ہم اولاد کی خوشی میں ساری تکلیفیں بھول کر ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ ہمارے چہروں کی تازگی نے ہماری تھکاوٹ چھپا دی تھی۔ گھر کے تمام لوگ ہمارے خوش و پر مسرت چہروں کو دیکھ کر خوش ضرور ہو رہے تھے۔ مگر کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وجہ معلوم کریں۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم نے بازار سے کپڑا خریدائیں چار دیکیں پکھلائیں۔ غریبوں میں کھانا کپڑا تقسیم کیا۔ مریم کی ماں کو تو نشہ ہو گیا تھا۔ اولاد کے آنے کی خوشی سے سرشار ہو رہی تھی۔ ہر طرف چہکتی پھر رہی تھی۔ کبھی سوچتی لڑکا ہوا تو کیا نام ہوگا اور لڑکی ہوئی تو کیا نام پھر شوہر سے پوچھتی تو وہ بھی مسکرا کر جواب دیتا لنگی ہو گئی ہے پہلے ہو تو جانے دے۔ کیا پتا ہم کیا سوچ رہے ہیں اور اللہ کیا کرنے والا ہے۔

دو چار ہفتے اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن اچانک مریم کی ماں کو چکر آیا۔ وہ گر پڑی۔ گھر کی عورتیں اس کو بانجھ سمجھتی تھیں۔ اس لیے کسی کے دماغ میں چکر والی بات نہیں آئی۔ اسپتال لے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اب ان کے گھر میں عید کا سماں تھا۔ خیرات کپڑا کھانا غریبوں میں دل کھول کر تقسیم کیا گیا۔ مریم کے باپ کا سینہ چوڑا ہو گیا۔ گردن میں تھوڑی اکڑ بھی آ گئی۔ کیوں نہ آئی سالوں بعد وہ باپ بننے والا تھا۔ صاحب اولاد ہونا بھی کتنا بڑا اعزاز ہے اس کے لیے۔

دن ہفتے مہینے اس طرح گزرتے رہے۔ اپنے گھر آنے والے ننھے ننھے مہمان کے لیے کپڑے جوئے کھلونے اور کیا کیا چیزیں اکٹھا کرنے لگے۔ کبھی سوچتے لڑکا ہوگا کبھی سوچتے لڑکی ہوگی۔ اس کو بخار نہ ہو جائے۔ دیکھو بھئی نزلہ کھائے تو خیر ہے۔ اس کو لوگوں کی نذر سے بچاؤ یہ بچوں کو بہت پریشان کرتی ہے۔ کاجل کا نیکہ اس کی پیشانی یا گال پر



بیٹ لگاتی رہتا۔ کچھ دعائیں بھی یاد کر لیتا تاکہ دم کر سکیں۔  
دیکھو بھائی تیرے تیرے چلو وزن نہ اٹھاؤ اللہ نے بہت کچھ دیا  
ہے۔ کام دھندے کے لیے ایک ٹوکری رکھ لو۔ میں تو سوچتا  
ہوں کیوں نہ ایک نرس بھی رکھ لیں تمہارا چیک اپ بھی کرتی  
رہے گی اور بچے کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی۔  
خدا خدا کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ اب مجھے  
چنے دن رو گئے ہیں۔ اللہ سب ٹھیک کرے گا۔ ہماری  
دعائیں قبول ہو گئی ہیں تم اپنے سارے ارمان پورے کر  
لیتا۔ دروازہ کے معمولی احساس بھی ہو تو فوراً بتا دیتا۔ نرس تو  
ہے ہی۔ پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔

آج کا دن مریم کے گھر والوں کے لیے انتہائی خوشیوں  
والا تھا۔ کیونکہ آج اللہ تعالیٰ نے مریم کو ان کے ہاتھوں ان  
کی گود میں دے دیا ہے۔ ہر فرد خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔  
کیونکہ اللہ میاں نے مریم جیسا حسین و نادر تحفہ دیا تھا۔  
چراغوں کرائے، مٹھائیاں تقسیم ہوئیں۔ صدقہ خیرات میں کوئی  
کٹ نہ دی۔ نئے مینے دو مینے چھ مینے سال بھر کی ہوگی۔  
سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ انہیں دنوں میں  
مریم کی ماں کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے ان کے  
گھر دوسرے آنے والے نئے مہمان کی نوید دی۔ دوسرے  
نئے مہمان کے آنے تک مریم چلنے لگی مگر اس کا دل گھر میں  
نہیں لگتا تھا۔ وہ ہر وقت گھر سے باہر رہنے لگی۔ جب گھر  
والے پریشان ہو کر اس کی تلاش میں نکلے تو یہ مسجد کی  
سیڑھیوں پر سوتی ہوئی ملتی یا پھر کسی ٹھیلے کے پیچھے سوتی ہوئی  
ہوتی۔ اس کی حرکتیں بھی پاگوں جیسی ہوتی جا رہی تھیں۔

ایک دن رات کو اس کی ماں نے خواب دیکھا۔ ایک  
بزرگ اس سے کہتے رہے تھے۔ تم کو ہم سے کیا ہوا وعدہ پورا  
کرنا ہوگا۔ مریم تمہاری نہیں ہماری بیٹی ہے۔ اب جو بھی بچہ  
ہوگا تمہارا ہوگا۔ اپنا وعدہ پورا کرو۔ مریم کو اس کے حال پر  
چھوڑ دو۔ ورنہ تم لوگ پھر سے ساجڑا جاؤ گے۔ یہی خواب مریم  
کے باپ نے بھی دیکھا۔ غم و پریشانی سے ان کی تین بیٹیاں اڑ  
گئیں۔ چھپ کر روتے مریم کے لیے تڑپتے مگر کیا کرتے

فیصل ہو چکا تھا۔ مریم کو چھوڑنا تھا سو چھوڑنا پڑا۔  
مریم اسی طرح گلی اور مسجد کی سیڑھیوں پر پڑی ہوتی۔  
اس کے ماں باپ کو یہ سب برداشت نہ ہوا اور ایک دن  
مریم کو مسجد کی سیڑھیوں پر سوتا چھوڑ کر اس شہر سے نامعلوم  
مقام پر چلے گئے۔  
اب مریم جوان ہو چکی تھی۔ غلیظ بھی رہتی تھی۔ سارے  
بازار کی اماں تھی بچے بوڑھے جوان سب ہی اس کو اماں  
اماں کہتے تھے۔ اس کے اتنے فرماں بردار تھے جتنا بچوں  
کو اپنی بیاں کا فرماں بردار ہونا چاہیے۔

بہت سے دکان داروں نے اس کو اپنی بہن یا بیٹی مانا  
چاہا۔ اس کے علاج کے لیے ڈاکٹروں کو دکھایا ڈاکٹروں  
نے اس کو علاج بتانے کے ساتھ ساتھ خدشہ ظاہر کیا کہ  
وقت کے ساتھ ساتھ اس کا پاگل پن بڑھ بھی سکتا ہے۔ کئی  
ادارے اور پاگل خانے والے اس کو اپنے پاس رکھنا  
چاہتے تھے مگر ایسا نہ ہو سکا۔

کچھ لوگوں کا کہنا تھا اگر مریم کو اسی بزرگ کے حزام  
چھوڑا جائے تو شاید یہ ٹھیک ہو جائے۔ مگر کسی کو بھی ان  
بزرگ کا ہاتھ معلوم نہیں تھا۔

ان کی پریشانی اور چپ کو دیکھ کر کچھ ہمدرد لوگوں نے  
مریم کے ماں باپ پر زور ڈالا تو انہوں نے یہ قصہ سنا یا۔  
اس کے آگے وہ کچھ نہ بتا سکے۔ اس طرح کوئی بھی نہیں  
جانتا کہ وہ ویران قبر والے بزرگ کہاں ہیں۔

اب مریم سے مسجد کی سیڑھیاں بھی چھن چکی تھیں۔ کیونکہ  
مسجد کے نمازیوں کو اس کی جوانی اور غلاطت پر اعتراض تھا۔  
اس کے مسجد کی سیڑھیوں پر سونے یا رہنے سے نمازیوں کے  
وضو ٹوٹ جاتے تھے۔ ان کے کپڑے گندے ہو جاتے تھے۔  
یہ سیڑھیاں مریم کے لیے اس کی ماں کی گود تھیں۔ سردی گرمی  
بارش میں بچے اپنی ماں کی گود میں پناہ لیتے ہیں۔ مگر مریم کے  
لیے یہ سیڑھیاں ہی ماں کی گود تھیں۔

اب مریم مسجد کی دیوار اور ٹھیلوں کے بیچ ایک چٹائی  
سوتی اٹھتی بیٹھتی تھی۔ رات کو کچھ کتے اس کے قریب

آتے تھے۔ پیشاب پانے کی بدبو سے ٹھیلے والوں کو  
اعتراض ہوا۔ مگر بازار کے خاکروہوں نے اس جگہ کی  
کیڑے داری قبول کر لی۔ اس وجہ سے مریم کی یہ  
آماجگاہ لی گئی۔ کئی دفعہ کچھ لوگوں نے اس کو شہر سے دور  
لے لے جا کر چھوڑا۔ کہ اس طرح ان کی جان  
بچائے گی۔ مگر رات کو وہ پھر موجود ہوتی۔

بکر لوگوں نے اس کو پاگل خانے میں داخل کرایا کہ یہ  
رہے گی تو تمام برائیوں سے بچتی رہے گی۔ اور ان کی  
بھینسی پھونکنے کی اور تریم بھی آرام سے رہے گی۔ مگر  
نہ ہو سکا۔ پاگل خانے والوں نے اس کو رسیوں  
سے باندھ کر کمرے کے دروازے پر بڑے  
ٹالے ڈالے کہ یہ یہاں سے بھاگ نہ سکے۔ مگر  
کئی یہ کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ رسیاں زنجیریں  
تو پڑے رہے۔ دروازوں پر ٹالے لٹکے رہے اور وہ  
در میں گھومتی رہتی دکان داروں سے چیزیں مانگتی اور  
اچھڑاتی اور آدم چاتی رہی۔

پاگل خانوں اور قہانوں سے اس طرح نکل آنے پر  
ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ کوئی غیر معمولی  
شے ہے۔ بلکہ لوگ اس کو ولی یا قلندر کی حد تک مانتے  
جائیں لوگ اور سوچ بھی کیا سکتے تھے۔ بازار کی کچرا  
لی عورتوں نے روپیہ پیسے لیے بغیر اس کو بھلا تا دھڑا  
کا۔ صاف سترے کپڑوں میں لٹکی چوٹی میں  
پی سے کم نہیں تھی۔ مگر ہٹا چینٹا سونا مسجد کی  
بھلیوں کے بیچ خرچ تھا۔

بازار میں اس کا ہاں نہیں۔ بیٹی کا درجہ تھا یہ سب کی  
و۔ مگر کچھ لوگ حیوان بھی تھے۔ ان کے لیے ماں  
بائنی کچھ نہیں ہوتی۔ صرف اور صرف ان کی خواہش  
اس ہوتی ہے۔ ایسے میں ایک ورنڈے نے اس کی  
پامال کر دی۔ اس کے نقس کو اپنے ناپاک حیوانی  
ن سے روند ڈالا۔

بچہ مریم کے بعد جب مریم کے جسم نے اندر کے راز

کو لوگوں کے سامنے ظاہر کیا۔ تو مریم کے لیے ان کی  
ہمدردیاں مجھتی ختم ہو گئیں۔ اب وہ کسی کی ماں نہیں یا  
بیٹی نہیں رہی۔ بلکہ نفرتوں، لعنتوں کا شکار بن گئی۔ اب یہ  
اودھ لگی اور غلیظ مریم بھوکے بڑے حال مریم اپنا سر کھجاتے جس  
دکان دار کے پاس بھی جاتی وہ اس کو دھکارت دیتے۔ اپنی  
دکان یا ٹھیلے کے آگے سے دھکے دے کر بھاگتے۔ وہ کیا  
کرتی روتی چلتی پکارتی وہ تو اس قابل بھی نہیں تھی کہ کسی کو  
دعا یا دعا دیتی۔ جن درندوں جن حیوانوں نے اس کا یہ  
حال کیا۔ اس کو تو یہ بھی پتا نہیں کہ اس کے ہیٹ میں کس کا  
بچہ ہل رہا ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر لوگ اس کے لیے  
موت مانگتے مگر وہ جہاں چاہے زندگی دے اور جہاں  
چاہے موت دے۔ یہ کرمیہ قدرت ہی تھا کہ وہ ایک  
پاگل کے ہیٹ میں ایک زندگی کو پروان چڑھا رہا تھا۔

ایک دن بازار والوں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک طرف  
مریم کی نگلی لاش پڑی ہے۔ اس کے قریب اس کا نومولود  
بچہ بلک بلک کر رو رہا ہے۔ اس کو کوئی گود میں نہیں اٹھاتا  
کوئی گھٹی نہیں پلاتا۔ اس کے گرد دائرے کی شکل میں  
لوگوں کا جھوم تھا۔ دائرے کے بیچ مریم اور اس کے بچے  
کے قریب تین چار کتے اپنے سروں کو جھکائے بیٹھے تھے۔  
جیسے یہ غم سے غم حال ہوں۔ کبھی کبھی وہ مریم اور ان کے  
گرد وائرہ بنائے ہوئے لوگوں کو دیکھتے۔ جیسے کہہ رہے  
ہوں 'خالدو دیکھو تمہاری ماں تو مریم کی کم از کم اپنے اس بے  
قصور بھائی کو تو اٹھا لو گھلے لگا لو ہم تو مجبور ہیں۔ حیوان  
ہیں۔ تم لوگ تو مخلوق اشرف ہوتا ہی ہے جیسا نہ دیکھاؤ۔'  
آخر ایک بھنگن نے اس بچے کو اٹھایا۔ اس کو اپنی گود میں  
لے کر گھٹی پلائی۔ پھر اس کو اپنے سینے سے چمکا کر اس کو  
چومتے ہوئے اپنے ساتھ لگایا۔ تو کتے لوگوں کی طرف منہ  
کر کے بھونکے۔ جیسے کہہ رہے ہوں لعنت ہے تم پر لعنت  
ہے تمہاری انسانیت پر۔ کے ایم سی کی کچرا اٹھانے والی  
کاڑی آئی اور مریم کو اٹھا کر لے گئی۔

☆☆☆



# ہیں کو اکب کچھ

استیاق طاہرہ منلی

ہیں کو اکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ  
دیتے ہیں یہ بازیر دھوکہ کھلا



عورت آجائے تو گھر پھر سے زندہ ہو سکتا ہے۔ مگر کسی عورت کے بغیر گھر میں کسی عورت کا آنا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اس سلسلے میں دین محمد نے بتایا کہ محلے کی ایک بڑی عمر کی بیوہ عورت کوثر پروین شادی بیاہ کر دینے کا کام کرتی ہے اس کے ارد گرد کے گاؤں کے گھروں میں بھی آنا جانا ہے۔ چنانچہ وہ اس سلسلے میں ان کی مدد کر سکتی ہے اگر وہ کہے تو کل وہ اسے بلا لائے۔ کرم داد نے سوچ لی لگا ہوں سے اپنے جواں سال بیٹوں کی طرف دیکھا مگر دین محمد سے بولا۔ ”اچھا چل جیسی تیری مرضی.... کل اسے بلا لانا....“

لیکن دین محمد نے اگلے دن اطلاع دی کہ کوثر پروین نے چھڑوں کے گھر آنے سے منع کر دیا ہے۔

”تو تو کہہ رہا تھا وہ بیوہ ہے اور بڑی عمر کی ہے؟“ کرم داد کو کوثر پروین کا اس طرح منع کر دینا ناگوار گزرا تھا۔

”وہ تو ہے... مگر ہے تو زانی۔“ دین محمد رساں سے بولا۔ ”اور ہمارا گھر.... کچھ بھی ہو.... ہے تو چھڑوں کا گھر۔“

دین محمد کے سمجھانے بجھانے پر کرم داد خود اس کے گھر پر کربات کرنے پر راضی ہو گیا۔ لڑکوں کی نکلتی عمروں کا اب اسے بھی احساس ہو چلا تھا اگلے روز وہ نیا کرتا گرگاہاں

پھوں کو بل دیتا، بڑی شان سے کوثر پروین کے بیٹوں کی شادی کی گل کرتی تھی شان سے تو جانا ایک سفید بالوں والی بڑھیا نے دروازہ کھولا۔ ”وہ نام کرم داد ہے۔“

ابندہ کل آپ سے مل کر گیا تھا۔ شادی کی گل

”ہی بسم اللہ.... آپ اندر آ جاؤ۔“ بڑھیا نے سہ دیا اور وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں ف لائین سے کئی کرسیاں لگی تھیں۔ سامنے ایک میز کے پیچھے اور دائیں جانب پہلو میں بھی ایک لڑکی تھی۔ آپ بیٹھیں جی! ”میں کوثر پروین کو بلاتی ہوں۔“ بڑھیا اندر کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھی۔

آپ.... کوثر پروین.... نہیں ہو.... میں تو آپ کو ہی مانتا ہوں۔“ کرم داد نے پلکیں پٹ پٹا کر تھوڑا اکھسیا کر کہا۔ ”جی.... میں تو اس کی ماسی ہوں۔“ بڑھیا کچھ شرما کر اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

ہندو لہجوں بعد باد بہاری کے جموں کے کی طرح کوثر نے کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک بھینسی بھینسی خشبو سے کی پوری فضا میں پھیل گئی۔ وہ اس کے سامنے مگر مگر پھولوں سے لدی شاخ کی طرح چمکتی ہوئی کی طرف بڑھی اس کی پتلی کمر پر مہندی لگے کتھی اس میں لال پرانہ لہراتا ہوا اس کے پیچھے چلا۔ وہ کے پیچھے کرسی پہ جا بیٹھی۔

”ہاں جی.... بولو.... کس کی شادی کرانی ہے۔“ کوثر نے باقاعدہ کاروباری لہجے میں پوچھا۔

”جی.... وہ مجھے....“ کرم داد نگاہ جھکا کر ہکھلانے لگا۔

”آپ ادھر تشریف لے آؤ....“ اس نے میز کے پہلو دھری کرسی کی طرف اشارہ کیا اور کرم داد اپنی نئی گاہیاں کر مارتا ہوا کوثر پروین کے سامنے دائیں طرف کرسی پر آ بیٹھا۔

شام کو لڑکوں کو چائے کے ساتھ دین محمد نے یہ خوش خبری بھی دی کہ آج ان کا باپ ان کے رشتے کے لیے ایک رشتے کر دینے والی عورت کے گھر گیا ہے۔

”دونوں کے لیے.... یا صرف بڑے کے لیے۔“ چھوٹے نے دھیمے لہجے میں رکتے تھمتے سوال کیا۔

”بڑے کی شادی ہو جائے.... اس کی دلہن گھر آ جائے تو اپنے دیور کے لیے تو وہ خود دلہن ڈھونڈ لائے گی۔“ دین محمد کے جواب پر دونوں لڑکوں نے شرما کر نکا ہیں جھکا لیں۔ مگر ان کی جھکی نظروں میں جھکاتے سینے دین محمد کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھے۔ کئی روز بیت گئے۔ مگر لڑکوں کو پھر کوئی اچھی خبر سننے کو نہ ملی۔ کرم داد روز موچھوں پر تیل مل کر نیا کرتہ پہن کر کوثر پروین کے آفس نما بیٹھک میں جا بیٹھا۔

پورا ہفتہ گزر گیا۔ آخر دین محمد نے ایک روز پوچھ ہی لیا۔ ”شادی کی گل کا کیا پتا؟“

”اوائے.... بن ہی جائے گا کچھ.... اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“ کرم داد نے موچھوں کو بل دیتے ہوئے جواب دیا۔

”عورت کے بغیر کمر کسی دوزخ سے کم نہیں۔“ دین محمد نے رقت بھرے لہجے میں کہا۔

”تو جی کہتا ہے دین محمد۔“ کرم داد کی آواز میں بھی کرب جاگ اٹھا۔ ”اس بات کا تو مجھے ابھی ہی احساس ہوا ہے۔“

”ہم تو فکر مت کر بہت جلد یہ گھر جنت بننے والا ہے۔“ اور اگلے ہی ہفتے لال جوڑے لال براندے اور گونا گونا

لال جتنی میں شرماتی بجاتی سچ سچ قدم رکھتی کوثر پروین گھر میں داخل ہوئی آگے آگے کرم داد گلابی پکڑی سر پر دھرے سینے تانے چل رہا تھا.... گاؤں میں سب ہی نے یہ خبر حیرت سے سنی کہ کرم داد نے شادی کر دینے والی بیوہ عورت کوثر پروین سے شادی کر لی۔

☆☆☆



# بغیر اجازت

ایس امتیاز احمد

”اگر آپ مجھے اپنی جائداد پر کھدائی کرنے کی اجازت دے دیں اور مجھے چند اولیٰ ہڈیاں مل جائیں تو یقیناً میں ان ہڈیوں کی مدد سے پورا ڈھانچا تیار کر لوں گا۔ آپ ذرا سوچیے مسز ایوان! یہ سائنس کی کتنی بڑی خدمت ہوگی؟“

اس یوم حساب کی کہانی جو بعض اوقات دشمن ہی پر رہ پا ہوتا ہے۔ سمندر پار سے ہنری سلاسر کی ایک خوب صورت کہانی

مسز ایوان کھڑکی کے پروے کھسکائے باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ اسے ایک اجنبی اپنے مکان کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ ایک دراز قد، دبلا پتلا اور بھول سا آدمی تھا۔ اس کی خاک کی چٹون ٹخنوں سے کئی انچ اوپر تھی اور اس پر اس نے ایک بہت چوڑی بیلٹ باندھی ہوئی تھی۔ دھات کی بنی ہوئی کئی چیزیں بیلٹ سے جھول رہی تھیں۔ اس کے ایک ہاتھ میں خمیدہ چھڑی تھی۔ چھڑی کے اوپری سرے کے ساتھ کڑے کا ایک تھیلا بندھا ہوا تھا۔ تھیلے میں کچھ ایسی چیزیں رکھی تھیں، جن کی وجہ سے وہ پھولا ہوا نظر آ رہا تھا۔ قاصد کم ہوا تو مسز ایوان نے غور سے اجنبی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں پر بہت موٹے عدسوں کی بینک تھی جو اس کی پتلی اور لمبی ناک کی ابھری ہوئی ہڈی پر جمی تھی۔ اس سے پہلے کہ اجنبی دستک دیتا مسز ایوان دروازے پر موہو ہوئی۔

”فرمائیے جناب! آپ سے تلاش کر رہے ہیں؟“  
اس نے اجنبی سے پوچھا۔

”آپ مسز ایوان ہیں؟“

اجنبی نے جلدی سے اپنا بے ڈھنگا خاک ہیٹ اٹھائے خوش مزاجی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کی بیٹی باہر جھانکنے لگی۔

”آپ کے مزاج اچھے ہیں؟ میرا نام جیمس ہے۔ آسکر جیمس! میرا تعلق شہر کی جغرافیائی انجمن سے ہے۔ کیا میں چند منٹ کے لیے اندر آ سکتا ہوں؟“  
مسز ایوان ذرا جھجکی لیکن پھر اس نے اجنبی کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں مسز جیمس!“

”آپ میرے لیے بہت کچھ کر سکتی ہیں مسز ایوان!“  
اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟“

”ضرور تشریف رکھیے۔“

نوادرد آتش دان کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر ڈھیر ہو گیا پھر اس نے پر جوش آواز میں کرسی کے ہتھوں پر زور سے دونوں ہاتھ مارے۔





”یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ گھر پر موجود ہیں۔“  
 آپ خاصی مدت سے کہیں گئی ہوئی تھیں۔“  
 ”میں تین مہینے سے یورپ کی سیاحت کر رہی تھی۔“  
 ”خوب..... خوب!“

نوادرد نے ہاتھ ملتے ہوئے سرسرت کا اظہار کیا۔  
 ”میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے آپ کی واپسی کا کس  
 شدت سے انتظار تھا۔ صرف مجھی کو نہیں بلکہ ہماری  
 پوری انجمن آپ کی منتظر تھی۔ امید ہے آپ نے ہماری  
 انجمن کا نام سنا ہوگا؟“  
 ”جی ہاں ضرور سنا ہوگا، کیونکہ یہ نام کانوں کو مانوس  
 معلوم ہو رہا ہے۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں کوئی چیز فروخت  
 کرنے نہیں آیا ہوں۔“

وہ زور سے ہنسا۔ ”آپ کا تعاون ہمارے لیے  
 بیسوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ آپ ہماری تازہ ترین جستجو  
 اور تحقیق کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ حقیقت یہ  
 ہے کہ صرف آپ ہی ہماری مدد کر سکتی ہیں۔“

مسز ایوان پچاس سال کی ایک فریہ عورت تھی۔ وہ  
 نوادرد کی اس تمہید سے سخت بور نظر آ رہی تھی۔

”میں سمجھ نہیں سکی کہ آخر میں آپ کی یا آپ کی  
 انجمن کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

اس نے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔  
 ”میں آپ کو بتاتا ہوں۔“

جیس نے اپنی چٹری قالین پر رکھ دی۔

”چند مہینے قبل ہماری کھدائی کرنے والی ایک ٹیم نے  
 اس علاقے سے چند دلچسپ اور اہم چیزیں برآمد کی  
 تھیں۔ پتھر کی بنی ہوئی چند ایسی چیزیں ملی ہیں جن سے  
 ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علاقہ تاریخ سے قبل کے زمانے اور  
 قدیم عہد کے نشانات اور نوادرد سے بھرا ہوا ہے۔ چند  
 احباب اب بھی اس علاقے کے گرد کھدائی میں  
 مصروف ہیں، لیکن اب تک میرے سوا کسی کو کوئی قابل

ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ مسز ایوان  
 حد معذرت کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ ہمارا  
 مجھے آپ کی زمین سے حاصل ہوئی ہے۔ ا  
 زمین پر میں نے اجازت کے بغیر کھدائی کی تھی  
 اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا کیونکہ میں سوچا کہ  
 سکتا تھا کہ آپ کے مکان سے خاصے فاصلے پر  
 ہے اس کا بیشتر حصہ آپ کی ملکیت ہے۔“

”میں آپ کی گفتگو سے صرف یہ اندازہ لگا سکتی  
 کہ آپ میری جائداد پر اجازت کے بغیر  
 کرتے رہے تھے۔“

میری مراد آپ کی جائداد کے اس حصے سے ہے  
 پر جنگل سا آگاہا نظر آتا ہے لیکن دو مہینے کی سخت  
 اور جدوجہد کا پھل آخر مجھے مل گیا۔ آپ کو شاید  
 نہ آئے۔ مسز ایوان!“

جیس نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ جوش ت  
 چہرہ تھمارہا تھا۔

”میں چند ہڈیاں دریافت کرنے میں کامیاب  
 ہوں۔“

”ہڈیاں.....؟“

”ہاں۔ ہے نا تعجب کی بات؟ میں وہ ہڈیاں سنا  
 نہیں کر سکا ہوں۔ میں ان معاملات میں ڈرانا ہا  
 اس لیے یہ سراغ اب تک نہیں لگا سکا کہ ان ہڈیا  
 تعلق تاریخ کے کس دور سے ہے؟ اور ان کی عمر کیا  
 لیکن وہ ہڈیاں بہت عمدہ حالت میں ہیں۔ یقین  
 آتا کہ ہزاروں سال پرانی ہڈیاں اتنی عمدہ حالت  
 ہو سکتی ہیں۔“

اس نے ہاتھ بڑھا کے چٹری سے بندھا ہوا تھیلہ اکر  
 ”آپ بھی ایک نظر دیکھ لیجیے۔“

جیس نے ہاتھ تھیلے سے نکالا تو اس میں ایک  
 ہڈی چمک رہی تھی۔ مسز ایوان کے منہ سے بے انتہا  
 ایک چیخ نکل گئی۔

”اوہ معاف کیجیے گا خاتون! میں بہت شرمندہ  
 اس نے کہا۔“

میرا مقصد آپ کو ڈرانا نہیں تھا۔ یہ ناگ کی ہڈی  
 اس کے علاوہ ایک کھوپڑی بھی ملی ہے۔ انسان  
 مسانی ساخت کے متعلق میرا علم زیادہ وسیع نہیں  
 لیکن یہ ہڈیاں دیکھتے ہوئے میں یقین سے کہہ سکتا  
 کہ یہ ہڈیاں کسی بہت موٹے اور پستہ قد آدمی کی  
 ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس آدمی کا تعلق  
 تاریخ کے زمانے سے ظاہر ہے۔ اس دریافت  
 قدرتناز کروں کم ہے۔“

”مسز ایوان اب بھی سبھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔  
 اگر آپ مجھے اپنی جائداد پر کھدائی کرنے کی  
 اجازت دے دیں اور مجھے چند اور ہڈیاں مل جائیں تو  
 میں ان ہڈیوں کی مدد سے پورا ڈھانچا تیار کر لوں  
 گا۔ آپ ڈرنا سوچیے مسز ایوان! یہ سائنس کی کتنی بڑی  
 خدمت ہوگی؟“

”سائنس کی.....؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ میں تمہیں اس  
 اجازت نہیں دے سکتی۔“  
 جیس کا منہ لٹک گیا۔

”لیکن مسز ایوان یہ ظلم ہوگا۔ آپ مجھ پر اتنا برا ظلم  
 کر سکتیں۔ آپ میری اس عظیم دریافت کی اہمیت  
 کو اندازہ لگا سکتی ہیں۔ کیا آپ اس مرحلے پر مجھے  
 ہند کرنے کے لیے مجبور کریں گی، مجھے تسلیم ہے کہ  
 آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی جائداد پر کھدائی  
 کے ایک غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب ہوا ہوں اور  
 صورت میں جب آپ یہاں موجود بھی نہیں تھیں  
 ان آپ یہ تو سوچیے کہ سائنس.....“

”میں تمہیں اپنی جائداد پر کھدائی کرنے کی اجازت  
 ہرگز نہیں دوں گی۔“

مسز ایوان نے چیختے ہوئے کہا۔  
 ”تمہیں اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ مجھے سائنس

دغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“  
 ”بے شک بے شک آپ کو سائنس سے کوئی دلچسپی  
 نہیں ہے اور مجھے اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا لیکن میرا  
 خیال تھا.....“

جیس بہت آزرہ نظر آ رہا تھا۔  
 ”مسز ایوان کیا اس موضوع پر میں آپ کے شوہر  
 سے بات چیت کر سکتا ہوں؟“  
 ”جی نہیں۔ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔“  
 ”اوہ۔“

چند لمحوں کے لیے ایسا محسوس ہوا جیسے جس اپنے کسی  
 عزیز کے جنازے کے سامنے بیٹھا ہے پھر وہ ایک  
 گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔  
 ”مجھے افسوس ہے یہ آپ کی جائداد ہے اور اس پر  
 آپ کا پورا حق ہے لیکن میں بہت امیدیں لے کے  
 آپ کے پاس آیا تھا۔“

اس نے بے چارگی سے کاندھے اچکائے اور ایک  
 گہری سانس لی۔

”خیر اب مجھے چلنا چاہیے ابھی تو مجھے پولیس انسپکٹر  
 شائلر سے بھی ملاقات کرنی ہے۔“

”کس سے.....؟“

”انسپکٹر شائلر سے۔ وہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں بیٹھتے  
 ہیں۔ اس ریاست کا ایک احقانہ قانون یہ ہے کہ  
 ہماری انجمن زمین کی کھدائی سے جو چیز بھی برآمد کرے  
 گی، اس کا معائنہ سب سے پہلے یہاں کی پولیس کرے  
 گی۔ خاص طور پر انسانی ہڈیوں کے سلسلے میں یہ قانون  
 بہت سخت ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر پولیس کو  
 آثار قدیمہ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟“

اس نے جھک کر قالین سے اپنی چٹری اٹھائی اور  
 دروازے کی طرف بڑھا۔

”ٹھہرے مسٹر جیس!“  
 ”جی۔ آپ..... آپ یہ ہڈیاں پولیس کے پاس



لے جائیں گے؟“

”جی ہاں۔ یہ ضروری ہے۔ ہماری انجمن قانون کی سختی سے پابندی کرتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ پہلے اپنی کھدائی مکمل کر لوں لیکن اب چونکہ یہ ممکن نہیں ہے اس لیے یہ ہڈیاں مجھے پولیس کے معائنے کے لیے پیش کرنی پڑیں گی۔“

”کیا آپ..... آپ کچھ پینا پسند نہیں کریں گے؟ کوئی ٹھنڈا مشروب؟ آپ اتنی دور سے پیدل چل کے آئے ہیں؟“

”یہ خیال برا نہیں ہے۔“

جیمس نے غور کرتے ہوئے کہا۔

”میں واقعی بہت تھکا ہوا ہوں۔“

”میں آپ کے لیے کوئی ٹھنڈا مشروب لاتی ہوں۔“ مسز ایوان نے کہا۔ جیمس ایک سائس سمیچ کے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ مسز ایوان ڈرائنگ روم سے چلی گئی۔ جیمس نے اپنے تھیلے سے ایک انسان کی کھوپڑی نکالی اور اسے غمگین نظروں سے گھورنے لگا۔ پانچ منٹ بعد مسز ایوان واپس آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ ٹرے میں ایک خوب صورت اور نازک گلاس سرخ مشروب سے بھرا ہوا رکھا تھا۔

مسز ایوان کی نظریں کھوپڑی پر پڑی تو اس کا چہرہ خوف سے سپید ہو گیا۔ جیمس نے فوراً کھوپڑی اپنے تھیلے میں ڈال دی اور ٹرے میں رکھا ہوا گلاس جلدی سے اٹھا لیا اور اپنی لمبی ناک گلاس پر جھکا کر مشروب سونگھنے لگا۔

”ہوں۔“

اس نے اسے سونگھتے ہوئے کہا۔

”سنگھیا ہے۔ اس زہر کی بو چھپانا بہت مشکل کام ہے مسز ایوان!“

”کیا..... کیا آپ نے اپنے شوہر کو بھی اسی زہر سے ہلاک کیا تھا یا ان کے لیے کوئی بھاری بھر کم نوکیلی شے

استعمال کی تھی؟“

مس ایوان کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ ”میں کبھی نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ جیمس نے اپنی ہیلٹ سے لٹکا ہوا فلاسک ملے اور گلاس میں بھرا ہوا مشروب اس میں خالی کر کے بعد اسے دوبارہ بند کر کے اپنی ہیلٹ سے لٹکا دیا۔

”کون ہو تم.....؟“

مسز ایوان نے کچکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”میرا نام گارن ہے۔“ نووارد نے جواب دیا۔

”میں اس پیرہ کپنی کا سراغ رستاں ہوں جس کی لٹا ہوئی رقم سے آپ نے تین ماہ تک یورپ کی لم سیاحت کی۔ اب آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میں آپ شوہر کی پراسرار گم شدگی سے کبھی مطمئن نہیں ہوا جس منصوبے پر میں نے ابھی عمل کیا ہے یہ میری ذہن میں صرف چند ہفتے پہلے پیدا ہوا تھا اور کپنی سے پہلے ہی آپ کو آپ کے شوہر کے پیسے کی کرچکی تھی لیکن خیر دیر سے آنا بھی نہ آنے سے بہتر ہے مسز ایوان!“

وہ بڑی عیاری سے مسکرایا اور کھڑا ہو گیا۔

”وہ ہڈیاں.....“

مسز ایوان کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

نظریں تھیلے پر جمی ہوئی تھیں۔

”یہ میں نے ایک میڈیکل کالج سے چند گھنٹوں

لیے ادھار لی ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اصل ہڈیاں بہت جلد آپ کی جائداد سے کھود نکالے گی۔ بہرہ ختم ہو گیا۔ اب پولیس کا کام شروع ہو گا۔“

مسز ایوان کھڑکی سے اس مجہول آدمی کو دیکھتے دیکھتے رہی۔ وہ ایک ہاتھ میں تھیلیا اور دوسرے میں چھڑی ہلاتا ہوا سیٹی بجاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

IRE MONTHLY

152

ایک بھگتی آتما کی دل دہلا دینے والی داستان جو پرسوں سے پیاسی تھی

اسی آتما



## پیاسی آتما

- ان سفاک لوگوں کی کہانی جو مظلوموں کا خون پی کر اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔
- ان خالوں کی کہانی جو نام نہاد غیرت اور عزت کے لیے معصوموں کے خون سے ہولی کھیلتے ہیں۔
- اس نوجوان کی داستان جس کو پیدا ہوتے ہی جان کے دشمنوں کا سامنا تھا۔

ایک ایسی کھانی جو آپ کو اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوگی

• تحیر و تجسس • ہلاکتوں • جرائم طلسم • وحشت • خوف کی ایک داستان

چند لمحوں بعد وہ دونوں آفس روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کالی داس کہہ رہا تھا۔ نادرہ بھی زندہ ہے مگر بے ہوش ہے۔ اور اس وقت جناح اسپتال میں ہے۔

کیا نوازش اور آسیہ بھی اس کے پاس ہیں۔ شام کمار نے چوکتے ہوئے پوچھا۔  
نہیں۔ وہ دونوں پولیس کے آنے سے پہلے وہاں سے نکل گئے تھے۔ انہوں نے مہراں ہوٹل میں کمرہ لے لیا اور وقت کمرے میں ہی ہیں۔

ارے..... شام کمار ا یکدم اچھل کر بولا۔ موقع اچھا ہے۔

کیا مطلب۔ کالی داس نے چوکتے ہوئے اسے گھورا۔

وہ ہوٹل میں آرام کر رہے ہیں..... ان کی غفلت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ شام کمار نے حیزی سے کہا۔ تم نے یہ نعرہ سنا کہ مگر تھی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور وہ..... اس وقت وہ اپنے بنگلے کی چابی پر پریشانی اور بوکھلاہٹ میں مبتلا ہیں۔ اس وقت وہ بہت غضب ناک ہو رہے ہوں گے یار..... کالی داس نے ناگواری سے کہا۔ زخمی درندے کے سامنے حماقت ہوتی ہے۔

ارے یار..... یہی تو موقع ہے دشمن پر کاری ضرب لگانے کا۔ شام کمار مسکرایا۔ وہ دونوں سمجھ رہے ہوں گے کہ چابی کے بعد ان کی موت کا یقین کر کے ہم اطمینان سے آرام کر رہے ہیں یا جشن مسرت منانے میں مصروف ہیں۔ لیے انہیں ہماری طرف سے مزید کسی حملے کی توقع نہیں ہوگی۔ ان کی اس غلط فہمی سے فائدہ اٹھا کر ہم ان پر کام کر سکتے ہیں۔ کیا تم ان کے زندہ بچ جانے سے ڈر گئے ہو۔

نہیں تو..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مگر..... کالی داس بولا۔

شام کمار نے حیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اگر مگر چھوڑ دیا..... اگر تم کچھ نہیں کرنا چاہتے تو میں اکیلا ہی نیست و نابود کرنے جا رہا ہوں۔ تم میری کال کا انتظار کرنا۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہیں خوش خبری سناؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ جھکے سے کھڑا ہو گیا۔ کالی داس حیزی سے بولا۔ ٹھہرو۔ ٹھہرو..... میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ تو پھر جلدی کرو..... ایسا موقع دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ شام کمار غرایا۔

کیا تم نے اپنے ذہن میں کوئی پلان ترتیب دے لیا ہے۔ کالی داس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

پلان..... پلان تو ایسا سوچا ہے کہ بس نہ پوچھو۔ شام کمار ہڈیانی انداز میں ہنسا۔ بس سمجھ لو کہ نوازش اور آسیہ کی میں یہ آخری رات ہے۔ اب صبح کا سورج وہ قیامت کے روز ہی دیکھ سکیں گے۔

کالی داس نے سمجھنے والے انداز میں ہلایا۔ پھر بٹن دبا کر کمرے کا دروازہ کھولا اور شام کمار کے ساتھ باہر نکلا چلا گیا



وہ اڑتا ہوا ٹائیگر پر آ پڑا اور ٹائیگر کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ ٹائیگر لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے جا گرا۔ نوازش نے اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی ریوالور کی طرف چھلانگ لگائی اور ریوالور اٹھالیا۔ ٹائیگر سنبھل کر اٹھا ہی تھا کہ نوازش نے اس پر ریوالور تان لیا۔ وہ نوازش کو خوش خوار نگاہوں سے گھورنے لگا۔

”خبردار... کوئی حرکت مت کرنا ٹائیگر۔“ نوازش نے سخت لہجے میں اسے تنبیہ کی۔

”ہوں... اسی لیے جھوٹی باتیں کر کے...“ ٹائیگر دانت پیستے ہوئے بولا۔

”نہیں۔“ نوازش نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے ایک ایک لفظ درست کہا ہے ٹائیگر... اس نے کیا حکم دیا ہے۔“

”وہ کہہ رہا تھا کہ تم نوازش ہو اور تم نے سب کچھ غلط بتایا ہے مجھے۔ اس لیے تمہیں گولی مار کر ختم کر دوں۔“ ٹائیگر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”اور میں نے بھی اس لیے بھڑکتی کی ہے کہ میرا نام بتا کر اس نے تمہیں میرے بارے میں کوئی نیا حکم دیا ہوگا۔“ نوازش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ وہ کتنا بڑا شیطان ہے جسے معلوم ہو گیا ہے کہ میں نے تمہیں اس کے بارے میں کچھ باتیں بتائی ہیں۔“

”ہاں... واقعی یہ عجیب سی بات ہے۔“ وہ چوکتے ہوئے بولا۔

”اب میں چاہوں تو پولیس کو فون کر کے تمہیں قانون کے حوالے کر دوں یا خود گولی مار دوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کر دوں گا۔ بشرطے کہ تم تعاون کرو۔“

”کیسا تعاون؟“ ٹائیگر نے حیرت سے پوچھا۔

”صاعقہ کو فون کر کے کہہ دو کہ وہ ان آدمیوں کو واپس بلا لے جنہیں تم نے مجھ پر تشدد کرنے کے لیے طلب کیا ہے۔“

”مگر وہ تو اب پہنچنے والے ہوں گے۔“ بولا۔

”سہرا ب گھوٹ یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔ وہ لالو کھیت ہی پہنچے ہوں گے۔“ نوازش ”بہر حال ان میں سے کسی کے پاس موبائل ڈ اور صاعقہ انہیں فون پر ہدایات دے سکتی ہے سکتے ہو کہ میں بھاگ گیا ہوں اور اب تمہیں ضرورت نہیں رہی۔“

ٹائیگر نے ایک دو لمحوں کے لیے سوچا۔ ”سے موبائل فون نکال کر اس پر صاعقہ سے کرنے لگا۔“

”ٹائیگر بول رہا ہوں مس صاعقہ۔“ دوسرل کی آواز سن کر اس نے کہا۔ ”آپ نے جو آٹا طرف روانہ کیے ہیں انہیں واپس بلا لیں۔ ہاں مجھے دھوکا دے کر بھاگ گیا ہے۔“

”ادہ... مگر باس نے تو ابھی ابھی بتایا ہے کہ اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔“ صاعقہ نے سے کہا۔

”ہاں... میں نے کوشش کی تھی۔ لیکن وہ ٹائیگر نے نوازش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا میں باس کو اطلاع دے رہا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے موبائل آف نوازش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”شکریہ؟“

اس نے فرش سے اپنا ریوالور اٹھایا اور جیب لیا۔ پھر دوبارہ ٹائیگر سے بولا۔ ”اس تھا بدلے میں تمہیں یوں ہی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تادور کے اغوا کی تمہیں سزا دے سکتا ہوں۔“ اپنے ساتھیوں کو پراچہ کی حقیقت سے خبردار کر ایک بدروح ہے اصل پراچہ مر چکا ہے۔“ نوازش نے اس کے ریوالور سے گولیاں نکال جیب میں ڈالیں اور خالی ریوالور اس کی طر

اگر نے عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف بولا۔

ما تم پولیس کو میرے بارے میں اطلاع دو لیں... لیکن کوشش کرنا کہ آئندہ کوئی غیر قانونی راہ۔“ نوازش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے کال بیل بجی اور دونوں چونک نوازش نے سوالیہ انداز میں ٹائیگر کی طرف

ماہ میرے ساتھی ہوں۔“ وہ بولا۔ ”بہر حال تم پر اعتماد کرو تو ریوالور جیب میں رکھ لو اور اتار دو۔ میں ان سے تمہارا تعارف دوست کی سے کرادوں گا۔ انہیں تم پر کوئی شبہ نہیں ہونے

وہ کے ا۔“ نوازش نے ایک دو لمحوں بعد اس کی ہاتھ بڑھا دیا۔ ”تم چاہو تو ہم آئندہ کے لیے بھی ہن سکتے ہیں۔“

نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے گرم جوشی کا اور نوازش نے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ اسی راہ گھنٹی بجی۔

ا...“ نوازش چہرے سے نقاب اتار کر جیب سے ہوتے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں سے نکل کر لاؤنج میں آئے اور نوازش صوفے

ن...؟“ ٹائیگر نے دروازے کے پاس پہنچ کر سے پوچھا۔

سٹ مین۔“ باہر سے آواز آئی۔

نے نوازش کی طرف دیکھتے ہوئے اطمینان کا بھر دروازہ کھول دیا۔ لیکن باہر کھڑے شخص وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔

☆☆

کھتری ہو زری فیکٹری میں حسب معمول کام ہو رہا تھا۔ آفس روم میں فیکٹری کا مالک جاوید کھتری شان دار آفس ٹیبل کے پیچھے ریوالونگ چیر پر بیٹھا تھا۔ کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ اچانک میز پر رکھے موبائل کی گھنٹی بجی اور اس نے چوکتے ہوئے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

”ہیلو۔“ اس نے موبائل آن کر کے کان سے لگا لیا۔

”صاعقہ بول رہی ہوں باس۔“ دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی۔

”ادہ... خیریت...؟“ اس نے چوکتے ہوئے کہا۔

”ابھی ابھی ٹائیگر کی کال آئی ہے کہ آپ نے جس آدمی کو ختم کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ اس کی گرفت سے بھاگ گیا ہے اس لیے طلب کیے گئے ساتھیوں کو واپس بلا لیا جائے۔“

”ادہ... یہ تو برا ہوا۔“ کھتری نے غصے سے کہا۔

”اس خبیث نے مجھے تو اطلاع نہیں دی۔“

”وہ کہہ رہا تھا کہ اب آپ کو کال کرے گا۔“ صاعقہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

”نہیں۔ اس کی کال نہیں آئی۔ بہر حال میں دیکھتا ہوں۔“ کھتری نے کہا۔

پھر موبائل آف کر کے جیب سے آئینہ نکالا اور اس پر منتر پھونکا۔ فوراً آئینہ روشن ہو گیا اور اس میں چند ریکا کی کھوپڑی کا عکس ابھرا آیا۔

”کیا حکم ہے مہاراج؟“ کھوپڑی سے آواز آئی۔

”کیا نوازش ٹائیگر کے فلیٹ سے بھاگ گیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں مہاراج... وہ وہاں موجود ہے۔“ چند ریکا نے بتایا۔

”ادہ... تو پھر ٹائیگر نے اسے قتل کیوں نہیں کیا اور



صاعقہ کو غلط اطلاع کیوں دی؟“ کمتری حیرت سے  
اچھل پڑا۔

”اس لیے کہ وہ نوازش سے آپ کے بارے میں تفصیلات سن کر متاثر ہو گیا تھا اور پھر جو نبی آپ کا حکم سن کر اس نے موہاٹل آف کیا۔ نوازش نے اس پر حملہ کر کے اس کا ریوالتور چھین لیا تھا۔ نوازش کے حکم پر ہی اس نے صاعقہ کو کال کیا تھا۔“

”خدا رکھیں گا۔“ کھتری نے غصے سے دانت پیسے۔  
پھر اس نے نور اُئی آئینے پر پھونک مار کر آئینہ جیب  
میں رکھا اور منتر پڑھ کر چھت کی طرف پھونکا۔ دوسرے  
ہی لمحے چھت کے قریب دھواں سا پھیل گیا۔ پھر اس  
دھوئیں سے کستورا کا بھیا نک چہرہ نمودار ہوا۔

”کیا حکم ہے بہاراج۔“ کستورا کے منہ سے سوہا نے انداز میں کھڑکھڑاتی ہوئی آواز خارج ہوئی۔

”کستورا..... فوراً ٹائیگر کے قلیٹ پر پہنچو اور ٹائیگر کے ساتھ ساتھ لوازش کو پکڑ کر نصف دھڑ تک فرش میں دفن کر دو۔“

”بہت بہتر مہاراج۔“ کستور نے کہا۔  
کھتری جو کہ کالی داس ہی تھا اس نے کستور کو مزید  
چند ہدایات دیں اور کستور کا بھیا تک چہرہ دھوئیں میں  
غائب ہو گیا۔ پھر دوبارہ آئینہ نکال کر چند ریکا کی  
کھوپڑی کو طلب کر لیا۔

”ناورہ کی اب کیا حالت ہے۔ تفصیل سے بتاؤ۔“  
اس نے چدریکا سے کہا۔

”مہاراج.... آپ کے حکم پر بلوچ اور اس کے ساتھی نے اسے بتارس کی ایک عمارت کے تہ خانے میں قید کر دیا ہے اور جب نادروہ نے ہوش میں آ کر چیخنے چلانے کی کوشش کی بلوچ نے اس کے ہاتھ پاؤں بیڈ کے ساتھ باندھ کر اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ وہ صدمے سے روتے روتے پھر بے ہوش ہو گئی ہے۔“

”اسے اس کے کیے کی سزا مل رہی ہے۔ میں اب

اے قتل نہیں کروں گا بلکہ وہ خود ہی بیٹے کی جدائی میں  
 تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔“ وہ نفرت سے کہنے لگا  
 ”اس نے عیش و آرام کو ٹھکرا کر اپنے ساتھ لایا  
 ہے۔“

پھر اس نے دوبارہ چند ریکا کو مخاطب کیا ہے کرشن  
کیا پوزیشن ہے؟“

”وہ نرس رضیہ پر عاشق ہو گیا ہے جہا راج... انا  
وقت بھی وہ اس کے ساتھ کمرے میں موجود ہے۔  
اسے یقین دلانا ہے کہ جلد ہی وہ دونوں آزادی  
زندگی گزار سکیں گے۔“

”بے وقوف ہے وہ۔“ کالی داس بے اختیار مسکرائی۔  
 ”اس کے لیے دنیا میں لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔  
 بہر حال کر لے محبت کا تجربہ بھی۔ میں مادھوری لالہ  
 نواز شمس کا قصہ پاک کرنے کے بعد اس کی شادی  
 انتظام کروں گا۔ کنڈل تو قائم ہے نا۔“

”ہاں مہاراج..... فی الحال تو کنڈل جوں کا توہ ہے۔ مادھوری سے کوئی خطرہ نہیں کنڈل کو۔“

”ہا ہا ہا... اس کتیا کو وہاں کا پتا چلے گا تو خطرہ پیدا ہو گا۔“ کالی داس نے قہقہہ لگایا۔ ”نی الحال تو اسے معلوم نہیں کہ اس کا محبت کس حالت میں ہے اور مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہے بلکہ ہو چکا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اس نے آئینے پر پھونک ماری اور آئینہ مہم میں رکھ کر اتر کام پر اپنے فہجر سے بولا۔

”صدائی۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ گاڑی بھجوا دو۔“  
 ”رائٹ سر۔۔۔ گاڑی برآمدے کے باہر  
 ہے۔“ صدائی کی مود بانداواز سنائی دی۔

اس نے انٹرکام آف کیا اور اٹھ کر کمرے سے آیا۔ وہ برآمدے میں پہنچا تو باہر اس کی کار موجود اس نے کار میں بیٹھ کر انجن اشارت کیا اور کار گیت طرف بڑھا دی۔ باہر سڑک پر آ کر اس نے رفتار اضافہ کیا ہی تھا کہ اچانک موبائل فون کی گھنٹی بجی اور

۔ اس نے ایک ہاتھ جیب میں ڈال کر  
نکلایا اور آن کر کے کان سے لگایا۔

کمتری اسپیکنگ.....“ اس نے بلند آواز  
میری طرف کی آواز سن کر اس کے لبوں پر  
پھیل گئی۔

☆☆  
 لی آہ پر کیپٹن اور گن میں اٹیشن ہو گئے  
 تھوکی مسکراہٹ سے آئینہ اور بھی غضب ناک  
 ہوا، انسان کے روپ میں کوئی شیطان تھا۔  
 یہ عورت کوئی بات نہیں مان رہی۔“ کیپٹن  
 قریب پہنچے پر کہا۔

ہی۔ مانے گی کیپشن..... کیوں نہیں مانے  
 مانے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

پہنچو کو بے گناہ اور ہمارا ہم وطن کہہ کر ہماری  
 دہرائی ہے۔ خدا کا واسطہ دیتی ہے۔" کیپٹن

آخر عورت ہے نا۔“ کرل ہنس پڑا۔ مگر کہ اس نے اپنے لباس کے اندر کوئی خفیہ ٹیکسٹ لکھ دیا تھا۔ وہ دستاویزات چھپا رکھی ہیں اس بار نے سے انکار کرتی ہے۔“

”آئیہ غصے سے بولی۔ ”میرے پاس کچھ  
 ۔۔۔ پھر بھی میں تمہاری خواہش پوری نہیں  
 کی کرتی۔“

میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ البتہ تم اعتراف  
 راکی ایجنٹ رکھا کلیانی ہو۔“ کرل نے

یہ غلط ہے۔ میرا نام آملی ہے اور.....“  
 می سے کہا۔

”کرتل اس کی بات کانٹے ہوئے  
صوفے پر بیٹھ کر میرے سوالوں کے

جواب دو۔

آسہ پلٹ کر صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ لیکن وہ اس سے بے خبر تھی کہ پیچھے کرل کیا کر رہا ہے۔ وہ صوفے کے پاس پہنچی اور کرل کی طرف منہ کر کے بیٹھتے ہوئے ایک دم چونک پڑی۔ گن بردار اور کیپٹن دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ پھر اس نے کرل کی طرف دیکھا ہی تھا کہ اسی لمحے کرل نے اس کی طرف پھونک مار دی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی زبان اور ہاتھ پاؤں سن ہو گئے۔ اس نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر ذرا بھی حرکت نہ کر سکی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے ہونٹوں سے لے کر پیروں تک جسم پتھر میں تبدیل ہو گیا ہو۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن زبان بھی حرکت کرنے سے معذور ہو چکی تھی۔

”کیپٹن..... تم واپس آ جاؤ۔“ کرنل نے پلٹ کر کیپٹن سے کہا۔

کیپٹن وروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ کرنل کی آواز سنتے ہی ایزیوں کے بل گھوما اور واپس آنے لگا جب کہ گن مین باہر نکل گیا۔ آسیہ کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اس نے اندازہ لگالیا کہ کرنل نے اس پر کوئی سحر پھونکا ہے جس نے اسے اتنا بے بس کر دیا تھا کہ وہ اس کا توڑ کرنے کے لیے کوئی منتر پڑھنے سے بھی لاچار ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ صرف سن سکتی تھی اور آنکھوں کو حرکت دے سکتی تھی اور بس۔

”کیپٹن... تم یہیں مقبوضہ میں تمہیں ایک دلچسپ  
تلاش دکھاؤں گا۔“ کرنل نے کیپٹن سے کہا۔ ”لیکن یہ  
راز آؤٹ نہ ہونے پائے۔“

”رائٹ سر۔۔۔ ایسا ہی ہوگا۔“ کیپٹن نے حیرت سے کہا۔

”میں نے اپنی روحانی طاقت سے اس جاسوس کو معذور کر دیا ہے۔ اب نہ یہ بول سکتی ہے اور نہ اپنی جگہ سے جنبش کر سکتی ہے۔ چنانچہ ہم اطمینان سے اسے بے



لباس کر کے تفتیش کا کام انجام دے سکتے ہیں۔“  
”اوہ.... مگر یہ سوالوں کے جواب کیسے دے گی سر۔“  
کیپٹن نے آسیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہمیں جواب کی ضرورت ہی نہیں۔“ کرنل مسکرایا۔ ”سب کچھ مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ اس کا نام مادھوری ہے اور یہ راکھی فہرہون ایجنٹ ہے۔ ابھی میں ایک دوست کو بلاتا ہوں جو اس کی پیدائش تک سے واقف ہے۔ اس کے آنے پر باقاعدہ اس کی جائیداد تلاشی لی جائے گی۔ تم دس جوانوں کو یہاں لے آؤ۔ مضبوط اور بٹے سٹے سپاہی ہونے چاہئیں جو اس کی تلاشی لے سکیں۔“

اس کی بات سن کر کیپٹن پلٹا اور کرنل نے اس کے باہر جاتے ہی جیب سے چھوٹا سا موبائل فون نکال لیا۔ آسیہ پر اضطرابی کیفیت طاری تھی اور دل و دماغ میں آنندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ کرنل کی حقیقت جاننے کے لیے بے تاب تھی جو موبائل پر نمبر ملا رہا تھا۔ کرنل اس کی ذہنی کیفیت سے بے نیاز دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے میں گہرا سناٹا طاری تھا۔ کرنل چلتے ہوئے آسیہ کے پہلو میں آ بیٹھا اور موبائل کان سے لگالیا۔ ”ہیلو.... کھتری اسپیکنگ۔“ سلسلہ لٹنے پر موبائل سے آواز ابھری اور قریب ہونے کے سبب آسیہ کے کانوں میں بھی پہنچ گئی۔

”یار.... یہ تم ذاتیں ہی بدلتے رہتے ہو۔ کوئی اور کام نہیں تمہیں اس کے سوا۔“ کرنل نے فس کر کہا۔ ”کیا مطلب.... کون ہو تم۔“ دوسری طرف کھتری کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ آسیہ نے کالی داس کی آواز پہچان لی تھی۔

”کرنل صدام بول رہا ہوں کالی گھاس۔ ابھی گزشتہ رات تو تمہیں اپنے نئے جسم کے متعلق بتایا تھا۔“ اس نے جواباً کہا۔

کرنل کا نام سن کر آسیہ کا دماغ ایک دم چٹخ کر رہ گیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ کرنل کو پہچان گئی رادھا کی راہ سے شیاام کمار کا نیا نام بھی بتایا تھا۔ اب وہ سارا گئی تھی۔ اسے یقین تھا شیاام کمار نے اسے پھا لیے ہی یہ سارا چکر چلایا ہے۔

”ارے ہاں.... پہلا دن ہی یادگار بن گیا شیاام کمار نے پرست لہجے میں کہا۔ ”جائے وقت میرے پہلو میں کون ہے؟“

”لنگور کے پہلو میں حور ہی ہو سکتی ہے۔“ کالی نے فس کر کہا۔ ”تم فوج میں بھی عیاشی کر رہے“

”میں نہیں کر رہا۔ لیکن دس جوانوں کو کروا ہوں عیاشی۔“ شیاام کمار نے آسیہ کی طرف اشارہ کیا۔

”کیونکہ اس وقت مادھوری میرے پاس اتنی اور لاچار بیٹھی ہے کہ پہلے کبھی اس قدر نہ ہوئی تھی۔“ ارے.... وہ تمہارے پیچھے وہاں بھی ہٹکی کالی داس کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔

”پہنچی نہیں بلکہ باقاعدہ پلاننگ کر کے اسے آنے پر مجبور کیا ہے۔“ شیاام کمار ہنسا۔ ”مزے یہ ہے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود پہچان سکی۔ لیکن اب شاید پہچان گئی ہو ہماری وجہ سے۔ لیکن وہ حرکت کرنے سے معذور ہے۔ سن سکتی ہے بول نہیں سکتی۔ زبان بے کار ہوئے سے وہ کوئی منتر پڑھنے سے بھی لاچار ہے۔ کیا ہو اس وقت؟“

”نہیں.... کیا کوئی خاص بات ہے؟“ طرف سے کالی داس کی چوٹتی ہوئی آواز ابھری۔

”ارے یار.... اس سے زیادہ خاص بات ہوگی کہ اس دن تم تماشا دیکھنے سے محروم رہ گئے۔“

نوازش کی وجہ سے میرے آدی ناکام ہو گئے تھے آج۔“ شیاام کمار ہنسا۔ ”آج وہ نہ صرف اکیلے منتر پڑھنے سے بھی معذور ہے۔ اس لیے اس سے مزاحمت کا ایک فی صد بھی امکان نہیں

”نہیں.... کیا کوئی خاص بات ہے؟“ طرف سے کالی داس کی چوٹتی ہوئی آواز ابھری۔

”ارے یار.... اس سے زیادہ خاص بات ہوگی کہ اس دن تم تماشا دیکھنے سے محروم رہ گئے۔“

نوازش کی وجہ سے میرے آدی ناکام ہو گئے تھے آج۔“ شیاام کمار ہنسا۔ ”آج وہ نہ صرف اکیلے منتر پڑھنے سے بھی معذور ہے۔ اس لیے اس سے مزاحمت کا ایک فی صد بھی امکان نہیں

”نہیں.... کیا کوئی خاص بات ہے؟“ طرف سے کالی داس کی چوٹتی ہوئی آواز ابھری۔

کے جسم کی تلاشی لینے کے لیے دس جوانوں کو ماہے۔ تم بھی آ کر یہ تماشا دیکھ لو۔“

اسے مجھے کیا فائدہ ہو گا؟“ کالی داس نے

”میں نے گی تمہاری پیاسی آتما کو۔“

”میں لطف و تسکین کو کون سی بات ہے۔ میں شیاام کمار۔“

”ہے تمہاری عقل پر۔“ شیاام کمار ایک دم ارے پاگل کے خم بے وقوف.... جب دس جوان مادھوری کا جسم لوچیں کھسٹیں گے تو

”ہر وہ نہیں آئے گا۔ تسکین نہیں ملے گی؟“

.... مجھے تو معاف ہی رکھو یار میں روحانی پانے کی کوشش کرتا ہوں اور اسی سلسلے میں

”ہاں ہاں ہوں۔“

”ارے.... کیا چڑیا گھر میں جانوروں سے حاصل کر لے؟“ شیاام کمار ہنسا۔

”گھر میں جانوروں سے نہیں احمق آدی۔ وہاں ایک ماتحت کے گھر جا رہا ہوں جہاں ایک

”چوہا جال میں پھنسا ہوا ہے۔“

”ہاں.... تو آج کل چوہوں کو پھانس رہے ہو۔“

”مار نے بھنے والے انداز میں سر ہلایا۔“ کہیں مار ہم تو شروع نہیں کر دی تم نے؟“

”گھماڑ.... میں اس چوہے کی بات کر رہا ہوں۔“ شیاام کمار نے پھانس رکھا ہے۔“ کالی

”لے پھٹتے ہوئے کہا۔“

”اوہ... نوازش....“ شیاام کمار بے اختیار اچھل پڑا۔

”کلیا ہن کو بھی زبردست جھٹکا لگا۔“

”اں اس وقت وہ کستور کی گرفت میں ہے اور میں

”اپنا فائدہ کرنے جا رہا ہوں۔ اسی لیے میں تمہارے

”لہجے آ سکتا۔“

”میرا ٹھیک ہے۔ تم ادھر چوہے کو مارو اور مجھے

خوجہری سناؤ۔ میں ادھر چوہا کا بیج دیتا ہوں۔“

شیاام کمار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے یار.... ایسی خطرناک چوہیا کا بیج بھی

”خطرناک.... ہے اسی لیے اس کا جلدی سے سرکچل ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں فوجی سے موچی میں تبدیل کر

ڈالے۔“

”بے فکر رہو۔ اس بار چوہے دان بہت مضبوط ہے۔ وہ قیامت تک اس سے نہیں نکل سکتی۔“ شیاام کمار

”نے بڑے غرور سے کہا۔“

”تم پہلے بھی اسی خوش فہمی میں مار کھاتے رہے ہو۔

”بلکہ مجھے بھی ذلیل کراتے رہے۔“ کالی داس کی آواز

”آئی۔“ اگر تم نے آج بھی چوچلوں میں وقت ضائع کیا

”تو شاید تمہیں پچھتانے کا موقع بھی نہ ملے۔ ادا کے۔“

شیاام کمار نے منہ بتایا اور سوبائٹل آف کرتے ہوئے

”غصے سے بڑبڑایا۔“ ”لوکا پٹھا! گدھے کی دم۔ خود کو مجھ

”سے زیادہ ہوشیار اور عقل مند سمجھتا ہے۔ اگر اتنا ہی

”طاقت ور ہوتا تو سواری مگر جی جیسے کمزور آدمی سے

”فکست نہ کھاتا۔“

”اسی لمحے دروازہ کھلا اور وہ چونک کر دروازے کی

”طرف دیکھنے لگا۔ کیپٹن دس بارہ سپاہیوں کے ہمراہ اندر

”آ رہا تھا۔ وہ سب خیر سلج تھے۔ چند قدم آگے آ کر

”انہوں نے کرنل کو سیلوٹ کیا۔“

”کیپٹن.... کیا تم نے انہیں بتا دیا ہے کہ انہیں کیا

”کرتا ہے۔“ شیاام کمار کا صوفے سے اٹھتے ہوئے آسیہ

”سے کندھا گرا گیا اور وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔“

”تو سر.... دوسرے سپاہیوں کے سامنے بتانا

”مناسب نہیں تھا۔“ کیپٹن نے کہا۔

”شیاام کمار نے سر ہلایا۔ پھر سپاہیوں سے بولا۔“ ”یہ

”عورت راکھی خطرناک ترین ایجنٹ ہے۔ ہماری اٹلی

”جنس کی رپورٹ کے مطابق اس خوب صورت ناگن

”نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کئی دھماکے کیے جن میں



ہمارے بے شمار شہری مارے گئے۔ ہماری بیٹیاں یتیم اور بہنیں بیوہ ہو گئیں اس لیے اس کے ساتھ جتنا بھی برا کیا جائے کم ہے۔ اسے بے لباس کر کے اس کے بدن کے انچ انچ کو شول کر حساس مقامات کی وہ مائیکروفلم تلاش کرو جو اس کی جلد میں پوشیدہ ہے۔“

شیام کمار کا حکم سن کر کیپٹن آگے بڑھا اور آسیہ کے قریب آ کر ہاتھ بڑھایا۔ اچانک ہی صوفے کے عقب سے ایک قد آدم سیاہ جانور نے کیپٹن پر چھلانگ لگائی اور اس کے چہرے پر اپنے خونی پنچے مارتا ہوا دوسرے صوفے پر بیٹھے شیام کمار پر آگرا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں تاریکی پھیل گئی اور کیپٹن کی کرب ناک کراہوں اور شیام کمار کی اذیت ناک چیخوں سے کمر اکو بجنے لگا۔

☆☆

نوازش نے بھی باہر کمرے شخص کو دیکھا اور خوف سے اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گیا۔ وہ ایک دروازہ قامت شخص تھا جس کا چہرہ کسی جہنمی مخلوق کی طرح اتنا بھیاں تھا کہ خوف کی شدت سے ٹائیگر کی سانس رکنے لگی۔ وہ بھیاں چہرے والا عفریت نما شخص اندر آیا اور ایک ہاتھ پیچھے کر کے اس نے دروازہ بند کر دیا۔ نوازش نے ایک دم حرکت میں آ کر جیب سے ریوالور نکالا اور اس پر تان لیا۔

”ٹائیگر..... یہ کون ہے۔ کیا تم اسے جانتے ہو۔“ اس نے صوفے سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نن..... نہیں۔“ وہ ایک دم بوکھلا کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولا اور نوازش کے پاس آ کر۔

اس آدمی کی بھیاں صورت نے ٹائیگر پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ اس کی دونوں باجھیں جڑوں تک چیری ہوئی تھیں جس کی وجہ سے نوکیلے اور لمبے دانت صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہونٹ سولے اور کٹے پھٹے تھے۔ ناک کی جگہ دو سوراخ تھے۔ آنکھیں موٹی

اور بے حد خوں خوار تھیں۔ آنکھوں کے ڈھیلے ابھرے ہوئے تھے جن سے درندگی جھانک رہی تھی۔ چہرہ تو بے طرح سیاہ تھا اور پیشانی پر چھوٹا سا سیٹنگ تھا جو کم از کم تین انچ لمبا اور ایک انچ موٹا تھا۔ اس نے لمبا اور کوٹ پہنا ہوا تھا جب کہ سر پر ماڈ رکھی ہوئی تھی جس میں اس کے بال چھپے ہوئے تھے۔ نوازش نے کبھی خواب میں بھی اتنا بھیاں نہ دیکھا تھا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا قہر ناک تھا۔

”کون ہو تم؟“ نوازش نے سخت لہجے میں پوچھا۔

”کستورا.....“ اس کے منہ سے کھر کھراتی ہوئی خارج ہوئی۔

ساتھ ہی اس نے آگے قدم بڑھایا۔ نوازش غرایا۔ ”خبردار..... اپنی جگہ کھڑے رہو۔ ورنہ کوہ دوں گا۔“

”ہا ہا ہا.....“ اس نے بھیاں آواز میں تہہ لہا۔

”گولی مارو گے..... مار دو گولی۔“

اچانک نوازش کو خیال آیا کہ وہ کوئی ماورائی ہے اور شاید کالی داس نے اسے بھیجا ہے۔ تصدیق لیے اس نے کستورا کے چہرے کا نشانہ لیا اور فائر کر لیا۔ پھر بوکھلا گیا۔ ریوالور سے گولی برآمد نہیں تھی۔ اس نے تیزی سے ریوالور کا جیسر چیک کیا۔

”نوازش..... گولی چلاؤ۔“ کستورا غرایا۔

”کیا تمہیں کالی داس نے بھیجا ہے؟“ نوازش پریشان لہجے میں پوچھا۔

”ہاں..... میں اسی کے حکم پر تم دونوں کو فائر کر رہا ہوں۔ کیونکہ میں اس کی غلام روح ہوں۔“

یہ سن کر ٹائیگر خوف سے کانپنے لگا۔ ”تت.....“

”تمہیں شک ہے غدار آدمی؟“ کستورا نے

گھورتے ہوئے کہا۔

نوازش نے ایک بار پھر ریوالور کا ٹریگر دبایا لیکن اس بھی اس سے گولی باہر نہ آئی۔ کستورا نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

”تم ایک روح کو دنیاوی ہتھیاروں سے نہیں بکتے نوازش..... ریوالور پھینک دو۔“

”تم..... تم کیا چاہتے ہو؟“ نوازش نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”میں اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کرنا چاہتا ہوں۔“ کستورا آگے بڑھتے ہوئے غرایا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ٹائیگر پر پھونک ماری۔ دوسرے ہی لمحے ٹائیگر گھٹنوں تک فرش پر جنس گیا۔ اس نے چیخا جا ہا لیکن دہشت سے اس کی زبان تالو چپک کر رہ گئی۔ نوازش نے گھبرا کر ٹائیگر کی طرف گھما۔ اسی لمحے اس کا بھی وہی انجام ہوا اور اس کی ہاتھیں بھی گھٹنوں تک فرش میں جنس گئیں۔ نوازش نے لی زور لگایا لیکن خود کو فرش سے نہ نکال سکا۔ کستورا آگے بڑھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ اب ان دونوں کی طرف سے بے نیاز دکھائی دے رہا تھا۔

نوازش نے ٹائیگر کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خوف و شدت سے پیلا زرد ہو چکا تھا اور وہ سردی لگے اعضا کی طرح کانپ رہا تھا۔

”کستورا..... ہماری یہ حالت کب تک رہے گی۔“

نوازش نے کستورا کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”مہاراج کے آنے تک..... وہ آ کر فیصلہ کریں گے کیا کرنا ہے۔“ اس نے بھیاں انداز میں اتے ہوئے کہا۔

نوازش اس کی بات سن کر بے اختیار چونک پڑا۔ ”وہ تک آئے گا؟“

”علوم نہیں..... ہو سکتا ہے وہ پہنچنے ہی والے۔“ کستورا نے کہا۔ ”لیکن ان کے آنے تک میں

یہاں موجود رہوں گا۔ اس لیے مجھ سے نجات کی امید مت رکھنا۔“

نوازش کچھ نہ بولا۔ وہ بری طرح بے بس ہو چکا تھا۔ کستورا کے سحر سے آزاد ہونا اس کے بس میں نہیں تھا۔ صرف آسیہ ہی اس کے سحر کا توڑ کر سکتی تھی۔ لیکن آسیہ کے فوری آنے کی بھی توقع نہیں تھی اسے۔ وہ جانتا تھا کہ آسیہ مکان حاصل کرنے میں مصروف ہوگی اور جب تک اسے ہتھ نہیں چلے گا کہ وہ مصیبت میں مبتلا ہے آسیہ نہیں آئے گی۔ اسے اطلاع دینے کے لیے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل فون نکالا اور آسیہ کے موبائل کے نمبر ملائے۔

کئی لمحے گزر گئے مگر آسیہ نے کال وصول نہ کی۔ اس نے مایوس ہو کر موبائل آف کر دیا اور سوچنے لگا کہ آسیہ سے رابطہ کیوں قائم نہیں ہوا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر آیا۔ اسے دیکھ کر ٹائیگر چونکا۔

”باس..... آپ؟“ ٹائیگر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”ہاں غدار کتے۔“ وہ آدمی بولا۔ ”میں تمہیں تمہاری غدار کی سزا دینے آیا ہوں۔“

نوازش سمجھ گیا کہ وہ کالی داس ہی ہے۔ ٹائیگر کے منہ سے جواب ایک لفظ بھی نہ نکل سکا تھا۔ نوازش نے کالی داس کو گھورتے ہوئے کہا۔

”کالی داس..... تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ ہمیں کستورا کے سحر سے آزاد کر دو۔ ورنہ.....“

”وہمکی مت دو نوازش..... وہمکیوں کا زمانہ جا چکا ہے۔“ کالی داس نے نخوت سے سر جھٹک کر کہا۔

”کیوں..... اب کون سا فرمان آ گیا ہے جو تم اتنے مغرور ہو رہے ہو؟“ نوازش نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہاری اور آسیہ کی بربادی کا زمانہ ہے۔“ کالی داس ہنسا۔ ”تم آج جس قدر بے بس ہو اس سے تمہیں



یقین کر لیتا چاہیے کہ اب تم صرف چند منٹ کے مہمان ہو اس دنیا میں اور اس کے بعد... اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اور اس کے بعد میں دوسری دنیا میں پہنچ جاؤں گا۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا؟“ نوازش نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

”نہیں تو... کس احمق نے کہا ہے کہ تم دوسری دنیا میں پہنچ جاؤں گے۔“ کالی داس نے منہ بتایا۔ ”نہیں پیارے دشمن... تم اسی دنیا میں رہو گے۔ میں تمہیں دوسری دنیا میں ہرگز نہیں جانے دوں گا اور اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ مگر اپنا غلام بنا کر۔“

”کیا مطلب؟“ نوازش نے اسے گھورا۔ ”تم اور مجھے غلام بناؤ گے؟“

”تمہیں نہیں تمہاری روح کو غلام بناؤں گا اپنا۔“ کالی داس نے تیزی سے کہا۔ ”پھر اسے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کروں گا۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے کالی داس۔“ نوازش غرایا۔

”کیوں نہیں کر سکتا۔ میرے ذہن میں جب کوئی منصوبہ جنم لیتا ہے تو میں فوراً اس پر کام شروع کر دیتا ہوں۔ تمہاری روح کو تاج کرنے کا خیال میرے ذہن میں آج ہی آیا ہے۔ یہ سنہری موقع میں ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ آج تو تمہیں مادھوری بھی نہیں بچا سکے گی۔“

”کیوں... آج کیا وہ تمہاری قید میں ہے۔“ نوازش چونکا۔

”نہیں... آج وہ فوج کی گرفت میں ہے اور فوج کی گرفت سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ فوج نہ رشوت لیتی ہے اور نہ حسن کا نذرانہ قبول کرتی ہے۔“

”تم جھوٹ بکتے ہو۔“ نوازش نے غصے سے کہا۔

”فوج بھلا اسے گرفت میں لے کر کیا کرے گی۔“

”وہ... وہ تمہاری غیرت و عزت کو پامال کر رہی ہے

اور تم پوچھتے ہو فوج کیا کرے گی۔“ کالی داس نے سر جھٹک کر کہا۔ ”ارے وہ مادھوری کا پرانا عاشق شیاام کمار کرنل کے روپ میں اپنے دس بارہ جوانوں کے ذریعہ اس کی عزت پامال کر رہا ہے۔“

یہ سن کر نوازش کی ہڈیاں تک سنگ اٹھی۔ اسے فوراً خیال آیا کہ آسیہ نے اس کی کال کیوں وصول نہیں کی تھی۔ یقیناً وہ فوج کی گرفت میں ہے بس ہوگی اور شیاام کمار انتقاماً اس کی عزت و آبرو کے پرزے اڑا رہا ہوگا۔ نوازش کے لیے یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔

”نہیں۔“ وہ غضب ناک آواز میں چیخا۔ ”تم جو لے مار مجھے فریب میں مبتلا کر رہے ہو۔“

”بکومت...“ کالی داس بھی غرایا۔ ”مجھے شیاام کمار نے دعوت دی تھی کہ میں چھاؤنی آ کر آسیہ کی عزت لٹنے کا تماشا دیکھوں۔ لیکن میں اس غدار کو سزا دینا کے لیے بے تاب تھا۔ بہر حال تمہیں یقین نہیں تو میں ابھی شیاام کمار سے تمہاری بات کرا دیتا ہوں۔“

اس نے خاموش ہو کر جیب سے موبائل فون نکالا اور اس پر نمبر ملا کر انتظار کرنے لگا۔ کئی لمحے گزر گئے لیکن رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے دوبارہ نمبر ملائے۔ لیکن اس بار بھی کوئی جواب نہ ملا۔

فل جا رہی تھی لیکن شیاام کمار کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ کالی داس کے ذہن میں فوراً ہی ایک خدشے نے سر

ابھارا اور اس نے موبائل جیب میں رکھ کر دوسری جیب سے آئینہ نکال لیا۔ ٹائیگر خوف زدہ نگاہوں سے کالی

داس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نوازش کی پریشانی سے بری حالت ہو رہی تھی۔ کستورا مودبانہ انداز میں کمزرا کال

داس کی طرف متوجہ تھا۔

کالی داس نے آئینے پر منتر پھونکا اور اس میں چندریکا کی کھوپڑی کا عکس دیکھ کر بولا۔ ”چندریکا...“

شیاام کمار میری کال کیوں نہیں سن رہا ہے؟“

”مہاراج... اس کے پاس فون نہیں ہے۔“

”مہاراج... انہوں نے مادھوری کے بے جان جسم

لٹا کر کیا ہے۔ مادھوری کی روح آزاد ہے۔“

ہکا کی کھوپڑی سے آواز آئی۔

مگر چند منٹ پہلے تو تھا۔ ادھر آتے ہوئے راستے اس نے مجھے اپنے موبائل سے ہی کال کیا تھا۔“

”مہاراج...“ کالی داس نے کہا۔ ”پھر کہاں گیا اس کا موبائل۔“

”موبائل اس کے لباس کی جیب میں ہے۔“

”آج۔“

”آج... تو کیا وہ بہرا ہو گیا ہے جو اسے کھنٹی نہیں دیتی تھی۔“

”کیوں... کیا اس نے کرنل صدام کا جسم لٹا کر کوئی اور جسم اپنا لیا ہے؟“

”نہیں... لیکن اس کے بغیر ہی ہے مہاراج۔“ چندریکا

موبائی بولی۔

”عجب بات ہے... بہر حال تم بتاؤ۔ اس نے

ماری کا کیا حشر کیا ہے تاکہ نوازش کو یقین آ جائے کہ

ما نے غلط نہیں کہا۔“ کالی داس نے ناگواری سے کہا۔

”لیا فوجی جوانوں نے اس کا بدن پامال کر دیا ہے۔“

”نہیں مہاراج... وہ سچ گئی ہے۔“ چندریکا نے کہا۔

”دلی داس بے اختیار اچھل پڑا۔“ کیا مطلب...“

”سیل بتاؤ۔“

”مہاراج... مادھوری نے فوجی کیپٹن کو مار ڈالا ہے

”مگر... مگر شیاام تو کہہ رہا تھا کہ اس نے مادھوری کو

بے بس کر رکھا ہے اور وہ زبان تک نہیں ہلا سکتی۔“

”پھر...؟“

”مہاراج... دراصل شیاام کمار سے غلطی ہو گئی تھی۔

وہ مادھوری کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن اٹھتے

وقت اس کا کندھا مادھوری کے جسم سے ٹکرا گیا جس کی

وجہ سے مادھوری پر اس کا سحر زائل ہو گیا تھا۔“

”خیر... وہ تو سچ گئی... لیکن نوازش نہیں سچ سکے گا۔“

کالی داس نے جڑے پیچھے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے آئینے پر پھونک ماری اور

آئینہ جیب میں رکھ لیا۔ اس نے غضب ناک نگاہوں

سے نوازش کی طرف دیکھا۔ نوازش چندریکا سے اس کی

گفتگو سننے کے بعد مطمئن ہو چکا تھا کہ آسیہ شیاام کمار کی

گرفت سے آزاد ہو گئی ہے۔

”کالی داس...؟“ اس نے طنزیہ انداز سے

مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ تم جھوٹ

بول رہے ہو۔“

”ہاں... لیکن تمہاری موت جھوٹ نہیں ہوگی۔ پہلے

میں اس غدار کو سزا دے دوں۔“ اس نے ٹائیگر کو گھورا۔

پھر وہ ایک دم غرایا۔ ”کستورا...“

”حکم مہاراج۔“ کستورا نے تیزی سے کہا۔

”ٹائیگر کو چھت کے ساتھ الٹا لٹکا دو۔“ کالی داس

نے حکمانہ لہجہ میں کہا۔

اس کا حکم سن کر کستورا نے کچھ پڑھ کر ٹائیگر کی طرف

پھونک ماری۔ دوسرے ہی لمحے ٹائیگر کے گرد دھواں سا

بھیل گیا اور وہ اس دھواں میں چھپ گیا۔ پھر وہ

دھواں بلند ہونے لگا۔ چھت کے قریب پہنچ کر دھواں

رکا۔ پھر منتشر ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے نوازش حیران رہ

گیا۔ ٹائیگر بغیر کسی رسی یا زنجیر کے چھت کے ساتھ اس

طرح لٹکا ہوا تھا جیسے کسی غیبی قوت نے اسے جیروں

سے پکڑ کر لٹکا رکھا ہو۔ اس کے پاؤں چھت سے تین



فٹ نیچے آپس میں یوں ملے ہوئے تھے جیسے کسی نادیدہ رسی سے بندھے ہوئے ہوں۔ اس کا سر فرش سے تقریباً چار فٹ بلند تھا اور دونوں بازو بے جان انداز میں لٹک رہے تھے جب کہ آنکھیں بند تھیں۔

یقیناً وہ خوف کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ نوازش کو اس پر ترس آنے لگا۔ کالی داس اس کے قریب آیا اور اس کے سر کے بال پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے غرایا۔

”ہاں... اب بولو۔ تم نے میرے حکم کی تعمیل کرنے سے گریز کیوں کیا؟ میری نافرمانی کیوں کی؟“  
ٹائیگر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ واقعی بے ہوش تھا۔ نوازش کو کالی داس پر بہت غصہ آیا۔ اس نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

”کالی داس..... یہ بے ہوش ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“  
”ہا ہا ہا۔“ کالی داس اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ ”بے فکر رہو مادھوری کے یار۔ ابھی تمہارا بھی یہی حال کیا جائے گا۔ گھبراتے کیوں ہو۔“

پھر اس نے کستورا کی طرف دیکھ کر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”کستورا۔ تمہارے ناخن کافی تیز اور نوکیلے ہیں۔ کبھی تم نے کسی ایسے قصاب کو دیکھا ہے جو کند چھری سے بکرے کی کھال اتارنے کی کوشش میں مصروف ہو۔“

”ہاں مہاراج..... ایک بار دیکھا ہے کھال اترتے۔“ کستورا نے کہا۔

”بس تو تم اپنے ہاتھوں سے ٹائیگر کی کھال اتارو۔ اس کے بعد نوازش کا نمبر ہے۔“

کستورا دونوں ہاتھ دراز کیے آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھوں کے ناخن ایک ایک انچ لے لے اور عقاب کے ناخنوں کی طرح مڑے ہوئے تھے۔ ٹائیگر کے پاس پہنچ کر وہ رکا۔ کالی داس کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ بڑی دلچسپی سے کستورا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی

طرف سے غافل پا کر نوازش نے آخری کوشش کے طور پر جیب سے ریوالور نکالا اور کالی داس کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ اسی لمحے کالی داس نے غیر ارادی طور پر چہرہ گھما کر نوازش کی طرف دیکھا اور بے آواز ریوالور کی گولی اس کی گردن کے آر پار ہو گئی۔

کالی داس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی کرب ناک چیخ خارج ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر فرش پر گر گیا۔ کستورا نے پلٹ کر کالی داس کی طرف دیکھا۔ کالی داس فرش پر تڑپتے ہوئے بہ مشکل بولا۔

”کس... کستو... را..... اس نابکار کو بھسم... بھسم... ڈالو۔“

”مہاراج..... اس کے گلے میں نقش والی تختی ہے۔ اس پر آگ اثر نہیں کرے گی۔“ کستورا نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

”ارے نابکار۔ اسے فرش میں پورا..... پورا۔ دفن.... کر دو نقش سمیت۔“ کالی داس تڑپتے ہوئے ایک انگ کر بولا۔

کستورا نے جلدی سے نوازش پر سحر پھونکا اور نوازش کا سینے تک جسم فرش میں سما گیا۔ اس سے اوپر نقش لٹک رہا تھا جس کی وجہ سے وہ پورا دفن نہ ہو سکا۔ کستورا۔ کالی داس سے کچھ کہتا چاہا۔ مگر اسی لمحے دروازے کے پاس سے کوئی سیاہ جانور اڑتے ہوئے کستورا پر آگرا۔ کستورا چیخا اور ایک دم غائب ہو گیا۔

وہ جانور سیاہ رنگ کی قد آدم اور خوں خوار بلی تھی۔ کستورا کے غائب ہوتے ہی بلی کالی داس کی طرف چھٹی اور اسی لمحے کالی داس کے منہ سے آخری ہلکی خارج ہو گئی۔ بلی نے اس کی گردن جڑوں کی گڑ میں لی اور چبانے لگی۔

نوازش حیرت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک دو لمحوں بعد ہی بلی نے کالی داس کی گردن چھوڑ دی اور ایک دم غائب ہو گئی۔

☆☆

اس میں موجود نو جوان اور خوب صورت لڑکی تھا تھی لالہ پانچویں منزل سے نیچے آرہی تھی۔ مگر تھوڑے لمحوں میں اچانک رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھ گلے پر رکھ کر چیخنے کی کوشش کی اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ نادیدہ ہاتھوں عقب سے اس کی گردن دبوچ رکھی تھی اور لڑکی کا سر باہر ہاتھ۔ چند لمحوں بعد ہی اس کا بے جان جسم کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ مگر صرف دو سیکنڈ کے خیرے سیکنڈ پر اس کے جسم میں حرکت ہوئی اور مہل کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے تیزی سے لفٹ کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔

وہ نکل نہ تھا۔ وہ سامنے والے فلیٹ کی طرف اس فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دھکا دیا وہ کھل گیا اور وہ فلیٹ میں داخل ہو گئی۔ سامنے ٹی سینے تک فرش میں دھنسا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کچھ کر نوازش نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ نہ ہون تھی۔ اس نے نوازش کی حالت اور ٹائیگر کا منہ دیکھا لیکن حیرت انگیز طور پر اس کا چہرہ ہر قسم ات سے عاری رہا۔ اس پر نوازش کو اور بھی ہلکی۔ وہ سوچنے لگا کہ یقیناً وہ کوئی بے حس جسم کی۔ وہ ساکت نگاہوں سے نوازش کے سینے کی رہی تھی۔ نوازش نے سر جھکا کر اپنے سینے پر

ہاتھ ہی نوازش کا جسم خود بہ خود فرش سے نکل کر حیرت سے لڑکی کی طرف دیکھا لیکن لڑکی طرف پشت کیے ٹائیگر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لمحوں بعد ٹائیگر کا الٹا جسم ایک دم سیدھا ہوا اور فرش پر پہنچ کر دروازہ ہو گیا۔ تب نوازش کے ہاتھ اٹھ پھیل گئی۔ وہ اسے پہچان گیا تھا۔ کی کی شکل اس کے لیے اجنبی تھی لیکن اسے

یقین تھا اس کے بدن میں آسید ہی ہے۔ ”مجھے ذرا دیر ہو گئی ڈیر۔“ وہ نوازش کی طرف پلٹ کر مسکرائی۔

”نو پر اہم..... میں جانتا ہوں تم شام کنار کے جنگل میں پھنسی ہوئی تھیں۔“ نوازش نے فرش پر پڑے کالی داس کے بے جان جسم پر نظر ڈالی۔ ”بہر حال تم ٹھیک وقت پر پہنچی ہو۔ دیر آید درست آید۔ میں سمجھ رہا تھا کہ شاید تم کستورا کے تعاقب میں گئی ہو۔“

”نہیں..... میں نے اسے جانے دیا۔ مجھے تمہاری فکر تھی کہ فرش میں دھنسنے سے تم بہت تکلیف میں ہو گے۔ ہاں تم درست حالت میں ہوتے تو میں کم از کم کالی داس کا پیچھا ضرور کرتی۔ ادھر میں نے اس پر حملہ کیا اور وہ وہ جسم چھوڑ کر نکل بھاگا۔“

”یہ کیا جسم کہاں سے لیا؟“ نوازش نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کیسا ہے؟“ ”سیکسی ہے نا؟“ ”آسید نے شوخ لہجے میں کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”زبردست۔“ نوازش کے بدن میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ ”تمہارا ہر روپ ہی قیامت خیز ہوتا ہے ڈارلنگ۔“

”مسکد لگا رہے ہو ڈیر۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”نہیں یار۔ ریلی! کہو تو قسم کھاؤں۔“ نوازش نے اپنائیت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ارے..... ارے..... تم واقعی جذبات میں آرہے ہو۔“ وہ تیزی سے بولی۔ ”یہاں سے چلنے کی فکر کرو۔ میں نے جس لڑکی کا جسم اختیار کیا ہے وہ لفٹ میں تھی اور شاید اوپر کے فلور پر رہتی تھی۔ نیچے اگر اس کے باپ یا بھائی نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو مجھے مار دیں گے یا تمہیں.....“

”ٹائیگر کا کیا کریں۔ اس نے مجھ پر اعتماد کیا تھا۔“ نوازش نے ٹائیگر کے بے ہوش جسم کی طرف اشارہ



”کیا۔“ میں نے اسے دست بتایا ہے۔ بڑا جی دار آدمی ہے۔ میری وجہ سے ہی کالی داس کی کھال اتر وارہا تھا اور میں نے اسے گولی مار دی تھی۔“

”کستور پر تو گولی نے اثر نہیں کیا ہوگا۔“ آسیہ نے پوچھا۔

”گولی چلی ہی نہیں۔۔۔ اس نے نہ جانے میرے ریوالور پر کوئی سحر پھونکا تھا کہ ٹریگر دبانے کے باوجود ریوالور سے گولی نہ نکلی۔“

”خیر۔۔۔ پھر چلتے ہیں۔ ٹائیگر کو ہوش آ جائے گا۔ پھر اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔ فی الحال تو ہمیں رہائش کا انتظام کرنا ہے۔“

”تو کیا تم نے ابھی تک انتظام نہیں کیا۔“ نوازش نے پوچھا۔

”کہاں۔“ وہ مسکرا دی۔ ”ایک پراپرٹی ڈیلر کے پاس گھر دیکھنے جا رہی تھی کہ شام کمار کے ماتحت فوجیوں نے جاسوسی کے الزام میں پکڑ لیا اور طیر چھاؤنی لے گئے جہاں وہ خبیث کرٹل صدام بنا ہوا تھا۔ وہ اختصار کے ساتھ سارا قصہ بیان کرنے لگی۔ وہ خاموش ہوئی ہی تھی کہ ٹائیگر کو ہوش آ گیا اور وہ آنکھیں کھول کر حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر آسیہ کو دیکھ کر چونکتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

”ٹائیگر۔۔۔ یہ میری دائف ہے۔“ نوازش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا۔۔۔ کیا۔۔۔ یہ مر گیا ہے۔“ اس نے کالی داس کے بے جان جسم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ اس جسم میں سے کالی داس کی روح نکل گئی ہے۔ اب وہ کوئی اور جسم اختیار کر لے گا۔“ نوازش بولا۔ ”بہر حال اب تم اسے ٹھکانے لگانے کا انتظام کرو۔ ہم ایک ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ میں بعد میں فون پر تم سے بات کر لوں گا۔“

پھر نوازش اور آسیہ ٹائیگر کے فلیٹ سے نکل کر نیچے

آئے جہاں نوازش کی کار کھڑی تھی۔ آسیہ اس ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور نوازش گلشن اقبال طرف کار دوڑانے لگا۔ چند منٹ بعد وہ گلشن پہنچ گئے وہاں پراپرٹی ڈیلر اقبال نے ان کی پذیرائی۔ نوازش نے اس سے فرنٹ مکان دکھانے کو کہا تو ڈیلر نے کہا

”جی ہاں۔ ایک بنگلہ ہے۔ صبح ایک خاتون نے اس کی تھی اس کے لیے۔ لیکن وہ نہیں آئیں نہ دوبارہ۔ کیا۔ اب میں ان کا پابند نہیں ہوں۔ شاید ان کی قسم میں نہیں تھا۔ درنہ ایسے خوب صورت گھر تو مقدر والا کو ملتا کرتے ہیں۔“

نوازش نے آسیہ کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

☆☆

بنگلہ جدید طرز تعمیر کا حامل تھا اور فرنیچر سب ضروریات زندگی کی ہر شے وہاں موجود تھی۔ انھوں نے کھانے پینے کی اشیاء کے سوا کچھ بھی نہ خریدا تھا۔ اس کی معرفت ہی ایک چوکیدار اور گھر کا کام کاج کر والی ماسی کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس وقت شام کے سا بچ رہے تھے۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے الم کر رہے تھے کہ ماسی ان کے لیے چائے بنا کر آئی۔ اس کا نام رانی تھا۔ عمر چوبیس پچیس برس قریب تھی۔ شادی کو تین برس گزر چکے تھے لیکن اسے محروم تھی۔ اس کا شوہر بھی محنت مزدوری کرتا تھا وہ گلشن کی ایک کچی آبادی میں کرائے کے چھوٹے مکان میں رہتے تھے۔ رانی قریب کے دو بنگلوں بھی کام کرتی تھی۔

آسیہ نے اسے آمادہ کر لیا تھا کہ وہ دوسری سے کام چھوڑ کر مستقل یہاں آ جائے تو اسے تنخواہ دی جائے گی۔ رانی کو دوسرے دو گھروں ماہانہ چند سو روپے ملتے تھے۔ لیکن جب آسیہ اسے چار ہزار روپے ماہانہ کی آفر کی تو وہ بے ہوش ہوئی اور وہ اسی وقت پہلے دو گھروں کو جواب دیا

دوسرا ملازم چوکیدار اور جیڑ عمر کا پٹھان تھا۔ وہ فوج کا تارڑ سپاہی تھا۔ صحت اچھی تھی۔ اس کے بیوی صاحبہ سرحد کے کسی گاؤں میں رہتے تھے۔

تیسری رات کے کھانے کے لیے کیا پکانا ہے؟“ نے انہیں چائے پیش کرنے کے بعد آسیہ سے کہا۔

”کھانا ہم باہر کھائیں گے آج۔“ آسیہ نے جواب دیا۔ ”کیا تم کو گھر جانا ہے؟“

ابھی تو ہمیں آٹھ بجے جاؤں گی۔ میرا شوہر مجھے آئے گا۔“ رانی نے جواب دیا۔

”لیک ہے۔ ہم باہر جا رہے ہیں۔ جب تمہارا شوہر آئے تو چلی جانا۔ مگر چوکیدار کو بتا کر جانا۔“

”انی سر ہلا کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے بعد نوازش نے پوچھا۔ ”ڈرائنگ۔۔۔ کہاں کا کام ہے۔“

”ہمارے کو کالی داس کی گرفت سے آزاد کرانے کی سہا کر رہے۔“ آسیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ادھا سے میں معلوم کر چکی ہوں کہ کالی داس نے کہاں چھپا رکھا ہے۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

نوازش جلد ہی تیار ہو گیا۔ پھر آسیہ کے ہمراہ کار میں کر روانہ ہو گیا۔

☆☆

رانی کا رڈ نیفٹس فیز ٹو کی ایک اسٹریٹ پر پہنچی اور میں ہاتھ کی ایک عمارت کے گیٹ پر رک گئی۔ گیٹ سب نیم پلیٹ پر بنگلے کا نام ”ڈوگر ہاؤس“ نظر آ رہا اب کہ گیٹ بند تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے دروازے اور قوی ایڈجسٹمنٹ نے ہارن بجایا اور چند لمحوں میں گیٹ کھل گیا۔ گیٹ کھولنے والا ہادر دی اور سلسلہ کارڈ اس نے دروازے کی صفحہ کو سلام کیا اور ایک طرف گیا۔ کار اندر آئی اور برآمدے کے سامنے رک۔ اسی لمحے عمارت کے اندر سے ایک خوب صورت

اور جوان عورت برآمدے میں پہنچی اور رک کر مسکراتے ہوئے دروازے کی صفحہ کو دیکھنے لگی جو انجن بند کر کے کار سے اتر آیا تھا۔ وہ برآمدے کی طرف بڑھا۔

”ہیلو ارشد۔۔۔ عورت نے اسے مخاطب کیا۔ ”خیریت تو ہے۔ آج تو تم بہت جلدی آ گئے ہو کورٹ سے۔“

”ہاں بیگم۔“ دروازے کی صفحہ سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ایک دو کیس تھے مگر متعلقہ جج چھٹی پر تھا۔ اس لیے میرا دہاں بیٹھنا فضول تھا۔“

وہ بیگم کے ساتھ چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آیا اور صوفے پر بیٹھ کر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے لگا۔ بیگم اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”کیا تم کہیں جانے والی ہو؟“ ارشد نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ خالہ کو دل کا دورہ پڑا ہے صبح۔ وہ ایک پرائیویٹ کلینک میں ایڈمٹ ہیں۔ خالو کا فون آیا تھا۔“ بیگم نے کہا۔ ”اب اتفاق سے تم آ ہی گئے ہو تو میرے ساتھ چلو۔“

”نہیں۔۔۔ مجھے ایک اہم کیس کی تیاری کرنی ہے۔ پھر تین بجے سپریم کورٹ پہنچنا ہے۔“ ارشد بولا۔ ”تم چلی جاؤ۔“

”اچھا۔۔۔ میں ملازم کو تمہارے لنگے کا کپے جاتی ہوں۔“ بیگم ہنستے ہوئی بولی۔

”رہنے دو۔۔۔ مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ صرف چائے پیوں گا۔ تھوڑی دیر بعد۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ میں شام تک لوٹ آؤں گی۔“ بیگم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد ارشد کچھ سوچنے لگا۔ دو تین منٹ بعد باہر سے کار اشارت ہونے کی آواز آئی تو اس نے گہرا سانس لیا۔ پھر اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ چند لمحوں بعد ایک

ادھیز عمر ملازمہ اندر آئی۔



”میں معروف ہوں۔ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔“  
 ارشد نے سخت لہجے میں کہا۔  
 ”بہت بہتر صاحب۔“ ملازم نے کہا۔  
 وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔ ارشد نے اٹھ کر  
 دروازہ بند کیا۔ پھر کمرے سے اٹیچڈ اپنے اسٹڈی روم  
 میں آیا اور ریو لوئنگ چیئر پر بیٹھ کر میز پر رکھے فون کا  
 ریسیور اٹھالیا۔ اس نے نمبر ملائے اور انتظار کرنے لگا۔  
 ”ہیلو۔۔۔ عامر اسپیکنگ۔“ سلسلہ ملنے پر آواز آئی۔  
 ”کیا یہ نیشنل ٹریڈنگ ایجنسی سے ہے؟“ اس نے  
 پوچھا۔  
 ”جی ہاں۔۔۔ حکم فرمائیے۔“ دوسری طرف سے کہا  
 گیا۔  
 ”میں ارشد ڈوگر ایڈووکیٹ بات کر رہا ہوں۔“ اس  
 نے بتایا۔ ”کیا آپ لندن کے لیے ویزے کا انتظام کر  
 سکتے ہیں؟“  
 ”جی ہاں۔۔۔ ہو جائے گا۔ لیکن اس میں ایک ہفتہ  
 لگ جائے گا۔“  
 ”کیا جلدی نہیں ہو سکتا۔“ اس نے چوکتے ہوئے  
 پوچھا۔  
 ”جلدی بھی ہو تو جب بھی کم از کم تین دن تو ضرور  
 لگیں گے سر۔“ عامر نای شخص کی آواز آئی۔ ”کیا  
 پاسپورٹ تیار ہے۔“  
 ”نہیں۔۔۔ لیکن ارجنٹ بخالیا جائے گا۔“ ارشد بولا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ آپ جب پاسپورٹ ہمیں پہنچا دیں  
 گے ہم اپنا کام شروع کر دیں گے۔“  
 اس کے ساتھ ہی اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال  
 دیا۔ پھر جیب سے سگریٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگایا  
 ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔  
 ”ہیلو۔۔۔ ڈوگر بول رہا ہوں۔“ اس نے ریسیور اٹھا  
 کر کہا۔  
 ”انسپکٹر اسلم خان بول رہا ہوں وکیل صاحب۔“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”میرے کیس کا کیا ہوا؟“  
 ”کون سا کیس؟“ اس نے چوکتے ہوئے پوچھا۔  
 ”ارے۔۔۔ بھول گئے آپ۔۔۔ کمال ہے۔“ انسپکٹر  
 نے حیرت سے کہا۔  
 ”اوہ۔۔۔ سوری انسپکٹر۔ میں کسی اور خیال میں تھا۔“  
 ارشد نے تیزی سے کہا۔ ”آپ بے فکر رہیں۔ جلد ہی  
 آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔“  
 ”شکریہ ڈوگر صاحب۔۔۔ میرے لائق کوئی  
 خدمت۔“  
 ”ہاں یاد آیا۔۔۔ مجھے ایک ارجنٹ پاسپورٹ بخانا  
 ہے۔ آپ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟“  
 تین دن میں بن جائے گا۔“  
 ”آج کل ارجنٹ پاسپورٹ بھی ایک مہینے سے پہلے  
 نہیں ملتے صاحب۔“ انسپکٹر نے جتنے ہوئے کہا۔  
 ”بہر حال آپ کو دو تین دن میں چاہیے تو آپ کو اپنا نام  
 بدلنا پڑے گا۔ میرے پاس چند پاسپورٹ ہیں جو بھل  
 لمزموں سے لیے تھے۔ تصویر بھی تبدیل کرنا ہوگی۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ آپ کسی کے ذریعے مجھے بھجوا دیں۔“  
 ارشد نے کہا۔ ”اوکے۔“  
 اس نے فون بند کیا اور سگریٹ کے کش لینے لگا۔ پھر  
 منٹ بعد اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی اور اس نے  
 چوکتے ہوئے جیب سے موبائل نکال لیا۔  
 ”ہیلو۔۔۔ ڈوگر بول رہا ہوں۔“ اس نے موبائل آلا  
 کر کے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔  
 ”مجھے تو لگتا ہے تم وکیل ہو۔ یہ ڈوگر کیا وکالت کی  
 کوئی ڈگری ہے؟“ دوسری طرف سے ایک انجینی  
 آواز سنائی دی۔  
 ”میرا پورا نام رشید ڈوگر ہے۔“ اس نے غصے سے  
 کہا۔ ”کون ہو تم؟“  
 ”میں وہ ہوں جس سے تم جیسے وکیل مشورے ا  
 کرتے ہیں۔“ آواز آئی۔

”اوہ۔۔۔ کیسے مشورے؟ کیا تم کوئی بیرسٹر ہو؟“ ارشد  
 ہلکتے ہوئے پوچھا۔  
 ”نہیں۔۔۔ بیرسٹر نہیں۔ بیرمیٹر ہوں۔ دودھ کا  
 پانی کا پانی کرنے والا۔“ ہنستی ہوئی آواز آئی۔  
 ”کومت۔۔۔ تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو مسٹر۔“  
 ”اے۔۔۔“  
 ”کوئی بات نہیں۔ حساب رکھتے رہو۔ جتنا وقت  
 لے لوگا اس کا پورا پورا مواضعہ دوں گا۔“  
 ”مگر تم ہو کون؟ کیا چاہتے ہو۔“ اس نے تلخ لہجے  
 میں پوچھا۔  
 ”ایک عورت کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے  
 لی اپنا سا مشورہ چاہیے۔“  
 ”سوری۔۔۔ تم نے غلط جگہ پر فون کیا ہے مسٹر۔“ اس  
 نے انداز میں کہا۔ ”وکیل کا کام قتل کرنا نہیں قتل  
 بنانا ہوتا ہے۔“  
 ”اچھا۔۔۔ تو پھر مجھے قتل ہونے سے بچالو۔۔۔ ورنہ میں  
 یہی قتل کر ڈالوں گا۔“ آواز آئی۔ ”کیوں کہ یہ مب  
 ہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔“  
 ”بھاری بکواس میرے پلے نہیں پڑ رہی۔ اس لیے  
 مگر رہا ہوں۔“ ارشد نے غضب ناک ہو کر کہا۔  
 ”یک منٹ ٹھہرو۔۔۔ کیا تم جانتا چاہتے ہو کہ  
 لی اس وقت کہاں اور کیا کر رہی ہے۔“ تیزی  
 سے پوچھا گیا۔  
 ”اوہ۔۔۔ تم کیسے مادھوری کو جانتے ہو؟“ وہ بے  
 اہم لہجے میں پڑا۔  
 ”اپنے کہ تم اور میں ایک کشتی کے سوار ہیں۔ اکٹھے  
 مددگار میں مرے تھے۔“ جواب دیا گیا۔  
 ”الی داس نے بے اختیار دانت پیس ڈالے۔“ اوہ  
 کار۔۔۔ ذلیل کتے۔۔۔ اتنا سپینس کیوں  
 لے ہو ہر بار۔“  
 ”نہیں ہی پھیلا یا ہے نا، برڈ فلو وائرس تو نہیں

پھیلا یا جو تمہاری سرغیوں کو بیمار کر ڈالے گا۔“ دوسری  
 طرف سے شام کمار نے جتنے ہوئے کہا۔  
 ”ہوں۔۔۔ اس وقت کہاں ہو؟“ کالی داس بے  
 اختیار مسکرایا۔  
 ”تاج محل میں۔“ شام کمار نے بتایا۔  
 ”اوہ۔۔۔ آگرہ کے تاج محل میں؟“ کالی داس  
 چونکا۔  
 ”اے گھاسڑ۔۔۔ تاج محل ہوٹل میں۔“ شام کمار نے  
 غصے سے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم میری طرف  
 سے غافل رہتے ہو۔ مجھے دیکھو کتنی جلدی تمہارا کھوج  
 لگا لیا ہے۔“  
 ”بس یار۔۔۔ پریشانی میں خیال ہی نہیں آیا تمہارا۔“  
 ارشد نے مسکراتے ہوئے کہا جو کہ کالی داس ہی تھا۔  
 ”کیسی پریشانی؟ کیا پاسپورٹ کی؟“ شام کمار نے  
 پوچھا۔  
 ”ہائیں۔۔۔ جنہیں کس نے بتایا؟“ کالی داس کی  
 آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔  
 ”بے وقوف روح۔۔۔ تم نے خود ہی تو چند منٹ پہلے  
 بتایا تھا جب میں نے اپنے کیس کے بارے میں  
 پوچھا۔“  
 ”اچھا۔۔۔ تو وہ تم تھے۔“ کالی داس کو حیرت کا جھٹکا لگا۔  
 ”اور کیا تمہارا باپ تھا۔“ شام کمار کی ہنستی ہوئی  
 آواز آئی۔ ”بہر حال۔ یہ بتاؤ پاسپورٹ کس کے لیے  
 چاہیے۔“  
 ”پھر بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ تاج محل میں کیا کر رہے ہو؟“  
 ”مقبورہ بنارہوں مادھوری کا۔“ شام کمار کا لہجہ ناگوار  
 تھا۔ ”اس کی وجہ سے فوجی چھاؤنی سے بھاگنا پڑا۔“  
 ”اچھا۔۔۔ تم مقبورہ بنا لو تو مجھے بتانا۔“ کالی داس مسکرا  
 دیا۔ ”اور کوئی بات ہے؟“  
 ”سنو۔۔۔ کیوں نہ ہم اکٹھے رہیں اور مل کر مادھوری  
 سے دودھ ہاتھ کریں۔“ شام کمار نے تیزی سے کہا۔



”گھر پر تو ممکن نہیں ہے۔ کوئی مشترکہ ٹھکانا بنانا پڑے گا جہاں سے ہم ایک نئے سرے سے اور خفیہ انداز میں کام کر سکیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں پروگرام بنا کر تمہیں اطلاع دیتا ہوں۔“ شام کنار نے کہا۔ ”میری کال کا انتظار کرنا دو گے۔“

ڈور انٹرکام پر بات کرے تو کہنا کہ تمہیں بلوچ کوکا  
 صاحب کا ضروری پیغام دینا ہے جو صرف بلوچ  
 لیے ہی ہے۔“ آئیہ نے سمجھایا۔

میں اس کے لیے یاس کا اہم پیغام لایا ہوں جو تہ  
میں جا کر اسے دوں گا اور شام تک وہیں  
رہا گا۔“

”ادھر کمرے میں چلو۔“  
وہ نوازش کے آگے چلنے لگا۔ راہ داری کے پہلے  
کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ تینوں کمرے میں داخل  
ہوئے۔ اندر ایک میز کے گرد چند خالی کرسیاں رکھی  
تھیں جب کہ میز پر شراب کی دو بوتلیں اور دو گلاس نظر  
آ رہے تھے۔ کمرے میں آ کر موٹھچوں والا نوازش کی  
طرف دیکھنے لگا۔



گا۔ تم کیا پیغام لائے ہو؟

”ان دونوں کے سامنے میں نہیں بتا سکتا۔“ نوازش بولا۔ ”تم خود اوپر آ جاؤ یا میں نہ خانے میں آ جاتا ہوں اور یہ بھی سن لو کہ نادرہ کی حفاظت کے لیے اب میں تمہارے ساتھ نہ خانے میں ہی رہوں گا۔ ہو سکتا ہے کچھ دیر بعد باس تمہیں کسی دوسرے اہم کام پر لگا دے۔“

”کون سا اہم کام۔“ بلوچ کی چونکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ باس نے کہا ہے کہ وہ تمہیں کھٹے دو کھٹے بعد کسی مہم پر بھیجنے کے لیے کال کرے گا۔“

”اچھا... فون جکھڑانی کو دو۔“ دوسری طرف سے کہا گیا۔

یقیناً جکھڑانی دوسرے آدمی کا نام تھا۔ نوازش نے موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جکھڑانی... تم بات کرو۔“

موجھوں والے شخص جکھڑانی نے موبائل لے کر کان سے لگایا۔ ”ہاں... کیا بات ہے بلوچ۔“

دوسری طرف کی بات سن کر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے۔ ماڈ کو بھیجتا ہوں۔“

اس نے موبائل آف کر کے ماڈ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ساگر کوہ خانے میں چھوڑ آؤ۔ موبائل بلوچ کو دیتے آنا۔“

”کیا اس کے پاس موبائل نہیں ہے؟“ نوازش سرسری انداز میں پوچھا۔

”ہے تو سہی۔ مگر اس کی بیٹری ختم ہو گئی ہے۔“ جکھڑانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آؤ...“ ماڈ نے ریوالور جیب میں رکھتے ہوئے نوازش سے کہا۔

نوازش اس کے ساتھ کمرے سے باہر آیا اور راہ داری میں ایک طرف بڑھنے لگا۔ ماڈ تیسرے کمرے کے دروازے پر رکا اور دروازہ کھول کر کمرے میں

داخل ہوا۔ اس کمرے کے بائیں گوشے میں ایک رکھی تھی جو خالی تھی۔ ماڈ میز کے قریب آیا اور میز کا ہالہ طرف سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔ میز کے ساتھ ہی قریب دیوار کا ایک حصہ بائیں جانب سرکتا چلا گیا۔ دیوار میں چار فٹ کشادہ اور چار فٹ بلند خلا پیدا ہو گیا۔

”آؤ...“ ماڈ میز چھوڑ کر خلا کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

اندر نیچے جانے کے لیے زینے بنے ہوئے تھے ماڈ زینے اترنے لگا۔ نوازش نے پہلے زینے پر نہ

رکھتے ہی جیب سے ریوالور نکالا اور پھر ایک دم نادرہ گردن کے گرد بازو لپیٹے ہوئے ریوالور کا دستہ اس

گدی پر رسید کر دیا۔ ماڈ کے حلق سے تیز کراہ خانہ ہوئی اور وہ زینے پر لڑکھڑایا لیکن نوازش نے اسے

گرنے نہ دیا۔ ماڈ اس کے بازو کی گرفت میں دھانچے ہوئے ہوش ہو چکا تھا۔ نیچے زینوں کے اختتام پر

کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ مگر دونوں تھے۔ نوازش نے ماڈ کو تیسرے زینے پر لٹایا اور مہم سے نکل کڑ لگا جس میں چھوٹا سا چاقو لگا ہوا تھا۔ اس

نے چاقو اس کے شانے میں پیوست کر دیا۔ ایک وار سے کافی سارا خون خارج ہو کر زینے پر گرنے لگا

تب نوازش اسے کھینچتے ہوئے واپس اوپر لایا اور خلا باہر میز کے پاس ڈال کر زینے اترنے لگا۔

نیچے پہنچ کر اس نے دروازوں کا جائزہ لیا۔ اگر دروازہ باہر سے بند تھا جب کہ دوسرا غیر مقفل تھا۔ بلوچ اسی کمرے میں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے ریوالور

ہاتھ میں لے کر اس دروازے پر دباؤ ڈالا اور دروازہ کھل گیا۔ اندر ایک دروازہ قامت اور قوی الجیش

صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر کھنی موٹھیں اچھوٹی سی داڑھی تھی۔ قریب ہی ایک اسٹین گن رکھی تھی۔ نوازش نے ایک دم اندر قدم رکھتے ہوئے اس

ریوالور تان لیا۔

ج نے اس کی طرف دیکھا اور تیزی سے اسٹین گن کی لہ ہاتھ بڑھایا۔ لیکن اسی لمحے گن اپنی جگہ سے بلند ہو

ہند قدم کے فاصلے پر جا پہنچی۔ بلوچ ایک دم گھبرا گیا۔

الٹ سمجھ گیا آسیر کی روح اندر آ چکی ہے۔

☆☆

ہالی داس نے کارگلی کے باہر روکی اور انجن بند کر

ا تر آیا۔ اس نے محتاط نگاہوں سے گلی میں جھانکا تو

گلی دیران تھی۔ وہ مطمئن ہو کر آگے بڑھا اور گلی میں اہل ہو گیا۔ چند لمحوں بعد وہ ایک ہنگامے کے گیٹ پر

گیٹ اندر سے بند تھا۔ اس نے ایک منتر پڑھ کر گیٹ پر پھونکا اور گیٹ خود بخود کھل گیا۔ وہ اندر آیا اور

گیٹ بند کر کے برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔ عمارت حانا طاری تھا۔ برآمدے اور راہ داری میں کوئی

فحش موجود نہ تھا۔ وہ راہ داری کے پہلے کمرے کے منہ پہنچا اور دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ لیکن سامنے

بازو دیکھ کر بے اختیار اچھل پڑا۔

مہم کے پاس فرش پر ایک آدمی منہ کے بل پڑا تھا اور اس کے پاس فرش پر تازہ خون پھیلا ہوا تھا۔ اس

جہلی سے بڑھ کر اس آدمی کو سیدھا کیا تو اسے ت کا جھٹکا لگا۔ وہ آدمی سرچکا تھا اس کی شرگ پر

اس کے گہرے نشانات تھے جن سے اب بھی خون رہا تھا۔ شرگ اس طرح سے کٹی پھٹی تھی جیسے کسی

بڑا ہار چانور نے چبا ڈالی ہو۔

اسے آدمی کی لاش دیکھ کر کالی داس گھبرا گیا۔ اس جہزی سے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر دروازے کی

لہ لہا۔ اس کمرے سے نکل کر وہ آخری کمرے کی لہ بڑھنے لگا۔ وہاں پہنچ کر اس نے بند دروازے

اصطلاح سے دباؤ ڈالا۔ دروازہ اندر سے لاک نہ تھا

لپے کھل گیا۔ اس نے اندر کا جائزہ لیا۔ اندر کوئی

نہا وہ کمرے میں داخل ہوا اور اس دیوار کی طرف گیا جس کے پاس میز رکھی تھی۔ قریب آ کر اس

نے میز ایک جانب کھینچی تو دیوار میں نہ خانے کا راستہ نمودار ہو گیا۔

وہ آگے بڑھا اور نہ خانے کے زینے اترنے لگا۔

لیکن تیسرے چوتھے زینے پر خون کی لکیر دیکھ کر بے اختیار اچھل پڑا۔ اس کے دل میں ایک اندیشے نے جنم

لیا۔ اس نے نیچے جھانکا۔ نہ خانے کے دونوں کمروں کے دروازے بند تھے۔ وہ تیزی سے زینے اتر کر نیچے

پہنچا اور پہلے کمرے کے دروازے پر لات رسید کر دی۔ دروازہ دھڑام سے کھل گیا۔ وہ اندر آیا تو سامنے

فرش پر ایک لاش دکھائی دی۔ وہ قریب آیا تو اس نے لاش کو پہچان لیا۔ وہ اس کا ماتحت بلوچ تھا۔ اس نے

ادھر ادھر دیکھا تو صوفے کے پیچھے بھی ایک لاش نظر آ گئی۔ یہ ماڈ کی لاش تھی۔

اپنے تینوں آدمیوں کی لاشیں دیکھ کر کالی داس بوکھلا گیا۔ وہ اس کمرے سے نکلا اور دوسرے کمرے کا

دروازہ کھول کر اندر آیا مگر سامنے بیڈ خالی دیکھ کر وہ غیظ و غضب سے دیوانہ ہو گیا۔ نادرہ بیڈ پر نہیں تھی۔ اسے

غائب پا کر سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آ گیا اور غصے کی شدت سے اس کی آنکھیں آگ برسائے لگیں۔ اسے

یقین تھا کہ آسیر وہاں آئی تھی اور اسی نے بلوچ اور اس کے دونوں ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ نہ

جانے اس نے حفاظتی کنڈل کو کیسے توڑا تھا۔ زینوں پر خون کس کا پھیلا ہوا تھا؟

آسیر نادرہ کو لے جانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اب اس کا وہاں رک کر وقت ضائع کرنا مناسب نہ تھا۔

چنانچہ وہ فوراً نہ خانے سے نکل آیا۔ ہنگامے سے باہر آ کر وہ سڑک کی طرف چل دیا۔ اس کے دل و دماغ میں

آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ گلی سے باہر آ کر وہ اپنی کار میں بیٹھا اور انجن اسٹارٹ کر کے چل پڑا۔ ساتھ ہی

اس نے جیب سے آئینہ نکالا اور منتر پڑھ کر اس پر پھونکا۔ آئینہ روشن ہو گیا اور اس میں چند ریکا کی



کھوپڑی کا عکس نظر آنے لگا۔

”کیا حکم ہے مہاراج؟“ کھوپڑی سے چند ریکا کی آواز خارج ہوئی۔

”چند ریکا... تم نے تو کہا تھا کہ بلوچ تہ خانے میں ہے؟“ کالی داس نے غصے سے کہا۔

”مہاراج... وہ تو اب بھی تہ خانے میں ہے۔“ چند ریکا کی کھوپڑی نے کہا۔

”لیکن وہاں تو اس کی لاش پڑی ہے کم بخت۔ نادرہ بھی عائب ہے۔“ وہ غرایا۔

”ہاں مہاراج۔ آپ نے صرف یہ پوچھا تھا کہ بلوچ تہ خانے میں ہے یا باہر۔ یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ ورنہ میں یہ بھی بتا دیتی۔“

”نادرہ اب آسیر کے قبضے میں ہے یا مر چکی ہے؟“ اس نے سوال کیا۔

”وہ زندہ ہے مہاراج اور آسیر کے گھر میں ہے۔“ چند ریکا نے جواب دیا۔

”آسیر کا گھر... یعنی گلشن اقبال میں جو اس نے آج ہی لیا ہے؟“ کالی داس چونکا۔

”جی ہاں... اسی بنگلے میں... لیکن میں اندر کا حال نہیں بتا سکتی کہ وہ بنگلے کے کس کمرے میں ہے۔“

”کیوں... کیا تم اندر ہی ہو گئی ہو چند ریکا۔“ وہ غصے سے بولا۔

”نہیں مہاراج۔“ چند ریکا کی آواز سنائی دی۔

”اصل میں آسیر نے نادرہ کی حفاظت کے لیے اس بار بنگلے کی عمارت کے گرد ایسا مضبوط حصار قائم کیا ہے کہ اس کے اندر جہاں تک کسی روح کے لیے ممکن نہیں ہے نہ ہی میں حصار توڑنے کی طاقت رکھتی ہوں۔“

”اوہ...“ کالی داس حیرت سے بولا۔ ”کیا میں خود بھی اندر نہیں جاسکتا۔“

”آسیر کی اجازت کے بغیر کوئی بھی اندر داخل نہیں ہو سکتا مہاراج۔ وہ خود اندر طلب کرے یا ساتھ لے

جائے تو حصار سے گزر سکتا ہے۔“

”کیا نوازش اور آسیر بھی اس وقت گھر میں ہیں؟ کالی داس نے طویل سانس لیتے ہوئے آخری سوال کیا۔

”جی ہاں۔ وہ اندر ہی ہیں۔ مجھے اندر کا حال مل نہیں ہے۔“ چند ریکا نے جواب دیا۔

کالی داس نے آئینے پر پھونک مار کر آئینہ جیب میں رکھا اور کار کی رفتار میں اضافہ کرتا چلا گیا۔

☆☆

نادرہ کو ہوش آ گیا تھا۔ اس وقت وہ آسیر اور نوازش کے بنگلے کے ایک کمرے میں بیڈ پر دراز تھی اور وہ دونوں اس کے قریب کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

نادرہ دونوں میں کافی کمزور ہو گئی تھی اس لیے آسیر نے گھر آتے ہی اس کے لیے بہت سی طاقت کی دوائیں منگوائیں تھیں نادرہ کی حالت کے پیش نظر نادرہ ایک پرائیویٹ کلینک سے ڈاکٹر کو لے آیا تھا جس نے نادرہ کا چیک اپ کرنے کے بعد اس کے لیے دوائیں تجویز کی تھیں اور یہ بھی بتایا تھا کہ اسے نادرل طریقے سے ہوش میں لانے کی کوشش میں اس کا دماغ متاثر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر سے طے کر لیا کہ

روزانہ صبح و شام کے وہاں آ کر نادرہ کو دیکھے گا۔

آج صبح نادرہ کو ہوش آیا تھا اور آسیر نے ڈاکٹر ہدایت کے مطابق اسے غذا کے طور پر سوپ بنا کر پلا

تھا جس سے اس میں کچھ توانائی آ گئی تھی اور وہ ہانگی کرنے لگی تھی۔ ایک گھنٹہ پہلے آسیر نے دلیا کھلا دیا اور اب وہ لوگ ڈاکٹر کا انتظار کر رہے تھے جسے گیارہ بجے آنا تھا۔ گیارہ بجتے والے تھے ڈاکٹر گیارہ بجے

پانچ منٹ پہنچا اور نادرہ کا معائنہ کرنے لگا۔

چند منٹ بعد وہ رخصت ہونے لگا تو نوازش اسے گیسٹ تک چھوڑنے چلا آیا۔ ڈاکٹر کی گاڑی باہر کھڑی

ہوئی تو نوازش نے فون کر کے اشتہار نوٹ کرادو۔ شام کوئی نہ کوئی عورت ضرور آ جائے گی۔“

نوازش نے فون کر کے اشتہار نوٹ کرادو۔ شام کوئی نہ کوئی عورت ضرور آ جائے گی۔“

نوازش نے فون کر کے اشتہار نوٹ کرادو۔ شام کوئی نہ کوئی عورت ضرور آ جائے گی۔“

نوازش نے فون کر کے اشتہار نوٹ کرادو۔ شام کوئی نہ کوئی عورت ضرور آ جائے گی۔“

گیت پر رک کر اس نے کہا۔

مریضہ کا دل کافی کمزور ہو چکا ہے۔ آپ اسے سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کریں۔ اگر آپ اس وقت نہ ہو تو کسی ایسی عورت کا انتظام کریں جو نوازش کرنے کے لیے ہنس مذاق کرے لطیفے سنائے

نوازش نے کہا۔“

نوازش نے کہا۔“

نوازش نے کہا۔“

نوازش نے کہا۔“

نوازش نے کہا۔“

نوازش نے کہا۔“

نوازش نے کہا۔“

نوازش نے کہا۔“

نوازش نے کہا۔“

نوازش نے کہا۔“

نوازش نے کہا۔“

نوازش نے کہا۔“

نوازش نے کہا۔“

نوازش نے کہا۔“

فون کی گھنٹی بجی۔ نوازش نے پیالی میز پر رکھ کر فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

”ہیلو... کون...؟“ اس نے پوچھا۔

”نوازش صاحب سے بات کرنی ہے۔“ کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

”میں بول رہا ہوں۔ فرمائیے۔“ اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

”روزنامہ پیپلز میں آپ کی طرف سے ایک اشتہار شائع ہوا ہے۔“ آواز آئی۔ ”میرا نام روہی ہے اور میں اپنی خدمات پیش کرنا چاہتی ہوں۔“

”رائٹ... آپ اس وقت آ سکتی ہیں؟“ نوازش نے پوچھا۔

”جی ہاں... لیکن اشتہار میں آپ کے ایڈریس کے بجائے صرف فون نمبر لکھا ہے۔ ایڈریس بتادیں۔ میں تھوڑی دیر میں پہنچ جاؤں گی۔“

نوازش نے اسے گھر کا پتا سمجھایا اور فون بند کر دیا۔

پھر آسیر کو روہی کے بارے میں بتایا۔

”چلو اچھا ہوا آج ہی انتظام ہو گیا۔ اب ہم آزادی سے باہر جا کر اپنے دشمنوں سے نبٹ سکیں گے۔ ہماری غیر موجودگی میں نادرہ تنہا نہیں رہے گی۔“

”پھر بھی حفاظتی اقدامات تو کرنا ہی ہوں گے۔“ نوازش بولا۔ ”ایسا نہ ہو کہ...“

”بے فکر رہو۔ میں نے عمارت کے گرد حفاظتی حصار قائم کر دیا ہے۔ اب کوئی روح اس میں داخل نہ ہو سکے گی میری اجازت کے بغیر۔“ آسیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یا پھر جسے ہم میں سے کوئی اپنے ساتھ اندر لائے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ ہم کسی روح کو اندر کیوں لائیں گے؟“ نوازش نے چونکتے ہوئے کہا۔

”بھئی۔ صرف روح نہیں۔ ہر قسم کی مادی مخلوق۔“ وہ تیزی سے بولی۔ ”مثلاً میں کسی کو تمہاری مگرانی کے لیے مقرر کرتی ہوں جو تمہارے ساتھ ہر وقت موجود رہے یا



تمہارے حکم پر باہر آئے جائے۔“

یہ وضاحت سن کر نوازش مسکرا دیا۔ ”نہیں۔۔۔ میرے لیے تم کسی کو مقرر مت کرنا۔ ورنہ میں آزادی سے نقل و حرکت نہیں کر سکوں گا۔ ہر وقت ذہن پر یہ احساس طاری رہے گا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے یا میرے ساتھ چل رہا ہے۔“

”ارے۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہیں طاقت ور بنانے کے لیے مجھے ایک جاپ کرنا ہوگا۔“ آسیہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔ کہا تو تھا۔“ نوازش نے سر ہلایا۔ ”پھر۔۔۔ کیا پروگرام ہے۔“ آسیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نادرہ کے لیے عورت کا انتظام ہوتے ہی ہم چل پڑیں گے۔“

”کیا آج ہی۔۔۔ میں تیاری کر لوں؟“ نوازش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ ذرا صبر کرو ڈیڑھ۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”آج کی رات آرام کرو۔ ذرا اس عورت کی کارکردگی تو دیکھ لیں۔ کیا پتا وہ کیسی نکلے۔“

نوازش مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہاں۔۔۔ ہو سکتا ہے کل کسی دوسرے امیدوار کا انتخاب کرنا پڑ جائے۔“ وہ خاموش ہوا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسورٹ اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک عورت بول رہی تھی۔ وہ بھی اشتہار کے حوالے سے جاب کی خواہش مند تھی۔ نوازش نے آسیہ کو بتایا اور آسیہ نے کہا کہ پہلے روٹی کو فرائی کر لیں اسے کل تک کے لیے ٹال دو۔“

”ٹھیک ہے محترمہ۔۔۔ اب تو رات ہونے والی ہے۔“ نوازش نے فون پر کہا۔ ”آپ کل صبح فون کریں آپ کو ایڈریس اور انٹرویو کا وقت بتا دیا جائے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اس کے دس منٹ بعد چوکی دار نے اندر آ کر روٹی کی آمد کی اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے اسے بھیج دو۔“ نوازش نے چوکی دار سے کہا۔

چوکی دار واپس چلا گیا۔ آسیہ بولی۔ ”تم خود جا کر اسے لے آؤ۔ ورنہ وہ کسی دوسرے کمرے میں چل جائے گی یا پھر باہر ہی رکی رہے گی۔“ نوازش نے سر ہلایا اور اٹھ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔

☆☆

روٹی بائیس سال کی نوجوان لڑکی تھی۔ انٹر پاس کرنے کے بعد وہ اسٹیج ڈراموں میں مزاحیہ کردار ادا کرتی رہی۔ پھر دو سال پہلے شادی ہونے پر اداکاری چھوڑ دی۔ لیکن چند ماہ پہلے شوہر کا حادثے میں انتقال ہونے کے بعد سے بیوگی کے دن گزار رہی تھی۔ اس نے دوبارہ ڈراموں میں کام حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن دو سال کی غیر حاضری کے سبب اس کی ڈیمانڈ ختم ہو چکی تھی۔ اس نے بات چیت کے دوران آسیہ اور نوازش کو بار بار مسکراتے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے روٹی کو منتخب کر کے اسے اس کے کام سے آگاہ کیا۔ چھ ہزار روپے تنخواہ پر روٹی نے آمادگی ظاہر کر دی۔ آسیہ نے کہا۔ ”تمہیں نادرہ کے پاس دن رات رہنا ہوگا۔ البتہ جس وقت ہم گھر پر ہوں گے تم اپنے گھر چلے گئے گزرا آ کرنا۔ باقی تمہاری ضروریات کی ہر شے تمہیں یہاں مل جائے گی۔“

”بہتر۔۔۔ میں کل سے آؤں گی۔“ روٹی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہم چاہتے ہیں تم آج ہی یہاں رہنے لگو۔“ آسیہ بولی۔

”سواری۔۔۔ میں گھر والوں کو صرف یہ بتا کر آئی تھی کہ انٹرویو دے کر واپس آ جاؤں گی۔“ روٹی نے معذرت کی۔

”ٹھیک ہے۔ میں صبح دس بجے تک تمہارا انتظار کروں گی۔ اگر تم نہ آنا چاہو یا تمہارے والدین نہ مانیں تو فون پر اطلاع ضرور دے دیتا۔“

ہے میں گھر والوں سے اجازت لے کر ابھی جاؤں۔“ روٹی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ابھی بات ہے۔“ نوازش بولا۔ ”تم بے شک ٹھیک آنا چاہو تو آ جاؤ۔ تمہارے آنے کے بعد ہم میں گے۔“

”ابھی گئی۔ انہوں نے نو بجے تک اس کا انتظار ہر دونوں نے نادرہ کی خیریت دریافت کی اور

کہہ کر وہ کھانا کھانے باہر جا رہے ہیں گھنٹے بعد آ گئے۔ وہ دونوں گیٹ پر پہنچے ہی تھے کہ اس کے پاس چھوٹا سا سوٹ کیس تھا۔ گویا اس کے لیے اپنا سامان لے آئی تھی۔ نوازش نے کہہ کر کار گیٹ کے پاس روٹی کو آسیہ نے کہا۔

”اسے نادرہ کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔ اچھا ہوا۔“

”ارے آنے تک نادرہ تنہا نہیں رہے گی۔“

”فل کار سے اتر اور روٹی کو نادرہ کے کمرے میں گرہاں آ گیا۔ گھر سے نکل کر وہ حسن اسکوائر

ہاں نوازش نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کار اور دونوں اتر کر ریسٹورنٹ میں آ بیٹھے۔ ویٹر کے ہاں نوازش نے کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانے کے رٹش نے چائے طلب کر لی۔

پ جب کہ نادرہ کا مسئلہ ختم ہو چکا ہے ہمیں اس بیٹے کی خبر لینی چاہیے۔“ نوازش نے چائے کے آسیہ سے کہا۔

”ہاں۔۔۔ میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ آسیہ

”لیکن اس کا ٹھکانا جب تک پوشیدہ ہے ہم کچھ

سکتے۔“

”گر ہم کالی داس پر قابو پالیں تو اس پر تشدد کر کے

سے کرشن کا ٹھکانا معلوم کر سکتے ہیں۔“

اس کے لیے طاقت کی ضرورت ہے ڈیڑھ۔“ آسیہ

مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ میں تنہا ہوں اور کالی

کے ساتھ شام کمار بھی ہے۔ اسی لیے تو میں نے

سوچا ہے کہ کالی روٹی سے کچھ اور ہمتی بھی حاصل کروں۔“

اور تمہیں بھی ماورائی تو تین خنٹل کر دوں۔ اس کے بغیر۔“

کالیابی مشکل ہے۔“

”شیام کمار کو ختم کر دیا جائے تو کالی داس تنہا رہ

جائے گا۔“ نوازش نے کہا۔ ”اس کے بارے میں

معلوم کر دو میں آج ہی اس کی گردن ٹاپتا ہوں۔“

کھانا کھانے اور چائے پینے میں ایک گھنٹہ گزر گیا

اور وہ اٹھ گئے۔ نوازش نے کاؤنٹر پر بل ادا کیا اور

دونوں باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ گئے۔

”اب کہاں چلیں؟“ نوازش نے کار اشارت کرتے

ہوئے آسیہ سے پوچھا جو عقیب نشست پر بیٹھی تھی۔

”ایک منٹ ٹھہرو۔۔۔ میں ذرا رادھا سے بات

کر لوں۔“ آسیہ نے کہا۔

پھر اس نے رادھا کی روح کو طلب کیا اور اس سے شام

کمار کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ رادھا نے جواب میں

جو کچھ بتایا اسے سن کر نوازش بے تاب ہو گیا۔

☆☆

تاج محل ہوٹل کے ایک کمرے میں شام کمار بیٹھا

شراب کے ہلکے ہلکے گھونٹ لیتے ہوئے کچھ سوچ رہا

تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے جیب سے سو روپے کا ایک

نوٹ نکالا اور نوٹ کو اپنے سامنے میز پر سیدھا رکھ کر

منہ ہی منہ میں کوئی عمل پڑھنے لگا۔ نصف منٹ بعد اس

نے نوٹ پر پھونک ماری۔ دوسرے ہی لمحے ہونٹ پر

موجود تصویر حرکت کرنے لگی۔ تصویر کی شکل تبدیل

ہوتی جا رہی تھی۔ آن کی آن میں تصویر کا چہرہ انتہائی

بھیاںک ہو گیا۔

”کیا حکم ہے مہاراج۔“ دفعتاً تصویر سے آواز

اُبھری۔

”اجماعدا۔“ شام کمار نے تھکسانہ لہجے میں کہا۔

”مادھوری اس وقت کہاں اور کیا کر رہی ہے؟“

”مادھوری۔۔۔ وہ ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہی



ہے۔ یہ ریٹورنٹ حسن اسکوٹر پر واقع ہے۔“ تصویر والے بھیا نک چہرے نے جواب دیا۔  
 ”کیا وہ تھا ہے؟“ اس نے چوکتے ہوئے پوچھا۔  
 ”نہیں مہاراج.... تو ازش بھی اس کے ہمراہ ہے۔“ انجمنہ اندانے کہا۔  
 ”کھانے کے بعد وہ کہاں جائیں گے؟“ شام کمار نے پوچھا۔  
 ”نی الحال تو مادھوری کا ارادہ گھر جانے کا ہے۔“ انجمنہ اندانے بتایا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ اس کا تعاقب کرو۔ جب وہ گھر پہنچ جائے تو مجھے مطلع کرنا۔ گھر کے بجائے کسی دوسری طرف جائے تب بھی اس کے پیچھے لگے رہنا۔“ اس کے خاموش ہونے پر انجمنہ اندا کی تصویر نوٹ سے غائب ہوگئی اور اس کی جگہ پھر وہی پہلی تصویر نظر آنے لگی۔ شام کمار نے نوٹ میز پر ہی رہنے دیا اور قریب پڑے فون کا ریسیور اٹھا کر روم سروس کو داسکی کی ایک بوتل بھیجنے کی ہدایت کرنے کے بعد ریسیور رکھ دیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور بلند آواز سے کہا۔ ”آ جاؤ۔“  
 حسب توقع دروازہ کھول کر اندر آنے والا دیڑھی تھا۔ جو اس کے لیے داسکی لایا تھا۔ وہ بوتل میز پر رکھ کر جانے لگا تو شام کمار نے اسے روک لیا۔  
 ”سنو.... دل بہلانے کے لیے کوئی پارٹنر مل جائے گا؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”لیس سر۔“ ویٹر نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔  
 ”ٹھیک ہے۔ ایک گھنٹے بعد اسے لے آنا۔“ شام کمار نے آنکھ دبائی۔ ”نال ٹاسٹ ہونا چاہئے۔ فیس کی پروامت کرنا۔ تمہیں بھی اس کے برابر ملے گا۔“ یہ سن کر ویٹر کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ بولا۔ ”آپ فکر مت کریں سر۔ پندرہ سے اٹھارہ برس کا

پارٹنر دستیاب ہے۔ آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔ پلیٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ چند لمحوں بعد سہا کی طرف دیکھ کر اسے کوئی خیال آیا اور اس نے ہاتھ اٹھالیا۔ نمبر ملا کردہ انتظار کرنے لگا۔  
 ”ہیلو ڈگر بول رہا ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیا کر رہے ہو؟“  
 ”تم کیا کر رہے ہو؟“ کالی داس کی ناگوار سی آئی۔  
 ”میں.... میں کباب کا انتظار کر رہا ہوں۔“ اکیلی شراب مزہ نہیں دیتی۔  
 ”بس.... یہی شراب اور کباب ہی کھاتے رہنا ایکشن مت لیتا۔“ کالی داس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔  
 ”ایکشن لے تو رہا ہوں یار۔ میرا غلام مادھو تعاقب کر رہا ہے۔ اس کی اطلاع ملنے پر فل لوں گا۔“  
 ”مادھوری کا تعاقب.... وہ کہاں جا رہی کالی داس نے چونکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔  
 ”شاید گھر جائے گی۔ بہر حال ابھی اطلاع والا ہے انجمنہ اندا۔“ شام کمار بولا۔  
 ”انجمنہ اندا کون ہے؟“ کالی داس نے خیرت سوال کیا۔  
 ”میرا نیا مخبر.... جو بالکل صحیح خبر دیتا ہے۔“ مسکرایا۔  
 ”اچھا.... جب وہ اطلاع دے تو مجھے بتانا۔“ معروف ہوں۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ میں بتا دوں گا فون پر۔“ شام نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”سنو.... تمہارے بیٹے کا کیا حال ہے؟“  
 ”مادھو کی ٹرس تھی تارخیر۔“ کالی داس کی ہنسی ن آواز آئی۔  
 ”ہاں.... ہاں.... کیا بھاگ گئی تمہاری قید سے

ہٹا۔“  
 ”یار.... ہے تو وہ ابھی میری قید ہے۔ لیکن اس لوطے نے اس سے عشق شروع کر دیا ہے۔“  
 ”پھر تو وہ مرے میں ہے۔“ شام کمار ہنستے ہوئے لگا۔ ”اس میں اس کا تصور نہیں ہے۔ تم جیسے ایسا ہی ہونا چاہیے۔“  
 ”اس مت کرو۔ ابھی وہ اس قائل نہیں ہے کہ مجھے کد فریب کو سمجھ سکے۔“  
 ”تمہارا ہے۔ تم نے رضیہ اور کرشن کو اکٹھے کیوں کر جو خیر سے حوالے کر دیتے تو کیا حرج تھا۔“  
 ”اس لیے ان کو اکٹھے رکھا کہ کرشن مسلسل تنہائی کی طور پر اپ سیٹ نہ ہو جائے۔“  
 ”وہ رضیہ کے ساتھ سیٹ ہو گیا۔“ شام کمار نے تم اسے اپنے جیسا بنانا چاہتے تھے اس لیے۔  
 ”وہ کی حرکتوں پر کیوں کڑھتے ہو یار۔“  
 ”اصل میں تو ازش اور مادھوری سے مقابلے کے کی طاقت قائم رکھنا چاہتا ہوں۔“ کالی داس نے ہراسے ایسی جگہ لے جاؤ جہاں اسے کوئی لڑکی نہ ملے۔“ شام کمار بولا۔ ”کسی جزیرے پر اسے اپنی سے قریب سمندر میں کئی ایسے چھوٹے جزیرے ہیں۔ وہاں وہ دشمنوں سے بھی محفوظ رہے گا۔“  
 ”صحت خوب.... تم نے ابھی تجویز دی ہے شام میں جلد ہی اس پر عمل کروں گا۔ ادا کے۔“ کالی نے کہا۔  
 ”نہ بند کر دیا۔ شام کمار نے بھی موبائل آف کر کے میں رکھ لیا۔ اس لمحے میز پر دیکھ نوٹ سے آواز اس نے چونک کر نوٹ کی طرف دیکھا تو نوٹ پر کی تصویر حرکت کر رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا۔  
 ”مہاراج.... مادھوری اپنے گھر میں داخل ہوگئی

ہے۔“  
 ”یہ سن کر شام کمار نے نوٹ پر پھمک ماری اور نوٹ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ بے تابی سے دیڑھا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سمجھ گیا ویٹر آیا ہوگا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آ جاؤ ویٹر....“  
 ”دروازہ کھلا اور ایک ویٹر اندر آ گیا۔ وہ تنہا ہی تھا لیکن یہ وہ نہیں تھا جسے اس نے لڑکی لانے کو کہا تھا۔  
 ”سر.... مجھے پہلے ویٹر نے بھیجا ہے۔“ اس ویٹر نے آہستہ سے کہا۔  
 ”اوہ....“ شام کمار چونکا۔ ”مگر وہ کیوں نہیں آیا۔ میں نے اسے ایک آرڈر دیا تھا۔“  
 ”اس کی ڈیوٹی کا ٹائم ختم ہو گیا تھا چنانچہ وہ مجھے آپ کا آرڈر بتا کر چلا گیا۔“ ویٹر بولا۔  
 ”تو پھر تم یوں ہی منشا تھا کر کیوں آ گئے۔ آرڈر پورا کر کے آتے۔“ شام کمار نے منہ بتایا۔  
 ”اصل میں آپ کے آرڈر کی تعمیل سے پہلے آپ کی پسند معلوم کرنے آیا ہوں۔“ ویٹر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں چند لڑکیوں کی تصویریں لایا ہوں۔ آپ دیکھ کر پسند کر لیں کہ کسے پیش کروں۔“  
 ”اس نے شام کمار کے پہلو میں آ کر جیب میں ہاتھ ڈالا جیسے تصویریں نکال رہا ہو۔ لیکن اس کا ہاتھ جیب سے باہر آیا تو اس میں ریو اور چمک رہا تھا۔ شام کمار ریو اور دیکھ کر بے اختیار اچھل پڑا۔ لیکن ویٹر نے فوراً ہی ریو اور کی نال اس کی گتھی سے لگا دی۔  
 ”خبردار.... حرکت مت کرنا.... ورنہ فائر کر دوں گا۔“ ویٹر غرایا۔  
 ”یار اس کی آواز بدلی ہوئی تھی اور شام کمار اس آواز کو پہچان کر اپنی جگہ تھری طرح ساکت ہوتا چلا گیا۔  
 ☆☆  
 ”نواز شرلوچر ہے کے پاس ڈراپ کر کے آسیہ نے



کار موڈی اور گھر کی طرف چل دی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر نوازش اپنی مہم میں ناکام رہا تو اسے خود جانا پڑے گا۔ لیکن پہلے گھر کا چکر لگانا ضروری تھا کہ نادرہ پریشان نہ ہو۔ ڈاکٹر نے ہدایت کی تھی کہ اسے پریشانی سے بچایا جائے تاکہ اس کا دماغ نارمل رہے۔ ہنگامے کے گیٹ پر اس نے کار روک کر ہارن دیا۔ چند لمحوں بعد چوکیدار نے گیٹ کھولا اور وہ کار اندر لے آئی۔ برآمدے کے سامنے کار روک کر وہ اتری اور برآمدے میں داخل ہو گئی۔ چند لمحوں بعد وہ نادرہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔

نادرہ بیڈ پر موجود نہیں تھی۔ روپی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ دونوں کہاں چلی گئیں۔ وہ انہیں دیکھنے کے لیے ڈرائنگ روم میں آئی لیکن وہ دونوں وہاں بھی نہیں تھیں۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے برآمدے میں آ کر چوکیدار کو بلایا۔

”بابا.... نادرہ اور دوسری لڑکی باہر تو نہیں گئیں؟“ اس کے قریب آنے پر آسیہ نے سوال کیا۔

”جی ہاں.... نادرہ بی بی پر دورہ پڑا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ دوسری لڑکی اسے ٹیکسی میں ڈال کر ڈاکٹر کے پاس لے گئی ہے۔“ چوکیدار نے بتایا۔

”اوہ....“ آسیہ نے حیرت سے کہا۔ ”وہ بے ہوش تھی تو اسے ٹیکسی میں کسی نے ڈالا؟“

”میں نے ان کی مدد کی تھی۔ ٹیکسی برآمدے کے پاس لائی گئی تھی۔“

”اچھا.... روپی نے کچھ بتایا کہ کون سے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہی ہے؟“

”اسی کے پاس لے گئی ہے جو آج صبح یہاں آیا تھا۔“ چوکیدار بولا۔ ”ڈاکٹر جمال۔“

”ٹھیک ہے۔“ آسیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”میں فون پر معلوم کرتی ہوں۔“

وہ پلٹ کر اندر کو چل دی۔ ڈرائنگ روم میں آ کر اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا

جمال کے کلینک فون کرنے لگی۔

”ہیلو۔ ڈاکٹر جمال بول رہا ہوں۔“ سلسلہ آواز آئی۔

”میں آسیہ بول رہی ہوں ڈاکٹر.... اب طبیعت کیسی ہے؟“ آسیہ نے پوچھا۔

”یہ تو آپ بتائیے آسیہ صاحبہ۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں یہاں بیٹھے بیٹھے سرخس کی کیفیت سکتا ہوں۔“

”میں سمجھی نہیں ڈاکٹر۔“ وہ چوکی۔ ”کیا نادرہ نے ٹریٹمنٹ نہیں دیا۔ وہ آپ کے پاس ہے؟“

”کیا؟“ ڈاکٹر کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”نہر یہاں تو نہیں آئی۔“

”اوہ....؟“ آسیہ حیرت سے اچھل پڑی۔

”جی ہاں.... وہ یہاں آتی تو مجھے ضرور خبر ہو سکتا ہے اسے کسی دوسرے کلینک لے جایا گیا۔“ خیر.... دیکھتی ہوں.... آپ کو خواہ مخواہ دی۔“ آسیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے فون کا ریسیور رکھا اور سوچنے لگی کہ نادرہ کو کس ڈاکٹر کے پاس لے گئی ہوگی۔ اگر چوکیدار سے ڈاکٹر جمال کا نام کیوں لیا جب کہ کئی ہی نہیں؟ شاید راستے میں کوئی اور کلینک دیکھ میں گئی ہو۔“

وہ کچھ دیر سوچتی رہی کہ نادرہ کی طبیعت تو اب اتنی پھر اسے کس قسم کا دورہ پڑا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ رادھا کی روح معلوم کیا جاسکتا ہے کہ وہ دونوں کس کلینک میں لیکن اس سے پہلے کہ وہ رادھا کو طلب کرتی ہو کھنٹی بجنے لگی۔

”اس نے جلدی سے ریسیور اٹھا لیا۔ دہلی بول رہی ہوں۔“ دوسری طرف سے روپی کی بھری۔

”.... روپی؟“ آسیہ نے گہرا سانس لیا۔ ”نادرہ کو کیا ہے؟“

”جی ہاں۔“ روپی نے جواب دیا۔

”میں اسے ڈاکٹر جمال کے پاس کیوں نہیں لے جاؤں۔ میں نے ابھی وہاں فون کر کے معلوم کیا تو اس نے کہا کہ تم دونوں وہاں نہیں ہو۔“

”مائل راستے میں ایک کلینک کھلا نظر آیا تو وہیں لے گیا۔ میں نے اسی لیے فون کیا ہے کہ آپ پریشان نہ ہو۔ میں اور نادرہ آج رات یہیں رہیں گے۔“

نادرہ کو ایڈمٹ کر لیا ہے تاکہ رات کو پھر دورہ نہ آجائے۔“ روپی بولی۔ ”آپ کو اعتراض تو نہیں؟“

”میں نے اچھا کیا۔“ آسیہ نے اطمینان کا لہجہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں آ رہی ہوں۔ کلینک کا پتا پتا ہے۔“

”آپ کا آنا ضروری نہیں ہے۔ میں جو ہوں۔“

”کیا آپ کو شبہ ہے کہ میں اس کی اچھی ل نہیں کروں گی۔“

”جی ہاں.... مجھے تم پر اعتماد ہے۔“ آسیہ نے اسے ہونے کے لیے کہا۔ ”اسی لیے تو تمہیں اس کے پاس میں چھوڑ گئی تھی۔ مگر وہاں نادرہ محفوظ نہیں۔ اس کا نمن اسے نقل کرنا چاہتا ہے اور....؟“

”پ بے فکر رہیں۔ میں اس کی بہترین حفاظت کروں گی۔“

”میں اسے واپس گھر لے آؤں گی۔“

”اچھا.... کلینک کا نام دہتا تو بتا دو۔“ آسیہ نے کہا۔

”دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس ریسیور رکھا اور سوچنے لگی کہ روپی نے کلینک کا پتا سے کیوں کر پز کیا؟ پھر وہ اس کی حفاظت کا دعو

س بنیاد پر کر رہی ہے؟ کیا اس کے پاس کوئی ہتھیار ہے؟ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟ اس شبہ کی تصدیق کے لیے اس نے فوراً ہی رادھا کی روح کو طلب کر لیا۔

”رادھا.... روپی اور نادرہ کس کلینک میں ہیں۔ بتاؤ۔“

”وہ کسی کلینک میں نہیں ہیں شہزادی۔“ رادھا کی روح بولی۔

”اوہ.... پھر کہاں ہیں؟“ آسیہ بے اختیار چوکی۔

”معلوم نہیں.... البتہ وہ جگہ کلشن حدید میں واقع ہے۔“ رادھا نے جواب دیا۔

”کیا مطلب.... روپی اسے وہاں کیوں لے گئی؟“ آسیہ حیرت سے بولی۔

”روپی نہیں اسے کالی داس لے گیا تھا۔“ رادھا نے بتایا۔

”آسیہ بے اختیار اچھل پڑی۔“ اوہ.... کالی داس.... مگر روپی نے ابھی فون پر بات کی ہے مجھ سے۔“

”روپی نہیں شہزادی۔ وہ کالی داس تھا جو آواز بدل کر بول رہا تھا۔ وہ روپی بنا ہوا تھا۔“

”یہ سن کر آسیہ کے ہاتھوں کے ٹوٹے اڑ گئے۔ اسے اپنی غلطی کا ایک دم احساس ہو گیا۔ کالی داس حصار کی وجہ سے اکیلا ہنگامے میں نہیں آ سکتا تھا۔ دونوں بار وہ نوازش کے ہمراہ اندر آیا تھا اسی لیے حصار میں داخل ہونے پر اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ یقیناً اسے اخبار میں نوازش کی طرف سے دیے گئے اشتہار کا پتا چل گیا تھا اور جب روپی انٹرویو کے بعد واپس گئی تو اس کا جسم اپنا کروہ دوبارہ آیا تھا۔ مگر کیسے؟ وہ ایک بار پھر رادھا کی روح کو طلب کرنے لگی۔

☆ ☆

ویٹر کو پہچان کر چند لمحوں تک شام کمار کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی اور وہ ساکت بیٹھا رہا۔ اس کے دماغ میں آنندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اسے قطعاً امید نہ تھی



ویٹر کے حلیے میں اندر آنے والا شخص نوازش ہو سکتا ہے  
ورنہ پہلے ہی اسے غور سے دیکھ لیتا۔ چند لمحوں بعد اس  
نے اپنی جگہ پر پہلو بد کرنے کی کوشش کی۔

”سنا نہیں تم نے.....“ ویٹر غرایا جو نوازش ہی تھا۔  
”تم..... تم یہاں کیسے پہنچے نوازش.....؟“ شیاام کمار  
نے ہونٹ ہنچتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب ہے تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں نے ویٹر  
کو کسی چیز کا راز ڈر دے رکھا ہے۔“ وہ تیزی سے بولا۔  
”بڑی آسانی سے۔“ نوازش مسکرایا۔ ”ویٹر مجھے

زمینوں پر مل گیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کراٹھ  
اکتیس کہاں ہے تو وہ بولا کہ میں اسی کمرے میں جا رہا  
ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ اس میں میرا دوست ٹھہرا

ہوا ہے اور میں اس کی دعوت پر آیا ہوں تو ویٹر نے بتایا  
کہ تم نے لڑکی طلب کی ہے۔ پھر میں نے اسے سوکا  
ایک نوٹ دکھا کر مزید پوچھ کچھ کی اور اوپر آ کر اسے

بے ہوش کرنے کے بعد ہاتھ روم میں لے گیا جہاں  
میں نے اس کی یونیفارم اتار کر پہنی اور مصنوعی مونچھیں  
لگا لیں تاکہ تم فوری طور پر مجھے نہ پہچان سکو۔“

”ہوں۔ یہاں کیوں آئے ہو اکیلے؟“ شیاام کمار  
نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔  
”اکیلا نہیں آئیہ بھی آئی ہے میرے ساتھ۔“

نوازش نے بتایا۔  
”جھوٹ مت بولو۔ مجھے ابھی ابھی میرے غلام نے  
بتایا ہے کہ آئیہ گھر پہنچ چکی ہے۔“ شیاام کمار غرایا۔

”میرے بارے میں تمہارے غلام نے نہیں بتایا کہ  
میں کہاں ہوں؟“  
”نہیں..... میرے نزدیک تمہاری کوئی ویلیو نہیں

ہے۔“ شیاام کمار نے ناگواری سے کہا۔ ”اس لیے میں  
نے اس سے صرف آئیہ کے بارے میں پوچھا تھا۔“  
”بس..... یہی تمہاری غلطی تھیں لے ڈوبی اور میں

تمہارا قصہ تمام کرنے آ گیا۔“ نوازش ہنسا۔

”اوہ..... کیا تمہیں یقین ہے کہ تم مجھے ختم کر  
گے؟“ شیاام کمار نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔  
”کیوں نہیں۔“ نوازش اس کی پشت کی طرف آ

ہوئے بولا۔ ”تم نے میری بیوی کے ساتھ کرل  
روپ میں جو زیادتی کی ہے اور میرا چھاؤنی میں ا  
فوجیوں کے سامنے جس طرح بے عزت کیا ہے لگا

اس کا انتقام لینے آیا ہوں۔ مگر یہاں نہیں؟“  
”پھر..... کہاں؟“ شیاام کمار چونکا۔ ”کسی دوسری ج  
لے جاؤ گے مجھے؟“

”ہاں.....“ نوازش نے مختصر جواب دیا۔  
اس کے ساتھ ہی اس نے پھرتی سے ریوالور کا  
اس کے سر پر رسید کرتے ہوئے دوسرا ہاتھ اس کے

پر رکھ کر دبایا۔ نتیجے میں شیاام کمار کے منہ سے نکلنے  
کرب ناک سی کراہ نوازش کے ہاتھ کے نیچے دب  
اور شیاام کمار کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ وہ

ہوش ہو چکا تھا۔ لیکن نوازش نے اپنی تسلی کے لیے  
بار پھر اس کے سر پر ضرب رسید کی۔ پھر اسے صولے  
لٹا دیا۔ فارغ ہو کر اس نے دروازہ بند کیا اور جیب

اپنا موبائل نکال کر آئیہ کو فون کرنے لگا۔  
”ویلو.....“ سلسلہ ملنے پر آئیہ کی آواز سنائی دی۔  
”نوازش بول رہا ہوں ڈارلنگ۔“ اس

مسکراتے ہوئے کہا۔  
”اوہ..... کہاں سے؟“ آئیہ نے پوچھا۔  
”منہ سے..... اور کہاں سے بول سکتا ہوں۔“ ا

کے لہجے میں شوخی تھی۔ ”لگتا ہے تمہارا ذہن حاضر  
ہے۔ ورنہ میں تمہیں بتا کر تو حسن اسکوائر پر تم سے  
ہوا تھا۔“

”سوری..... واقعی میرا ذہن حاضر نہیں ہے۔  
تاکہ راتے میرا داغ اپ سیٹ کر کے رکھ دیا ہے۔“  
”اوہ..... کس کی بات کر رہی ہو؟“ نوازش چونکا۔

”کالی داس کی..... وہ ایک بار پھر کامیاب ہو گا

آواز سنائی دی۔  
”مطلب؟“ میں سمجھا نہیں آئیہ۔“ اس نے  
سے پوچھا۔

”اوہ کو اغوا کرنے میں۔“ آئیہ نے غصیلے لہجے  
۔  
”اوہ..... کب..... کیسے.....؟“ نوازش بے اختیار

”ا۔“  
”فیئر موجودگی میں..... جب ہم حسن اسکوائر  
لٹا رہے تھے تو وہ نادرہ کو بے ہوش کر کے لے

”ا۔“ نوازش کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”مگر  
کے پاس روپی بھی تو موجود تھی۔“  
”ا۔ اور روپی کے جسم میں کالی داس تھا۔“ آئیہ

جادو تفصیل سے ساری بات بتادی۔  
حیرت ہے..... کیا حصار کے باوجود؟“ نوازش  
ہمنا چاہا۔

”ا۔“ آئیہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔  
”کہ چلتے وقت جب وہ روپی بن کر آیا تو تم اسے  
لے پاس چھوڑنے لے گئے۔ تمہاری وجہ سے وہ

موت رہا۔ تمہارا اندر جاتا تو حصار توڑے بغیر کبھی  
سے میں داخل نہ ہو سکتا۔“  
”تم نے بری خبر سنائی ڈارلنگ۔“ نوازش ہلکا کر

حیرت ہے کہ انٹرویو کے وقت تم اسے نہ پہچان  
۔  
”وقت اصل روپی آئی تھی۔ جب وہ گمر والوں

ہاڑت لے کر دوبارہ ہمارے پاس آئی تو کالی  
ہلکے کے پاس اسی وقت پہنچا تھا۔ اس نے روپی کو  
سے اترتے دیکھا تو فوراً چندریکا کی روح سے

بارے میں معلومات حاصل کیں کہ کہیں روپی  
میں میں تو نہیں ہوں۔ پھر اس نے روپی پر منتر  
کر اسے بے ہوش کیا اور وہ گیٹ سے دو قدم

گرا

پیچھے ہی گر گئی۔ تب اس نے روپی کو اپنی کار میں ڈال کر  
اس کا گلا دبایا اور اس کے مرنے پر اس کے جسم میں  
حلول کر کے گیٹ پر آ گیا۔“

نوازش کو نادرہ کے ہاتھ سے نکل جانے پر افسوس ہوا۔  
اس نے پوچھا۔ ”کیا اس کے ٹھکانے کا پتا چلا ہے؟“  
”نہیں..... مگر تم سناؤ۔ تمہارے مشن کا کیا رہا؟“

آئیہ نے سوال کیا۔  
”کامیابی۔“ نوازش نے جواب دیا۔ پھر تفصیل  
بتائی۔ ”اب وہ بے ہوش پڑا ہے۔ کیا اس حالت میں

اس کی روح کو فنا کیا جاسکتا ہے؟“  
”نہیں..... اسے جلانے بغیر اس کی روح کو ختم نہیں  
کیا جاسکتا۔“ آئیہ بولی۔ ”تم اسے یہاں لے آؤ۔

ہو سکتا ہے وہ کالی داس کے اس ٹھکانے سے واقف ہو  
جہاں نادرہ کو چھپایا گیا ہے اور عمارت کو پوشیدہ کر دیا  
گیا ہے۔“

”یہ تو کافی مشکل کام ہے آئیہ۔“ نوازش نے  
سوچتے ہوئے کہا۔ ”اتنے بڑے ہوٹل سے کسی بے  
ہوش آدمی کو کسی کی نگاہ میں آئے بغیر کیسے باہر لے جایا

جاسکتا ہے۔“  
”ایک ترکیب ہے..... اس پر کسی کو شک نہیں ہوگا۔  
میرا انتظار کرو۔ میں چندرہ منٹ میں تمہارے پاس پہنچ

رہی ہوں۔“  
آئیہ نے ترکیب بتائی اور چند ہدایات دے کر فون  
بند کر دیا۔ نوازش نے بھی مسکراتے ہوئے موبائل آف

کیا اور اٹھ کر ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ اندر آ کر اس  
نے ویٹر کی یونیفارم اتار دی۔ نیچے اس کا اپنا لباس تھا۔  
اس نے دوبارہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے میز پر رکھے فون

کار میسور اٹھایا اور روم سروس کو چائے بھیجنے کی ہدایت کر  
کے ریسپونڈر رکھ دیا۔ پھر شیاام کمار کو اٹھایا اور بیڈ پر لٹا دیا۔  
اس نے دروازے کا پلٹ گرایا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

چند منٹ بعد دستک ہوئی تو وہ اٹھ کر ٹہلتے ہوئے



دروازہ کھلا اور ایک ویٹر چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آیا۔ اس نے سلام کیا اور برتن میز پر رکھنے لگا۔

"ستو۔" نوازش نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر ویٹر کی طرف بڑھایا۔ "میں اس سے ملنے آیا تھا۔ یہ میرا گھرا دوست ہے۔ مگر اسے تیز بخار ہو گیا ہے۔ تم اس کے لیے ڈسپینری کی دو ٹیبلٹ لے آؤ۔ میں اس کی تیمارداری کے لیے اسپتال سے نرس کو طلب کرتا ہوں۔" ویٹر نوٹ لے کر جانے لگا تو نوازش نے کہا۔ "ہاں۔۔۔ باقی پیسے تم رکھ لینا۔ جلدی آؤ۔" ویٹر تیزی سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں وہ ٹیبلٹ لے آیا۔ نوازش نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے اسپتال میں اپنے دوست ڈاکٹر کو فون کر دیا ہے۔ وہاں سے ایک نرس بھیجی جا رہی ہے۔ جونہی وہ ہال میں پہنچے اسے اوپر لے آنا۔" ویٹر نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد نوازش چائے پینے لگا۔ تقریباً دس بارہ منٹ بعد دروازہ کھلا اور ویٹر کے ساتھ ایک نرس اندر آ گئی۔ ویٹر واپس جانے لگا تو نوازش نے اسے روک لیا۔ "ایک منٹ ٹھہرو۔۔۔ میرا دوست شاید بے ہوش ہو گیا ہے۔"

نرس اس کی بات سن کر چوکی پھر بیڈ کے پاس جا کر شام کمار کی کلائی پکڑی اور نبض چیک کرنے لگی۔ ویٹر کمر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"انہیں تو انتہائی درجے کا بخار ہے جناب اور یہ بے ہوش ہیں۔" نرس نے نوازش کی طرف پلٹ کر کہا۔

"اچھا۔۔۔ یہ تو بڑی پرابلم ہوئی۔" نوازش نے پریشان لہجے میں کہا۔ "کیا کیا جائے؟"

"انہیں فوراً اسپتال لے چلیں۔ کہیں ان کی حالت مزید خراب نہ ہو جائے۔" نرس نے کہا۔ "گاڑی ہے

"نہیں تو۔۔۔ ٹیکسی کر لیتے ہیں۔" نوازش نے کہا۔

پھر اس نے پچاس کا ایک اور نوٹ ویٹر کو دیا ہوئے کہا۔ "جلدی سے ٹیکسی کا انتظام کرو۔"

"رہنے دیں۔ میرے پاس گاڑی ہے ڈاکٹر صاحب کی۔ اسی میں لے چلتے ہیں۔" نرس نے جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔ یہ نوٹ تمہاری ٹپ ہے۔" نوازش بولا۔ "ڈرامہ بانی کر کے کسی ویٹر کو لے آؤ اور اسے اٹھا کر نیچے گاڑی تک پہنچا دو۔"

"سرجی۔۔۔ میں فون کر کے بلا لیتا ہوں۔" ویٹر نے نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے آگے بڑھ کر فون کا ریسیور اٹھایا اور کاؤم کلرک سے رابطہ قائم کر کے پہلے شام کمار کے پیارا اور بے ہوشی کا بتایا پھر بولا۔ "ٹیکسی کو اوپر بھیج دیں مریض کو اٹھا کر نیچے لانا ہے۔"

تقریباً دو منٹ بعد ایک ویٹر اندر آیا۔ ان دونوں نے مل کر شام کمار کو اٹھایا اور باہر کو چل دیے۔ نوازش نے نرس بھی ان کے پیچھے چل دیے۔ وہ لفٹ کے ذریعے نیچے گراؤنڈ فلور پر آئے۔ پھر ہال کے پہلو میں واقع تیمارداری سے گزر کر ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ نرس نے بائیں جانب کھڑی اپنی کار کی طرف اشارہ کیا اور وہ اس طرف بڑھ گئے۔ نوازش نے عقبی دروازہ کھولا اور انہوں نے شام کمار کو پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ نرس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ نوازش نے دوسرے ویٹر کو بھی پچاس کا ایک نوٹ تمہایا اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نرس نے انجن اشارت کر کے کار پارکنگ لائن سے نکالی اور ہوٹل کے خارجی گیٹ سے باہر سڑک پر آ کر رفتار میں اضافہ کر دیا۔ لیکن کار کا رخ چٹانا اسپتال کے بجائے گلشن اقبال کی طرف تھا اور نرس کے روپ میں آسیہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے نوازش سے

گلشن حدید کی ایک عمارت کے ڈرائنگ روم میں رات ایک ادویہ عمر مگر صحت مند شخص بڑی بے تابی ٹپ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ ختم نے والا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے رک کر سگریٹ کا ٹکڑا ی کش لیا۔ پھر میز کے پاس آ کر سگریٹ کا ٹکڑا لٹا کرے میں مسلا اور صوفے پر بیٹھ کر فون کا ریسیور لیا۔ اس نے نمبر ڈائل کیے۔ چند لمحوں میں ہی رابطہ ہو گیا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دے گئی۔ "جو کسی نوجوان لڑکی کی معلوم ہوتی تھی۔"

"کون بول رہا ہے؟" اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کون ہیں اور کس سے بات کرنی ہے۔" پوچھا۔ "ساتھ ہی لڑکی کی سکائی سنائی دی۔"

"کیا تم رضیہ ہو؟" اس نے تیزی سے سوال کیا۔ "ہاں۔۔۔ مگر آپ کون ہیں؟" لڑکی کے لہجے میں تھیں۔ "اف۔۔۔"

"تمہارے ساتھ کرشن ہے۔" اس نے غصے سے "ریسیور سے دو۔"

"وہ تو سو رہا ہے۔ آپ کون ہیں اور اس سے کس لہجے میں۔۔۔"

"ٹپ اپ۔۔۔ اس سے بات کرنا میری۔ جلدی۔" وہ رضیہ کی بات کاٹتے ہوئے غرایا۔

ریسیور سے رضیہ کی خوف زدہ سی آواز آئی۔ "کرشن۔ تم سے کوئی آدی بات کرنا چاہتا ہے۔"

ایک دو لمحوں بعد کرشن کی آواز آئی۔ "ہیلو۔۔۔ یہ امی رات کو کس کے پیٹ میں درد اٹھا ہے کہ دوسروں کا آرام کا بھی۔۔۔"

"کیا بک رہے ہو حرام زادے۔" وہ ایک دم مازا۔ "میں تمہارا باپ کالی داس بول رہا ہوں۔"

"اوہ۔۔۔ ڈیڈ۔۔۔ ڈی۔۔۔ دوسری طرف سے

"کیا ہو رہا ہے؟" اس نے غصے سے پوچھا۔ "گگ۔۔۔ کچھ۔۔۔ کچھ نہیں ڈیڈی۔ کچھ بھی تو نہیں۔" کرشن ہکھکاتے لگا۔

"بکومت۔۔۔ وہ تمہارے بیڈ پر کیا کر رہی ہے؟" کالی داس اور بھی غضب ناک ہو گیا۔

"بیڈ پر؟" کرشن کی گھبراہٹ آمیز آواز ابھری۔ "نہیں تو ڈیڈی۔ وہ بیڈ پر تو نہیں ہے؟"

"تو کیا تمہاری گود میں بیٹھی ہے حرام زادی۔" کالی داس دھاڑا۔

"نہیں۔۔۔ ڈیڈی۔" وہ صوفے پر بیٹھی میرا سر دبا رہی ہے۔ سر میں درد ہو گیا ہے۔"

"بکومت۔۔۔ کیا اس کے دبانے سے سر کا درد ختم ہو گیا ہے؟"

"ہاں ڈیڈی۔ اس کے ہاتھوں میں بڑی تاثیر ہے۔ آپ بھی کبھی اس سے اپنا سر۔۔۔"

کرشن خوش معلوم ہو رہا تھا۔

"میرے جوتے میں بھی بڑی تاثیر ہے نا بخار۔" کالی داس نے تیزی سے کرشن کی بات کاٹی۔ "باز آ جاؤ عیاشی سے۔ ورنہ بہت ماروں گا۔"

"عیاشی نہیں ڈیڈی۔ میں تو اس سے پیار کر رہا ہوں۔" کرشن کی آواز آئی۔

"پیار کے بچے۔۔۔"

"ڈیڈی۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ کہہ رہی ہے گھونٹنے کے لیے باہر چلیں۔ میں نے کہا ہے ڈیڈی سے اجازت لے کر جائیں گے۔"

"خبردار۔۔۔ اجازت نہیں ملے گی۔ ابھی تم بچے ہو۔" کالی داس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اوہ۔۔۔ مگر رضیہ تو کہتی ہے کہ میں بہت طاقتور جوان ہوں۔ اتنی طاقت کا مظاہرہ اس نے پہلے

کہیں نہیں دیکھا۔" کرشن نے حیرت سے کہا۔



## بھولی صورت دل کے کھوٹے

استیاق طاہر عطی

میں عموماً بھولی بھالی لڑکیوں سے اپنا بھی تعارف کرواتا تھا۔ ادبیا کے مشہور صنعت کار کا اکلوتا بیٹا.... اور ثبوت کے طور پر میں اپنے گلے میں دس تولے سونے کی چین کلائی میں قیمتی گھڑی اور انگلی میں ڈائمنڈ رنگ پہنے رکھتا۔

مجھے اپنی طرف بلاری تھیں۔ میں بے اختیار اس کی طرف کھینچتا چلا گیا۔

”سنے۔“ میں نے اسے صدا دی اور وہ یوں رک گئی جیسے اسے میری آواز کا ہی انتظار تھا۔

”مجھے وجہ کہتے ہیں..... وجہ دریا..... انڈیا کے مشہور صنعت کار ارجے دریا کا اکلوتا بیٹا۔“ میں نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان اپنا تعارف کروایا۔ میں اس کے پاس بھاگتا ہوا پہنچا تھا اس لیے میری سانس پھول گئی تھی۔ میں عموماً بھولی بھالی لڑکیوں سے اپنا ہی تعارف کرواتا تھا۔ انڈیا کے مشہور صنعت کار کا اکلوتا بیٹا.... اور ثبوت کے طور پر میں اپنے گلے میں دس تولے سونے کی چین کلائی میں قیمتی گھڑی اور انگلی میں ڈائمنڈ رنگ پہنے رکھتا۔ تاکہ وہ بھولی حسینا میں میرے جھوٹ کو سچ مان سکیں۔

”اور آپ۔“ میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ قریب سے وہ اور زیادہ دل کش اور زیادہ بھولی بھالی لگ رہی تھی۔ اس نے انگلی سے اپنے ہونٹوں کو چھوا پھر نفی میں ہاتھ ہلایا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بول نہیں سکتی۔ ”اوہ۔“ میں نے حلال سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر سر جھٹک کر سوچا کہ اس طرح کے کاموں کے لیے بے زبان لڑکیاں تو زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ وہ بالکل خاموش تھی تو ظاہر ہے سن بھی نہ سکتی ہوگی اس لیے ہچکچاہٹ بک بے کار ہے۔ میں نے پہلے اس کے کھنکھارے ہاتھ رکھا پھر

ایک خوش شکل اور معصوم سی لڑکی تھی۔ اس کی عمر کا صحیح نہیں ہوتا تھا۔ پہلے پہل وہ مجھے سولہ سترہ سال کی دھنیزہ لگی دوبارہ وہ میں چوبیس برس کی دکھائی دی کبھی اسی سائس سال کی مجبور عورت بھی نظر آتی۔ مگر جو بھی وہ ایک سڈول جسم اور معصوم سے چہرے والی بھولی اور بے وقوف سی لڑکی۔ اور میرے جیسوں کے لیے لی بھالی لڑکیاں ہی ٹھیک رہتی ہیں۔ نا پہلے ان پر کچھ کرنا پڑتا ہے اور تا بعد میں کوئی ققیہ کھڑا ہوتا ہے یعنی رنگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا۔ مگر بھولی تھیں کبھی کبھی دھوکا بھی دیتی ہیں یہ بات میں نے سنی تو لی مگر اس کا یقین مجھے اس تجربے سے پہلے تھا۔ میں چار سالوں سے بہنوں کی شادی کے لیے روپیہ لانے کے لیے اس ملک میں آیا ہوا تھا۔ اور گزشتہ رات ملاٹ سے انڈیا کے لیے روانہ ہوا تھا مگر موسم کی خرابی باعث میرا جہاز چوبیس گھنٹوں کے لیے اس ہل اسٹیشن۔ ایئر پورٹ پر اتر گیا تھا اور ان چوبیس گھنٹوں میں سے لوگوں کو رنگین بنانے کے لیے میں نے اس بھولی حسینہ کا ب کیا تھا۔ عام طور پر اس کے ساتھ ایک منحنی سی نالی سی مہا ہوتی تھی۔ جو لاشی فیکٹی تھوڑا سا ٹھنڈا کر اس کے پیچھے چلتی رہتی۔ میں نے بڑھیا کو کبھی غور سے دیکھنے کی دیر نہیں کی تھی ظاہر ہے میری پوری توجہ اس پر جو تھی۔

کل صبح وہ مجھے اکیلی ٹھکتی ہوئی نظر آئی۔ آج اس نے ٹ پھینا ہوا تھا۔ اور اس کی کھلی ہوئی سڈول ٹانگیں

”بہت بہتر مہاراج۔“ کستورا نے سر ہلایا۔ اس کی کھال بھی اتارنی ہے؟“ ”وہ کس لیے؟“ ”کالی داس نے چونک کر پوچھا۔“ ”آپ نے ناٹیکر کے لیے بھی یہی حکم دیا تھا۔“ سمجھا شاید رضیہ کی کھال بھی اتارنی ہے۔“ ”یکومت..... جتنا کہا جائے اتنا کام کیا کرو کالی داس خرایا۔“

”بہت بہتر مہاراج..... معافی چاہتا ہوں۔“ خوف زدہ آواز میں بولا۔ ”اور کوئی حکم ہے یا جاؤں۔“

”جاؤ..... میرے آنے تک وہیں رہنا۔“ کالی نے کہا۔ ”اور ہاں۔ کرشن کو اپنی شکل مت دکھانا۔ ڈر کر تم پر حملہ نہ کر دے۔“

اس کے خاموش ہوتے ہی کستورا کا بھیا نک دھوئیں میں غائب ہو گیا۔ پھر دھواں منتشر ہو گیا۔ داس نے میز پر رکھے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکالا اور سلگالے کے بعد اٹھ گیا۔ وہ دروازے کے پاس آیا اور دروازے کی طرف انگلی سے ا کیا۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ وہ باہر آ یا داری میں کوئی نہ تھا۔ وہ تیز قدموں سے چلا برآمدے میں پہنچا۔

احاطے کا گیٹ بند تھا اور وہاں دو مسلح چوکیدار تھے۔ برآمدے کے پاس ہی اس کی کار موجود تھی۔ ”گیٹ کھولو۔“ کالی داس نے کار کی طرف بولے بلند آواز سے کہا۔

ایک چوکیدار تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے کھول دیا۔ کالی داس نے کار میں بیٹھ کر انجن اسٹار کیا اور کار کا رخ گیٹ کی طرف کر دیا۔ گیٹ سے آ کر اس نے رفتار میں اضافہ کیا اور جیب سے نکال کر چند ریکا کی روح کو طلب کرنے لگا۔

(جاری ہے)

”اچھا..... تو تم نے حد پھلانگ لی اور طاقت کا مظاہرہ دکھا رہے ہو اسے.....“ ”کالی داس دانت پیستے ہوئے بولا۔“ ”بہت کہتے ہو تم۔“

”آپ ہی کا بیٹا ہوں نا۔“ کرشن نے ہنس کر کہا۔ ”رضیہ نے بتایا ہے کہ اسے آپ نے ہی اغوا کیا تھا سب سے پہلے۔ پھر آپ کے دوست.....“ ””زبان کو لگام دو خبیث کے بچے۔“ کالی داس دھاڑا۔ ”وہ کتیا جھیں میرے خلاف بھڑکاتی ہے۔ گمراہ کرتی ہے۔“

”نہیں ڈیڈی۔ وہ ایسی نہیں ہے۔“ کرشن تیزی سے بولا۔ ”اس نے تو مجھے حقیقت بتائی ہے۔“

”حقیقت تو میں اسے ایسی بتاؤں گا کہ اس کے بدن کی بوٹی بوٹی جینتی پھرے گی۔ تم فوراً اسے خود سے جدا کر دو۔“ ”وہ تو پہلے ہی جدا ہے۔ مجھ سے دور کھڑی ہے۔“

”کھڑی کے بچے..... میں ریسور پر اس کی اور تمہاری مشترکہ سانسیں سن رہا ہوں۔ بہر حال اب وہ تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“

”رہ سکتی ہے ڈیڈی..... اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ ساری عمر میرے ساتھ.....“ ””بکو اس بند کردالو کے ختم۔“ کالی داس اس کی بات کاٹتے ہوئے خرایا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے ریسور کریڈل پر ٹخ دیا۔ اس کی آنکھیں غصے کی شدت سے سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس نے منتر پڑھ کر فرش کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ دوسرے ہی لمحے فرش سے دھواں اٹھنے لگا اور اس دھوئیں سے ایک بھیا نک چہرہ نمودار ہو گیا۔

”یہ حکم ہے مہاراج۔“ اس بھیا نک چہرے نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

”کستورا..... فوراً جاؤ اور نرس رضیہ کو کرشن کے کمرے کی چھت کے ساتھ الٹا لٹکا دو۔“ کالی داس نے حکمانہ لہجے میں کہا۔



We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers

If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

or

send message at  
0336-5557121

گرایا اور چشم زدوں میں ایک ننھا سا پستول نکال کر۔  
پسیلوں سے لگا دیا۔

”گلے کی چین گھڑی اور انگٹھی میرے حوالے کر۔“  
اس نے غرائی ہوئی آواز میں حکم دیا۔ ”اور اپنے کمرے۔“  
جانی بھی۔“

میرے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”جلدی کرو۔“ اس نے پستول کی نوک میری ہانکوں میں چبھاتے ہوئے سختی سے کہا۔ ”ورنہ۔“

میں نے اس کے لہجے سے اس کے ارادے کی طرف ناکی کو بھانپ کر جلدی سے چین انگٹھی اور گھڑی اتار اس کے حوالے کر دی۔

”جانی بھی۔“ وہ غرائی۔

”مگر جانی کیوں؟“ میں بھنبھنایا۔

”ان ڈالرز کے لیے جو تمہارے سوٹ کیس میں ہے بی۔“ اس نے انگلی سے میرے گال کو چھوا۔

”شکر۔“ میں نے احتجاج کی کوشش کی۔

”خاموش۔“ اس نے کڑکتی آواز میں ڈانٹا۔

زیادہ اگر مگر کی تو گولی مار کر اسی جھیل میں ڈبو دوں گی کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا سمجھے۔“

اور میں فوراً سمجھ گیا میں نے خاموشی سے کمرے کو سوٹ کیس کی جابیاں اس کے حوالے کرویں۔ جنہیں لیتے ہی اس نے اگلی بیچ پر بیٹھی اپنی ساتھی اسی منحوس بزم کی طرف اچھال دیں۔ اور بڑھیا جابیاں کھینچ کر لے لی

اوپر کی طرف دوڑ پڑی۔

بس اس کے بعد کی کہانی میں کیا سناؤں؟ آپ خود کہہ سکتے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے میں مسلسل محنت کر کے

سے پیسے جوڑنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ ہاں! اہم اور بات۔۔۔۔۔ اب میں کسی بھی بھولی بھالی صورت والی لڑکی کی طرف بھولے سے بھی نہیں دیکھتا۔

☆☆☆

دیر دیر سے ہاتھ پھسلا کر اس کی کمرنگ لے گیا۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا اور خود ہی سٹ کر مجھ سے آگئی۔ میں اسے خود سے لگائے لگائے جھیل کی اترائی کی طرف چلا۔

یہ چھوٹی سی جھیل چاروں طرف سے پہاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ بہت نیچے ڈھلوان میں جا کر پانی تھا اور

پانی کے ساتھ ساتھ دور دور پر پتھریں لگی ہوئی تھیں۔ اوپر سے دیکھنے سے جھیل یا جھیل کے اطراف لگی پتھریں نظر نہ آتی تھیں اور اس قدر تلی آڑ کا قندہ اٹھاتے ہوئے اکثر محبت

کرنے والے ان بیچوں پر بیٹھے راز و نیاز میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔ میں اسے لیے ہوئے ایک کونے کی بیچ

کی طرف بڑھا کیونکہ میرا ارادہ یوں وکنار سے آگے کا تھا۔ اس لیے میں نے آخری سرے کی بالکل الگ تھلگ

بیچ کا انتخاب کیا تھا۔

میں جب سے یہاں آیا تھا اسی طرح بھولی بھالی لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر اپنا کام چلا رہا تھا۔ بھلا ان کاموں

پر خرچے کے لیے میرے پاس پیسے کہاں تھے؟ پچھلے چار سالوں سے رات دن محنت کر کے میں کل پانچ ہزار ڈالرز

جمع کر پایا تھا۔ جو اس وقت ہوٹل کے کمرے میں میرے سوٹ کیس میں موجود تھے ان ڈالرز سے میری بوزمی

ہوتی ہوئی دونوں بہنوں کا بیاہ ہونا تھا۔ اور میرے گلے میں پڑی دس تو لے سونے کی چین ان دس تولوں سے ان

دونوں کی شادی کا زیور بننا تھا ایک ہاتھ میں قیمتی گھڑی بڑی کے پتی کے لیے اور انگلی میں ڈائمنڈ رنگ چھوٹی کے

شوہر کے لیے تھی۔ اور اس وقت میں ہاتھ لہرا کر اور گلا کھجا کر یہ سب چیزیں اسے دکھا رہا تھا تاکہ وہ مجھ سے اور

میری امارت سے متاثر ہو سکے۔

بیچ تک پہنچتے پہنچتے میرے ہاتھوں نے مزید پیش رفت شروع کر دی مگر اس کی طرف سے کوئی مداخلت نہ ہوئی تو

اس سے میرے حوصلے اور بڑھ گئے۔ جذبے اور بھی جوان ہو گئے۔ بیچ پر پہنچتے ہی اس نے مجھے دھکیل کر بیچ پر



## پینا گاہ

ایک روز میں سات بجے پروفیسر بونزال کی رہائش گاہ پہنچا تو وہ کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں سے نیچے تجربہ گاہ میں آ گیا اور اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ اچانک کام کے دوران میری ہاتھوں سے رقتے پر پڑی۔ اس لیبارٹری میں میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ پہلے تو میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی، ایسے ہی کوئی کاغذ کا ٹکڑا ہوگا، مگر میری ٹیمبل پر عین میرے سامنے یہ رقتہ میری توجہ مبذول کر دینے میں کامیاب ہو، بہر طور میں نے رقتہ کھولا اور یہ دیکھ کر چونک گیا کہ وہ میرے ہی نام تھا۔ اب میں اسے بہ غور پڑھنے لگا۔ مسٹر افتخار... تم میرے محسن ہو، اسی لیے میں یہ بات تم سے کہہ رہی ہوں۔ تم سے اس سال وائرس پر جو کام کر دیا جا رہا خود تمہاری ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان کی جانی و بربادی کا موجب بنایا جانے والا ہے۔ فارگاڈ سیک تجربے سے باز آ جاؤ، کیوں کہ اس میں خود تمہاری جان کو بھی خطرہ ہے۔ پلیز!..... اس خطرناک وائرس فارمولے کو جلا ڈالو۔ اس تجربے سے کرنا چاہتے ہو، مگر جیسے ہی تم فارمولا تمہاری گم نام خیر خواہ!

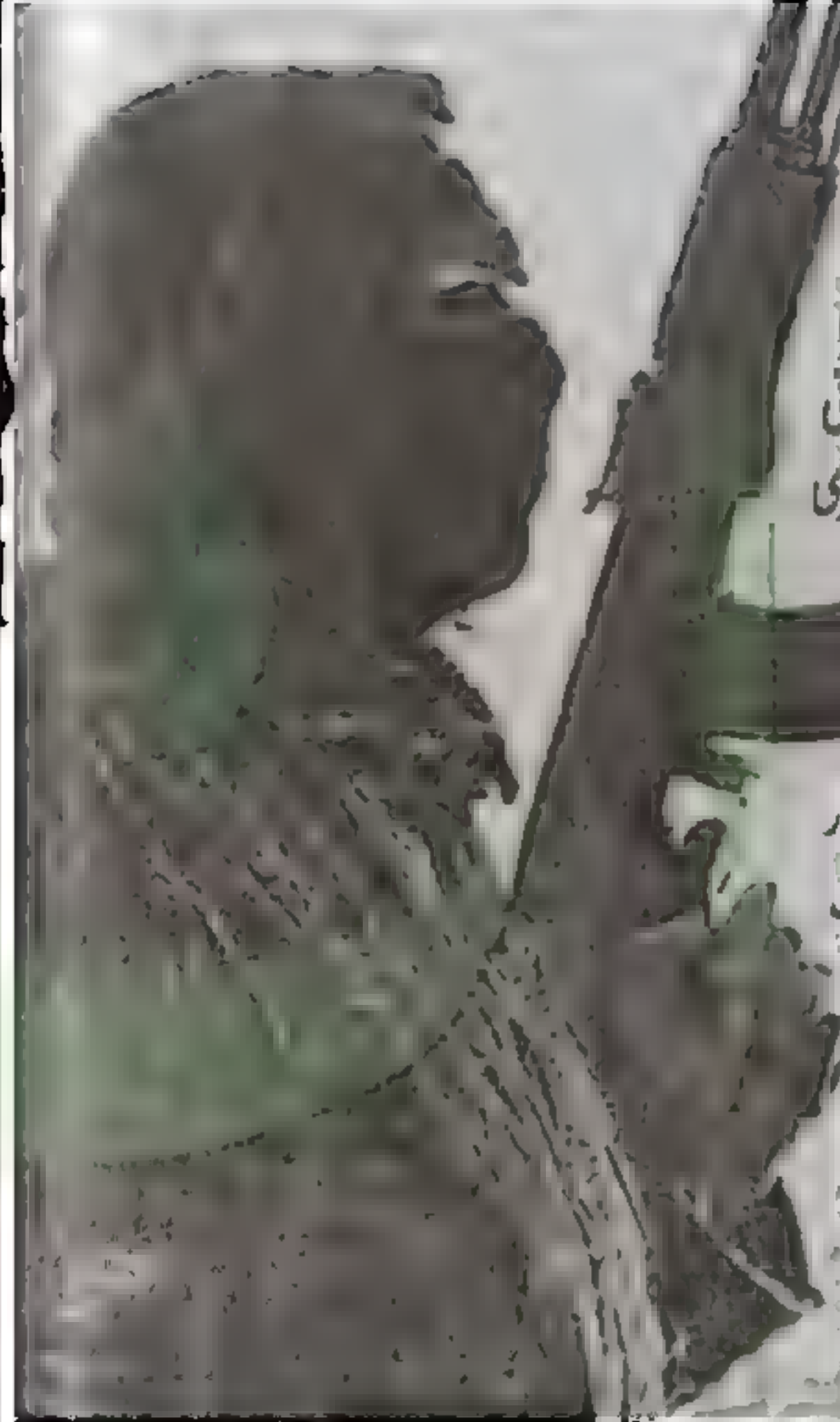
مضمون سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ خط کسی لڑکی یا عورت

میں یہ خط پڑھ کر دم بہ خود رہ گیا۔ خط کے ہے مگر کس نے.....؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔

میں عجیب کیفیت کا شکار ہونے لگا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر میری اس گم نام ہم درد نے کیوں مجھے اس سال وائرس کی تیاری سے روکنے کی کوشش کی ہے، حالاں کہ جہاں تک میرا خیال تھا کہ میں جس وائرس پر کام کر رہا تھا، وہ انسانی زندگی کے لیے سر بہ سر بے ضرر تھا، تو پھر میری گم نام ہم درد کو ان باتوں کا علم کیسے ہوا کہ بعض نامعلوم افراد اس کا غلط استعمال کرنے کی

ٹھانے ہوئے ہیں؟ کیا وہ ان کے کسی شیطانی اور مذموم مقاصد سے آگاہ ہو چکی تھی.....؟ مگر یہ عورت یا لڑکی کون.....؟ میرے دماغ میں یک بہ یک کئی سوالات اُبھرے۔

اچانک مجھے دروازے کی سمت کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں چونک کر اٹھا۔ دروازے کی طرف دبے پاؤں بڑھا۔ ذرا قریب پہنچا تو سامنے نو دار کو دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔





میرے سامنے ایلیز کھڑی تھی۔ آنجنائی پر دھیرے  
مالکس اسپرنگ کی بیٹی جو اب بے چاری یتیم ہو چکی تھی  
تاہم اسے یہاں تھرے گاہ میں اچانک اور بغیر دستک  
دیے داخل ہوتے دیکھ کر میرے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ  
یہاں اول تو کسی کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی کیوں  
کہ یہاں خطرناک کیمیکل وغیرہ موجود تھے۔ میں خود  
چہرے پر بسا اوقات نقاب چڑھا لیا کرتا تھا۔ دوسرے  
یہ کہ اگر گھر کے کسی فرد کو رابطہ کرنا مقصود ہوتا تو اس کے  
لیے انٹرکام کی سہولت دی ہوتی تھی۔

بہر طور میں ایلیز کو دیکھ کر یک دم اپنی جگہ سے اٹھ  
کھڑا ہوا۔ وہ چہرے سے مضطرب اور بے چین سی نظر  
آ رہی تھی۔ میں حیران پریشان نظروں سے اس کی  
طرف دیکھتا ہوا چند قدم آگے بڑھا تو وہ بھی میرے  
قریب آ گئی۔

”کیا ہوا ایلیز! خیریت؟ تم پریشان نظر آ رہی ہو۔“  
میں نے قدرے الجھن آمیز پریشانی سے پوچھا۔  
”ہاں۔“ وہ لڑکھاتی سی آواز میں بولی۔  
”وہ۔۔۔۔۔ ارادہ تو میرا سامنے آنے کا نہیں تھا مگر۔۔۔۔۔  
مگر میں تمہیں مصیبت میں پھنستا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔“  
میں اس کی بات پر بری طرح چونکا تھا اور پھر یک  
لخت میری نگاہوں کے سامنے وہ پراسرار خط گھوم گیا۔  
”کیا مطلب؟ مس ایلیز! میں تمہاری بات کا  
مطلب نہیں سمجھا؟“

میں نے الجھ کر پوچھا۔ اس نے ایک نگاہ میرے  
چہرے پر ڈالی اور تذبذب کے ساتھ بولی۔  
”تم نے وہ خط پڑھ لیا ہوگا جو یہاں تمہاری میز پر  
رکھا تھا۔“ میں نے وہ خط اسے دکھایا اور پوچھا۔

”یہ خط۔۔۔۔۔ تم نے۔۔۔۔۔؟“  
میں نے دانستہ اپنا جملہ منقطع کیا۔  
”ہاں۔“ اس نے یک دم اپنے سر کو اثبات میں  
ہلاتے ہوئے مختصر کہا۔

”ہوں۔“ میں نے ایک گہری ہنکاری لی۔  
”آؤ۔ ادھر بیٹھو اور مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ۔“  
چکر ہے؟“ میں نے اسے ایک اسٹول نما چیئر پر بٹھایا  
کہا اور پھر اس کے بیٹھنے ہی میں بھی اپنی کرسی  
برائے جمان ہو گیا۔

اب میری مستفسرانہ نظریں اس کے مضطرب  
چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بلا تعویق بتانے لگی۔  
”مسٹر انفارم اتم جس فارمولے پر کام کر رہے ہو

اسے ادھورا چھوڑ دو، کیوں کہ اس کی تیاری نہ ہوا  
تمہارے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے نقصان  
ثابت ہو سکتی ہے۔“

”بٹ وائے۔۔۔۔۔ ایلیز اتم ایسا آخر کس Base  
کہہ رہی ہو۔“ میں نے اس بار واضح طور پر الجھن آمیز  
پریشانی سے پوچھا۔

اس نے ایک طویل سانس لی اور اسرار بھرے  
میں قدرے صراحت سے بولی۔

”مسٹر انفارم کچھ روز پہلے میں نے محض اتفاقی  
پر پروفیسر یونزال کی گفتگو سنی لی تھی۔ اس روز دوا  
ان سے ملاقات کرنے آئے تھے۔ وہ جس کمر  
میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اس کے ساتھ  
اسٹور نما چھوٹا سا کمرابھی ملحق تھا۔ میں اتفاق سے  
وقت اسٹور میں پرانے اخبارات اور رسائل چھا  
رہی تھی کہ اچانک پروفیسر یونزال کی آواز میر  
کانوں سے ٹکرائی۔ وہ ان سے ذرا دھیمی آواز  
باتیں کر رہے تھے۔

”مسٹر انفارم انفارم نے فارمولے پر کام شروع  
ہے۔ وہ تیار ہوتے ہی میں وہ فارمولا چوری کر لو  
اور تمہارے حوالے کر دوں گا، مگر میں بے  
ایڈوائس لوں گا اور ڈالر کی صورت میں اور پور  
کرڈ ڈالر۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مسٹر یونزال!“ اجنبی کی آ

اجنبی۔  
”مگر دس کروڑ ڈالر بہت زیادہ ہیں، کیوں کہ تم  
اچھی طرح جانتے ہو کہ انفارم جس اسالٹ وائرس پر کام  
کر رہا ہے ہمیں اس پر مزید کام بھی کرنا پڑے گا، ورنہ  
تو وہ ہمارے لیے بالکل بے ضرر ہے۔“

”جی نہیں۔ رقم میں اتنی ہی لوں گا۔“ پروفیسر یونزال  
نے اٹل لہجے میں کہا تو دوسرا اجنبی بولا۔

”مسٹر یونزال! ہم اس فارمولے کو اپنے مقصد کے  
مطابق مزید اسٹیلش کرنا چاہتے ہیں یعنی فارمولا تم  
سے حاصل کرنے کے بعد ہم اپنے ساتھیوں کی  
ایک خفیہ ٹیم میں تمہیں بھی شریک کرنا ضروری سمجھتے  
ہیں ظاہر ہے اس کے لیے بھی ہمیں ایک خطیر رقم خرچ  
کرنا ہوگی۔“

”بے شک! اگر تم لوگ اس فارمولے کو اپنے  
مطلب کے مطابق اسے مزید اسٹیلش کرنے کے لیے  
مجھے بھی ہائر کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر  
میں رقم کم نہیں کروں گا اور ہاں اس فارمولے پر مزید  
کام کرنے کے لیے میں الگ سے پانچ کروڑ ڈالروں  
کا اگر تم لوگوں کو یہ سودا منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے  
پارٹیوں کی کمی نہیں۔“ پروفیسر یونزال نے حتیٰ لہجے میں  
کہا۔ اندر تھوڑی دیر خاموشی چھا کر رہی۔ ایلیز اتنا  
بتا کر لے بھر کو جھمی پھر کہنا شروع ہوئی۔

اسٹور کا ایک دروازہ چوں کہ اندر مذکورہ کمرے میں  
بھی کھلتا تھا اس لیے میں کان لگائے ان کی یہ ساری  
باتیں بہ غور سن رہی تھی۔ بلا آخر وہ لوگ یہ سودا منظور  
کر کے چلے گئے۔ اس وقت تو مجھے ان کی گفتگو سے کسی  
خاص یا قابل ذکر بات کا پتا نہ چل سکا، کیوں کہ میں  
یہی سمجھ رہی تھی کہ شاید اس فارمولے کو یہ لوگ واقعی  
مزید کارآمد بنانا چاہتے ہیں لیکن ابھی دو روز پہلے ہی کا  
ذکر ہے کہ پروفیسر یونزال نے اپنے دو قریبی دوستوں  
پروفیسر جیری اور پروفیسر ڈونالڈ کو اپنے ہاں بلایا جوں

کہ میرے دل میں اس دن سے کھد بھگ چکی تھی اور  
اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ آخر پروفیسر یونزال تمہارے  
اس فارمولے کو ہنگے داموں کیوں فروخت کرنا چاہتے  
ہیں؟ لہذا جب میں نے ان تینوں کی ٹوہلی تو مجھے اصل  
حقیقت کا پتا چلا۔“

ایلیز اتنا کہہ کر ڈرا تھی۔ اس بار اس کے توقف کا  
وقفہ خاصا طویل تھا۔ میرے اندر زبردست پکڑ ڈھکڑ  
بجی ہوئی تھی۔ میں بہ دستور اپنی نظریں اس کے چہرے  
پر مرکوز کیے بہ غور اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ دوبارہ کہنا  
شروع ہوئی۔

”اس بار مجھے پروفیسر یونزال کی گفتگو سے اصل  
بات کا پتا چلا جو انہوں نے کل کراہنے دوستوں جیری  
اور ڈونالڈ سے کی تھی۔

انہوں نے انہیں بتایا کہ وہ اسالٹ وائرس کو ہنگے  
داموں ایک انٹرنیشنل کروکر کے ہاتھوں فروخت کرنے  
کا ارادہ کر چکے ہیں اور ان سے معاوضہ بھی ملے کر لیا  
ہے۔ اس پر پروفیسر جیری اور ڈونالڈ نے شدید حیرت کا  
اظہار کرتے ہوئے یونزال سے پوچھا کہ آخر اس بے  
ضرر سے فارمولے کو اتنے ہنگے داموں کیوں خریدا  
جا رہا ہے تو پروفیسر یونزال نے انہیں بتایا کہ انٹرنیشنل  
کروکر جس کا ایک انڈر ورلڈ ونگ ترقی یافتہ اور ترقی  
پذیر سپر پاورز ملکوں کے ساتھ خفیہ ڈیلنگ بھی کرتا ہے  
اور انہیں حریف ملکوں کے فوجی اور دفاعی رازوں اور  
دیگر کارآمد دستاویزات چوری کر کے ان کے حوالے  
کرتا ہے لہذا انہوں نے کسی ملک کے خفیہ افسروں  
سے ڈیلنگ کر رکھی ہے اور میرا خیال ہے کہ اسالٹ  
وائرس کے فارمولے کو اپنے مفادات میں ڈھالنے  
کے لیے ہی ان دونوں کے درمیان مزید کمیشن بھی  
ہوئی ہے جو مشترکہ طور پر اس فارمولے پر مزید کام کرنا  
چاہتے ہیں پھر پروفیسر ڈونالڈ کے اس سوال پر کہ آخر  
وہ اس فارمولے پر مزید کون سے خفیہ تجربات کرنا



چاہتے ہیں تو پروفیسر یونزال نے بتایا کہ وہ لوگ اس فارمولے کی تیاری کے بعد سب سے پہلے تو اسالٹ وائرس تیار کریں گے پھر اس پر مزید تجربات کر کے اسے بے ضرر سے ضرر رساں بنا دیں گے اور وہ اسالٹ وائرس جس کا اصل مقصد کیسائی اور ایٹمی ہتھیاروں کو ناکارہ کرنا ہوگا اسے وہ اس قدر خطرناک بنا دیں گے کہ اس کی طاقت الٹا انسانوں کے خاتمے پر منتج ہوگی، یعنی وہ بے ضرر وائرس کیسائی اور ایٹمی ہتھیاروں سے کئی گنا زیادہ خطرناک اور جان لیوا ہو جائے گا۔

ایلیز یہ سنسنی خیز انکشافات کرنے کے بعد خاموش ہو گئی جب کہ میرا دماغ بری طرح سائیں سائیں کرنے لگا بلکہ میں تو چند ٹاپے گنگ ہو کر ہی رہ گیا تھا۔ ایلیز ایک ایسی لڑکی تھی جس کی بات کو میں بہر کیف جھوٹ حصو نہیں کر سکتا تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ اس نے ابھی مجھے جس لرزہ خیز حقیقت سے آگاہ کیا تھا وہ بلا انکلیک و بلا ستم تھی۔

”ایلیز! تم نے اس راز سے میرے علاوہ کسی دوسرے فرد کو تو آگاہ نہیں کیا ہے نا؟“ میں نے چند ٹاپے گم مسم رہنے کے بعد کسی خیال کے تحت اس سے پوچھا۔

”ہرگز نہیں اور نہ ہی کرنے کا ارادہ ہی رکھتی ہوں۔“ وہ اپنا سرٹنی میں ہلاتے ہوئے بولی۔

”گڈ۔۔۔!“ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ پھر چند منٹ خاموشی کے بعد اس سے بولا۔

”ایلیز! تم نے مجھے پروفیسر یونزال کے مکروہ مقاصد سے آگاہ کر کے نہ صرف مجھ پر بلکہ پوری انسانیت پر احسان کیا ہے۔ تم واقعی ایک بہادر لڑکی اور ہم درد انسان ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ پروفیسر یونزال اس قدر لالچی اور تنگ انسانیت فحش بھی ہو سکتا ہے جو محض دولت کی خاطر پوری انسانیت کو ایک

خطرناک جہنم کی آگ میں بھی جھونک سکتا ہے۔“ میرے لہجے میں بہت ترقی پروفیسر یونزال کے لیے نفرت کا زہر عود کر آنے لگا تھا۔ ایلیز ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”مسٹر افتخار! دولت شے ہی ایسی ہے، ویسے مجھے حیرت ہے کہ آخر یونزال ایسا کیوں کرنا چاہتا ہے؟ کیا اسے اتنی سمجھ نہیں ہے کہ وہ جس فارمولے کو خطرناک اور جان لیوا بنانے والوں کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتا ہے اس کی آگ سے دیر بہ دیر وہ خود بھی نہ بچ پائے گا؟“

”حرم اور طمع کے مارے ہوئے لوگوں کے اندر بھلا ایسی دور اندیشی نہ سوچ کہاں ہوتی ہے؟“ میں نے سچی سے کہا پھر اسے سمجھاتے ہوئے حرید بولا۔

”اچھا ایلیز! اب تم بالکل خاموش ہی رہنا، لیکن اگر تمہیں پروفیسر یونزال کی گفتگو کے بارے میں اسی طرح بہ آسانی موقع ملتا رہے تو تم سن سن لیتی رہنا۔ میں بھی اب محتاط رہوں گا۔“ وہ بولی۔

”اب تم اس فارمولے کا کیا کرو گے؟ میرے تو خیال میں تمہیں اب اسے ادھر ادھر چھوڑ کر تنگ کر دینا چاہیے۔“

میں اس کی بات پر گہری سوچ سے بولا۔

”وہ فارمولا تو اب اپنی تیاری کے آخری مرحلے میں ہے لیکن میں اپنی محنت ضائع بھی تو نہیں کرنا چاہتا بلکہ میں چاہتا ہوں کہ اسے انسانی خدمت کے طور پر استعمال میں لآؤں۔“

”تو کیا تم اسے ضائع نہیں کرو گے؟“ ایلیز پریشان کن حیرت کے ساتھ بولی۔

”اس کے بارے میں بعد میں سوچوں گا۔ ہو سکتا ہے میں اسے تیار کرنے کے بعد پروفیسر یونزال کو ڈانچ میں رکھوں اور اندر ہی اندر اسے انسانی خدمت کے لیے انتہائی رازداری اور خفیہ طریقے سے یہ کام انجام

دے ڈالوں۔“ میں نے کہا۔ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں چونک سا گیا۔ ایلیز بھی بے چاری پریشان سی نظر آنے لگی۔

”میرا خیال ہے پروفیسر یونزال ہوں گے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”ایلیز تم ایسا کرو جلدی سے چھپ جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں وہ یہاں میرے ساتھ دیکھیں۔ ہری آپ!“ میری بات پر وہ جلدی سے ایک آڑ کے پیچھے چھپ گئی۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ لیبارٹری کے اندر داخل ہونے والا شخص پروفیسر یونزال ہی تھا۔ میں نے اپنی سی کوشش کی تھی کہ میرے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی کے تاثرات نہ ابھریں۔ لہذا میں نے فوراً چہرے پر ہلکی مسکراہٹ لاتے ہوئے پروفیسر یونزال کو دیکھا اور رکی ہائے ہیلو کے بعد پوچھا۔

”انکل! کہاں تھے آپ!“ وہ مسکرا کر بولے۔

”ہاں۔ میں ذرا جبری اور ڈونالڈ کے پاس چلا گیا تھا۔ کچھ ضروری ڈسکشن کرنا تھی۔ تم سناؤ، کہاں تک پہنچے؟ مجھے لگتا ہے کہ تمہارا فارمولا اب آخری مراحل ہی طے کر رہا ہوگا؟“

”جی ہاں۔ تقریباً“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”گڈ! اندازاً ویسے کتنے روز کا کام ہوگا؟“

”کام تو چند ہی دنوں کا ہی باقی بچا ہے لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا۔۔۔؟“ وہ فوراً مستفسر ہوئے۔ جواباً میں

دانستہ اپنے چہرے پر الجھن آمیز سوچوں کی شکنیں ڈالتے ہوئے بولا۔

”آخر میں ذرا ایک پرابلم ہو گیا ہے۔ بہر حال میں Solve کر لوں گا۔“

میں نے دیکھا وہ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں ہو رہا تھا کہ انہیں فارمولے کے مکمل ہونے کی غیر معمولی جھلت تھی۔

”مجھ سے کوئی مدد چاہیے؟“ بلا خراشوں نے بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا تو میں جواباً ایک ہلکاری خارج کر کے بولا۔

”نہیں۔ میں خود ہی دیکھ لوں گا۔“

”ہوں۔ ٹھیک ہے۔“ ابھی انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کسی کانچ کے گر کر ٹوٹنے کی آواز ابھری جو لیبارٹری کے خاموش باحول میں دھماکے کی طرح گونجتی محسوس ہوئی۔ کانچ ٹوٹنے کی آواز اسی سمت سے آتی محسوس ہوئی تھی جہاں ایلیز چھپی ہوئی تھی۔ غالباً گھبراہٹ یا پریشانی میں اس سے کیمیکل کی کوئی بوتل گر کر ٹوٹ گئی تھی۔ پروفیسر یونزال نے چونک کر مذکورہ سمت دیکھا اور لپک کر آگے بڑھا تو میں نے دیکھا ایلیز سبے ہوئے چہرے کے ساتھ آڑ سے برآمد ہوئی۔

”تم ادھر چھپی ہوئی کیا کر رہی تھیں؟“ پروفیسر یونزال نے اس کی طرف گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھ کرنا گوارے لہجے میں پوچھا۔

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میں۔۔۔“ پریشانی اور گھبراہٹ کے مارے اس سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

”تمہیں پتا ہے یہاں کتنے خطرناک کیمیکل بکھرے ہوئے ہیں۔“ پروفیسر یونزال نے درشت لہجے میں کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”افتخار! یہ یہاں کب آئی؟“

اس کے لہجے میں گہری تشکیک ہو رہی تھی۔ میں بھی ان جان بن گیا اور بولا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ یہ یہاں کب اور کیوں آئی تھی؟ میں تو اپنے کام میں منہمک تھا۔“

”ہوں۔“ پروفیسر یونزال نے ایلیز کی طرف گھور کر ایک اسرار بھری طویل ہلکاری بھری۔

”ناؤ، یوگیٹ لاسٹ فرم میرا“ ایلیز لرزتی کانپتی باہر نکل گئی۔

”عجب پاگل لڑکی ہے یہ۔ بھلا یہ یہاں چھپی کیا



کر رہی تھی؟“ میں دانستہ تجاہل عارقانہ سے کام لیتے ہوئے خود کھائی کے انداز میں بڑبڑایا۔

”یہ پاگل نہیں ہے سسٹر افتخار!“ پروفیسر بونزال گہری سوچ کے استغراق میں بولے۔

”یہ ضرور کسی مقصد کے لیے یہاں آئی ہوگی۔ ٹھہرو میں ابھی اس سے جا کر پوچھتا ہوں۔“

وہ یہ کہہ کر فوراً لیب سے باہر نکلا چلا گیا۔ میں ہکا بکا اور پریشان سا کھڑا رہ گیا۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا پھر میں بھی ہونٹ بیچھتا ہوا لیب سے باہر آ گیا۔ سبز بونزال اور ان کی بیٹی ماریہ کہیں باہر گئی ہوئی تھیں اور پروفیسر بونزال ایک کمرے میں ایلیز کی کلاس لے رہے تھے۔

”ہوں۔ تو گویا تم افتخار سے ملنا چاہتی تھیں؟“ جب میں وہاں پہنچا تو وہ صوفے پر بیٹھے اپنے سامنے کھڑی ڈری سہی ایلیز کو گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

میں سمجھ گیا ایلیز نے جھوٹ موٹ مجھ سے چھپ کر ملنے کا بہانہ تراشا تھا۔ میں بھی پروفیسر کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھے ایلیز کی ہیئت کڈائی پر ترس آ رہا تھا مگر میں اس کی حمایت میں بولنے سے کتر اسی رہا تھا چہ جائیکہ پروفیسر بونزال کو مجھ پر بھی کسی قسم کا شک نہ ہو جائے۔

”کیوں تم افتخار سے چوری کیوں ملنا چاہتی تھیں؟“ بلاآخر پروفیسر بونزال نے پاٹ دار آواز میں ایلیز سے پوچھا۔

”مم..... میں یونہی ان سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اکیلے یور ہو رہی تھی مگر انہیں کام میں مصروف دیکھ کر میں شش و پنج میں مبتلا ہو گئی تھی۔ پھر آپ کو اندر داخل ہوتا پا کر میں چھپ گئی۔“ ایلیز نے سارا کچھ اپنے سر لے لیا حالاں کہ وہ ایک نیک کام کے سلسلے میں ہی مجھ سے ملنے آئی تھی مگر ایلیز نے دانستہ بھی تاثر ڈینے کی کوشش کی تھی گویا وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ میں نے کن

انکھوں سے پروفیسر بونزال کی طرف دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ ایلیز کی باتوں میں آگئے تھے مگر پھر بھی اس کی پیشانی پر تشکیک آمیز شکنوں کا جال سا پھیل گیا تھا۔

”دیکھو ایلیز! تم میرے مرحوم دوست پروفیسر جیری مالکم کی بیٹی ہو، اس لیے میں تمہیں کچھ نہیں کہہ رہا۔ تمہیں یہ عامیانہ رویہ زیب نہیں دیتا۔ بہر حال آئندہ محتاط رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ پھر مجھے تمہیں یہاں سے نکالنا پڑ جائے۔“ پروفیسر بونزال نے سرد لہجے میں اسے متنبہ کرتے ہوئے کہا اور میں نے دیکھا، بے چاری ایلیز کا چہرہ احساسِ ذلت سے..... میں ایلیز کی حمایت میں کچھ بولنا نہیں چاہتا تھا ورنہ اس بے چاری کی قربانی ضائع چلی جاتی، اس لیے بہ ظاہر خاموش بیٹھا اندر ہی اندر اس کی ذہنی دلی حقارت پر کڑھتا رہا۔ ایلیز بولے سے سو رہی کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

☆

ایلیز کی بروقت حکمتِ عملی سے بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے روزی اپنے باپ مائیکل ٹائیڈل کے گھر کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ آئی تھی اس لیے وہ پہلے چند روز تو پروفیسر بونزال کے ہاں رہی تھی پھر اس کے بعد اس نے یونیورسٹی آف لیڈز کے کیسپس میں اپنی سنگل الاٹمنٹ کروائی تھی۔ یوں اب میں اور روزی اور قریب ہو گئے تھے۔

مائیکل ٹائیڈل والا قصبہ یہ ظاہر ٹھنڈا پڑ چکا تھا مگر میں مائیکل ٹائیڈل کی کینہ پرور فطرت سے بہ خوبی واقف تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اندر ہی اندر بہ ظاہر گونگا پانی بنے میرے خلاف ایک گرداب بنانے کی تک و دو میں مصروف کار ہوگا، تاکہ مجھے پھنسا سکے۔ جب اسے عارضی طور پر معطل (Suspend) کر دیا گیا تھا تو اس نے مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ لامحدود اپروچ کا مالک ہے اور بہت جلد وہ مجھے اپنی سازشوں کے ناویدہ تاریکیوں

نے والا تھا۔

طور خطرات ہی فی زمانہ میری کمین گاہ تھی تو پھر ملا ان گیدڑ ہتھکنیوں سے کیوں ڈرتا تاہم میں پہلے سے زیادہ محتاط رہنے لگا تھا۔

جب کہ پروفیسر بونزال کے چہرے کا نقاب نے اتار دیا تھا تو مجھے ایک نئی الجھن آمیز پریشانی گھیر لیا تھا۔ روزی میری پہلی اور آخری محبت تھی اور اب اس کی دست راست اور ہمدرد بھی۔ میں نے اسے بھی بتا ڈالا تھا۔

انی! میں تو کہتی ہوں اس فارمولے کو گولی مارو اور اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ ہمارا تھیسز مکمل ہونے ہے۔ چند مہینے تو رہ گئے ہیں پھر ہم سارے گھنٹوں پر نعت بھیج کر پاکستان چلے جائیں گے۔“

ارادہ تو میرا بھی یہی ہے لیکن روزی! میں اپنی ضائع نہیں کرنا چاہتا اور پھر اس فارمولے کو میں لی بھلائی کے لیے استعمال میں لانا چاہتا ہوں۔“

مگر انی! یہ بھی تو سوچو کہ پروفیسر بونزال دولت لالچ میں اسے ان لوگوں میں فروخت کرنا چاہتا ہو اس فارمولے کے ذریعے دنیا میں اپنی اجارہ داری اور مطلق العنانی کے لیے استعمال کرنے کا مذموم ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ تمہارا یہ فارمولا بجائے بے کے پوری دنیا کے انسانوں کے لیے وبالِ مہینہ بن جائے۔“

زی نے سمجھانے کے انداز میں مجھ سے کہا اور میں کی بات کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا۔

روزی! مجھے کیا کرنا ہے، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم بے فکر رہو۔ مجھے اب پروفیسر ل کرائیڈر کی اصلیت کے بارے میں پتا چل چکا ہے۔“

میں نے اٹل لہجے میں کہا اور روزی نے ایک ہٹکاری خارج کر کے چپ سادھ لی۔ شاید وہ میری ضدی فطرت سے واقف تھی مگر میری ضد بے جان ہوتی تھی۔ میں اپنے اصولی موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔

ادھر بعد میں مجھے پتا چلا کہ ایلیز نے خود ہی خاموشی کے ساتھ اپنی مرضی سے پروفیسر بونزال کے گھر کو خیر باد کہہ کر اپنی الگ رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس نے اپنے آنجنابی باپ پروفیسر مالکم اسپر نجر کا آؤٹر لندن میں واقع بنگلہ فروخت کر کے شہر میں ساؤتھ امپریٹ پر ایک گرائے کا اپارٹمنٹ لے لیا تھا اور مقرر کردہ گے بندھے اخراجات سے وہ پرسکون مگر تہا زندگی گزار رہی تھی۔ میں ایک دن اس کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ وہ اس وقت اپنے اپارٹمنٹ میں ہی موجود تھی۔ اپارٹمنٹ چھوٹا مگر اچھا اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ دو کمرے اور ایک لاؤنج بھی تھا۔ ایلیز مجھے دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔

”تم نے اچھا کیا ایلیز! کہ پروفیسر بونزال کے پروں سے نکل آئیں۔“ میں نے ایک صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔

وہ میرے لیے لائٹ جوس بنا کر لے آئی اور میرے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئی تھی۔

”مگر اب شاید میں پروفیسر بونزال کی پراسرار سرگرمیوں پر نظر نہ رکھ سکوں گی۔“ وہ متاسفانہ لہجے میں بولی تو میں نے کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ تم نے مجھے اصل حقیقت سے تو آگاہ کر ہی دیا ہے۔ اب میں محتاط رہوں گا۔ یہ تمہارا ایک بہت بڑا کام ہے۔ آگے میں خود ہی سنبھال لوں گا۔“ وہ خاموشی سے جوس کے ہلکے ہلکے سپ لینے لگی۔ میں مزید تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد لوٹا۔

میری کمری سیڈاچوں کے بالکل تباہ ہو چکی تھی اس لیے میں اب روزی کی بیوک استعمال کیا کرتا تھا۔ میں ڈرائیونگ پر بیٹھا اور جیسے ہی میں شاہراہ پر آیا تو اچانک



مجھے عقی سیٹ پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور پھر اس سے پہلے کہ میں اپنا سر گھما کر عقب میں دیکھتا اچانک میری گردن سے ایک سرد آہنی نال آگئی اور ساتھ ہی ایک کرخت سرسراہی آواز ابھری۔

”کوئی غلط حرکت کیے بغیر میرے بتائے ہوئے پتے پر کار چلاتے رہو۔“ میرے ٹھکے ہوئے وجود میں یک لخت سنسنی دوڑتی چلی گئی۔

دھمکی دینے والے کا سفاک لہجہ بتا رہا تھا کہ اگر میں نے بلاچوں و چرا اس کی تنبیہ پر عمل نہ کیا تو وہ بے دریغ مجھے گولی مار دے گا۔ چنانچہ میں ایک پھنسی پھنسی سی ہرکاری خارج کر کے اس کے بتائے راستوں پر اپنی کار دوڑائے جا رہا تھا۔

میرے اندر زبردست مل جل جی ہوئی تھی۔ ابھی میں یہ تجزیہ کرنے سے قاصر ہی تھا کہ اس نامعلوم شخص کا تعلق راسکل کنگ سے تھا یا مائیکل ٹائیڈل کا کوئی قارور ڈروپ۔۔۔۔۔؟ مگر جب تقریباً نصف پون کھٹے بعد میں نے اس کی آخری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کار کو ایک قدرے چوڑی اسٹریٹ میں موڑا تو مجھے یک لخت اندازہ ہوا کہ یہ نامعلوم شخص کس کا کار پر داز تھا۔

بالآخر میں نے کار راسکل کنگ کے نیوڈ گرل کلب کے سامنے روک دی۔ کلب کے گیٹ کی پیشانی پر عرباں لڑکی کا نیون سائن جھلکا رہا تھا۔ گیٹ کے اندر باہر لوگوں کی آدک جادک بھی نظر آتی تھی۔

اب میری غیرت یہ گوارا نہیں کر رہی تھی کہ میں راسکل کنگ کے ایک معمولی ہرکارے کے قابو میں آکر ان کی قید میں چلا جاؤں۔ میں تو شخص یہ جاننا چاہتا تھا کہ آیا اس ہرکارے کا تعلق کس سے ہے، جواب مجھے پتا چل چکا تھا۔

”نیچے اترو۔“ معاہرکارے نے غرا کر کہا اور میں اپنی طرف کا دروازہ کھولے باہر اترتا تو وہ بھی عقی نشست کا

دروازہ کھولے باہر اترنے لگا تو میں نے سولج لیتے ہوئے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ دروازہ دارلات ماری۔ نتیجتاً ہرکارے کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا بلکہ وہ خود بھی دوبارہ اندر مٹی لڑھک گیا۔ میں نے بہ سرعت اسے چھاپ دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ اور میرے چہرے پر لات رسید کرنے کی کوشش کی اسے اب کہاں موقع دینے والا تھا لہذا اسے باہر کر میں نے سڑک پر پٹا تو باہر موجود لوگوں میں جھج گئی۔ گیٹ پر متحین دیگر بد معاش نما کاروں طرف لپکے مگر میں کار میں دوبارہ سوار ہوا اور اشارت کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھالی۔ ما کار کی چھت پر دھمک سنائی دی۔ میں سمجھ گیا ہرکارے نے اپنی کار پر دازی دکھانے کی ہما تھی۔ فائرنگ انہوں نے اس لیے نہیں کی تھی کہ افراتفری مچ جاتی۔

بہر طور میں کار دوڑائے جا رہا تھا اور زنگ زنگ میں اسے لہراتے بھی لگا۔ پھر کئی سے ٹکٹے ہی ٹکٹے دانتہ کار کو موڑتے ہوئے بریک لگا دیے۔ کار زور سے چرچرائے اور پھر میں نے ایک وجود اک چھت سے ملے پونٹ پر اور بعد میں سڑک پر دیکھا۔ میں نے یک دم بریک پیڈل سے ہٹائے اور ایکسیلریٹر دبا دیا۔ اٹھائے راہ وہ ہرکا میرے خطرناک اور جان لیوا عزائم کا اندازہ سڑک پر لپٹے لپٹے پھرتی سے کنارے ہو گیا۔

زناٹے کے ساتھ اس کے قریب سے گزرتی ہل اسے اگر ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ یقیناً میری کا نیچے آ کر پکلا جاتا، مگر پھر دوسرے ہی لمے ساعتوں میں تلے اوپر دو تین گولیاں چلنے کی دما آوازیں ابھریں اور ساتھ ہی ایک کان پھاڑم اور میری کار ایک طرف کو جھک گئی۔ میں نے

اپنے دانت بھیج لیے۔ اس بد بخت ہرکارے کی کار کا ٹائر برسٹ کر ڈالا تھا۔ میں نے کار لی۔ اپنے خاص ہتھیاروں سے تو میں اب ہر کیس رہنے لگا تھا اس لیے اعشاریہ اڑتالیس کی اور ٹکالے میں کار سے بہ احتیاط اترتا تو مجھ پر لہاں داغی جانے لگیں۔ کار کے شیشے چھناکے سے لڑکچڑوں میں بکھر گئے۔ میں جلدی سے کار کی ہما ہو گیا۔ وہ ہرکارہ اپنے پستول میں نیا میگزین میں مصروف تھا۔ میں نے اس کا نشانہ لے کر ہمک دیا۔ گولی نہ جانے اسے کہاں لگی تھی کہ وہ اس جی مار کر سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت میں گاڑیاں میرے دائیں بائیں ابھر کر آکھڑی۔ میں پلٹا تو ان کے اندر سے راسکل کنگ کے ہرکارے اتر کر مجھے گھیرے میں لے چکے تھے۔

کی تعداد چندرہ سولہ سے کم نہ تھی۔ قہار اکھیل فٹش ہو گیا۔۔۔۔۔ مسٹر افتخار! ریوالور

”و۔“  
اک گرائڈیل ہرکارے نے اپنی کن مجھ پر تانے آفر کر کہا اور میں نے ایک گہری سانس لے کر طور سڑک پر پھینک دیا۔ اس نے اپنے دوستیوں کی ہرکارے کو سنبھالنے کا حکم دیا اور پھر مجھے پکڑ کر میں بٹھا دیا۔ میرے اندر سائیں سائیں ہو رہی۔ وہ مجھے نیوڈ کلب کے عقی گیراج نما گیٹ سے لے آئے پھر مجھے دھکے دیتے ہوئے نیچے ایک صف میں لے آئے۔

ایک شاہانہ طرز کا آرام دہ کمرہ تھا۔ سامنے سبز ل پر میں نے دو اشخاص کو دیکھا اور میری کتپنیوں لٹنا نہیں ہونے لگیں۔ ایک تو راسکل کنگ تھا جب دوسرا میرے بھائی کا قاتل سوانو تھا۔ وہ اب تیزی سمت یاب ہوتا نظر آ رہا تھا۔ دو نیم عرباں آئرش ٹائیں انہیں پیک سر دکر رہی تھیں۔

”آؤ۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔ افتخار! (افتخار) بیٹھو۔“ راسکل کنگ نشے میں ٹن ہو رہا تھا اور کم دیش یہی حال سوانو کا بھی تھا مگر راسکل کنگ کے لہجے میں بلا کا زعم آمیز گھمنڈ اور رعوت تھی۔ سوانو البتہ میری طرف بڑی کینہ توڑ نظروں سے گھورتا رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا۔

”ہمیں تمہاری دشمنی پر فخر ہے مسٹر افتخار! (افتخار)“ راسکل کنگ شراب کا ایک گھونٹ بھر کر میری طرف دیکھتے ہوئے اسرار بھرے لہجے میں بولا۔

”لیکن چیف! میرا جی چاہتا ہے اس حرام۔۔۔۔۔“  
”سوانو! اپنی زبان کو لگام دو۔۔۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔۔“ میں نے یک دم اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے غصے سے اس کی بات کاٹی۔ سوانو کو مجھ سے شاید اس جملے کی توقع نہ تھی۔ وہ بھی طیش کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ پھاڑ کھانے والے درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا راسکل کنگ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا اور ساتھ ہی مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو خونی نظروں سے گھورتے ہوئے آمنے سامنے کے صوفوں پر بیٹھ گئے۔

”میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں افتخار۔۔۔۔۔!“ وہ غصے سے دانت پیس کر بولا تو جواب میں بھی ترکی بہ ترکی اسے گھورتے ہوئے خوں ناک لہجے میں بولا۔

”تم مجھے چھوڑو نہ چھوڑو۔۔۔۔۔ مگر میں تم سے اپنے بھائی عالم خان کے قتل کا انتقام ضرور لوں گا۔“

”دیش انف۔۔۔۔۔ سوانو!“ اس بار راسکل کنگ نے دھاڑ کر اسے سرزنش کی اور سوانو تھلا کر رہ گیا۔ کیسٹ والا معاملہ طشت از بام ہوتے ہی اب سوانو بھی پولیس کی زد میں آچکا تھا۔

”چیف! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اس کتے کو کیوں ڈھیل دے رہے ہیں؟“ بلا آخر سوانو نے اپنے گرو گھنٹال سے تھلا کر کہا تو میں دھاڑ کر دوبارہ اسے



متنبہ کرتے ہوئے بولا۔

”سفید سورا میں کہتا ہوں زبان کو لگام دے۔“

”خاموش رہو تم!“ اس بار راسکل کنگ نے مجھے گھورتے ہوئے تنبیہ کی۔

”اپنے اس کتے سے کہو کہ یہ اپنی زبان کو لگام دے کر رکھے۔“

”چیف! بہت ہو گیا۔ اسے فوراً گولی مار دو۔“ اس بار سوانو نے معاندانہ جوش سے کہا۔

”نہیں سوانو! موت تو اس کے لیے معمولی سزا ہوگی۔ میں اسے ذہنی موت ماروں گا اور تماشا دیکھوں گا۔“ راسکل کنگ نے میری طرف گھورتے ہوئے انتہائی زہر خند لہجے میں سوانو سے کہا۔ پھر مجھے مخاطب کر کے بولا۔

”افتخار! تم نے مجھے بہت دق کیا ہے۔ بولو، تمہارا اب کیا حشر کیا جائے؟“ یہاں میں نے اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے مصلحتاً مفاہمانہ لہجے میں کہا۔

”راسکل! میری تم سے دشمنی نہ پہلے کبھی تھی نہ ہے مگر تم نے سوانو کے کہنے پر مجھے لندن بدر کرنے کی فضول کوششیں کی۔ مجھے آج بھی حیرت ہوتی ہے اس بات پر کہ تم جیسا انڈر ورلڈ ڈان اپنی سطح سے اتار کر کیوں کیا ہے؟ تم اپنے آپ سے پوچھو۔ کیا یہ بات تمہارے

مثالیان شان بھی کہ تم بلا دشمنی کے سوانو کے کہنے پر مجھے لندن سے بے دخل ہونے کی دھمکی دیتے۔“ میں نے اس کی ہجرانہ نفسیات پر بڑی استادی کے ساتھ حملہ کیا تھا۔ سوانو نے پھر درمیان میں بھونکنے کی کوشش کی تو راسکل کنگ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی تھوٹھی بند رکھنے کو کہا پھر میری طرف عجیب نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”تمہاری اسی بہادری نے مجھے بہت قائل کر رکھا ہے اور راسکل کنگ اپنے بہادر دشمنوں کی قدر کرتا ہے۔“

”کاش تم میرے بارے میں بار بار دشمنی کا لفظ استعمال کرنے کی بجائے دوست کا لفظ استعمال کرے تو مجھے بے حد خوشی ہوتی۔“ اس کی ہجرانہ غیرت و خاطر خواہ نفسیاتی ضرب لگاتے ہوئے میں نے مکاری سے کہا تو میں نے دیکھا کہ راسکل کنگ کے چہرے پہ پہلی بار ایک دوستانہ رنگ سا آ کر گزر گیا۔

”تم نے ایف بی آئی کے مائیکل ٹائیڈل کو بھی بڑی ذک پہنچائی ہے۔ تمہاری اس خوبی اور بہادری نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر ڈالا ہے۔ اس کا لہجہ بہت درج دوستانہ ہوتے پا کر میں نے پھر بہتر بدلا۔

”میں اپنی قدر دانی پر تمہارا مشکور ہوں۔ دراصل بہادر لوگ ہی بہادروں کی قدر کرنا جانتے ہیں مسٹر کنگ!“

”تمہاری کیا اب مائیکل ٹائیڈل سے دشمنی ختم ہوگی یا.....“ راسکل کنگ نے اچانک مجھ سے پوچھا تو میں اس کے لہجے سے فوراً بھانپ گیا کہ وہ بھی اپنے دل میں مائیکل ٹائیڈل کے خلاف بڑی دیرینہ عناد رکھتا ہے لہذا میں نے فوراً بیدار مغزی سے کام لے کر کہا۔

”دشمنی تو اب میری شروع ہوئی ہے مسٹر کنگ! جب تک میں مائیکل ٹائیڈل کو رسوا نہ کر دوں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔“

”ہوں..... مگر تم اس کا کیسے مقابلہ کر سکتے ہو؟ وہ تو اتنے بڑے محکمے کا چیف ہے۔“ راسکل کنگ نے کھوجنے کے انداز میں مجھ سے سوال کیا تو میں نے جواباً اپنے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”اس کی کمزوری میرے ہاتھ میں ہے۔ تم نے دیکھا نہیں تھا کہ میں نے اسے ذک پہنچائی تھی کہ وہ Suspend ہونے کے بعد Terminate ہوتے رہ گیا۔“

”ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔“ راسکل کنگ نے پہلا

ل کر اثبات میں سر ہلایا۔ ادھر ردیل صفت سوانو لہرے اور راسکل کنگ کے درمیان ہونے والی ہمتانہ گفتگو سے بے چین دکھائی دے رہا تھا۔

”کیسی کمزوری؟“ راسکل کنگ نے پوچھا۔

”اس کی بیٹی روزی! جو اپنے باپ کے کالے لڑکھوٹوں سے واقف ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایگزیکٹو راسکل! راسکل کنگ جیسے چٹا راکر والا۔“ میں سمجھ گیا تھا کہ تم اس کی بیٹی روزی کو اس کے خلاف ہتھیار بنا کر استعمال کرنا چاہتے ہو۔“ وہ بولا۔

”ہاں، مگر مجھ سے جلد بازی میں غلطی ہوگئی۔“ میں نے قدرے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ”دراصل میں مائیکل ٹائیڈل کے خلاف ایسا مضبوط جال بننا چاہ رہا ہوں کہ وہ اس بار خود کو نہیں بچا پائے گا، لیکن میں تمہاری

لاجھ کی دشمنی میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔“ میں نے آخر میں مکارانہ شکوہ کیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میرے ہاتھوں تمہارے کئی آدمی مارے گئے لیکن تم ذرا فراخ دلی سے سوچو تو میں تمہیں بے قصور نظر آؤں گا، کیوں کہ تم نے محض سوانو کے کہنے پر مجھے لندن سے بے دخل ہونے کی دھمکی دے ڈالی، حالاں کہ تم شاید نہیں جانتے کہ سوانو روزی کے حصول کے سلسلے میں تمہیں ایک فضول کام میں الجھانے کی کوششیں کر رہا تھا۔ میں روزی کو اس کے باپ کے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا جب کہ یہ بے وقوف اسے اپنا نا چاہتا ہے۔ کیا

پورے لندن میں ایک حسین لڑکی صرف روزی ہی رہ گئی ہے۔“ میری باتیں رفتہ رفتہ راسکل کنگ کے دماغ میں گھر گھر کرنے لگی تھیں۔ اپنے ذکر پر سوانو نے دانت بھیج کر مجھ سے کہا۔

”پوشٹ آپ!..... کیوں بند کرو اپنی۔“ پھر وہ راسکل کنگ سے بولا۔

”چیف! یہ بہت خطرناک حد تک چالاک شخص ہے۔“

اس کی باتوں میں مت آؤ۔ اسے فوراً گولی مار دو۔“ میں استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”اگر تمہارے چیف کو میری باتوں سے ذرا بھی چالاکی کی بو آ رہی ہے تو بے شک میں حاضر ہوں مگر تم محض اپنی محدود اور خود غرضانہ سوچ کی وجہ سے مائیکل ٹائیڈل کا کام آسان کر رہے ہو۔ اب جب کہ ایف بی آئی اور پولیس ڈیپارٹمنٹ کی نظروں میں تمہاری ہجرانہ حیثیت کھل کر سامنے آگئی ہے تو تمہاری روزی کو حاصل کرنے کی سوچ سر بہ سر فضول ہی ہوگی۔“

سوانو نے جواباً دانت پیس کر کوئی سخت بات کہنا چاہی تو راسکل کنگ نے اسے گھور کر دیکھا۔ سوانو اندر ہی اندر تھلا کر خاموش ہو گیا پھر راسکل کنگ اس بار متانت بھرے لہجے میں مجھ سے بولا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے ہمارے بہت سے آدمیوں کو بے دردی سے ہلاک کیا ہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے لیکن اگر تم اس کا ازالہ کرو تو پھر نہ صرف میں تمہیں معاف کر دوں گا بلکہ تمہاری طرف دوستانہ ہاتھ بھی بڑھاؤں گا۔“

”مجھے تم سے دوستی کرنے کی خوشی ہوگی مگر میں اس کا کیا ازالہ کر سکتا ہوں..... مسٹر راسکل کنگ!“ میں نے اس بار مکارانہ فروتنی سے کہا۔

وہ چند ثانیے خاموش رہا پھر چوکس انداز میں کھڑے اپنے مسلح ہر کاروں کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ لوگ سب سر جھکائے خاموشی سے نکلتے چلے گئے۔ ان سب کے کمرے سے نکلتے ہی راسکل کنگ نے وہاں موجود ان دونوں نیم عریاں آئرش گوریلوں کو بھی باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اب کمرے میں ہم تین باقی رہ گئے تھے۔ میں، راسکل کنگ اور سوانو۔

”افتخار.....!“ ذرا دیر کی اسرار بھری خاموشی کے بعد راسکل کنگ نے گہیر لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

”مائیکل ٹائیڈل نے ہمارا بھی جینا دو بھر کر رکھا ہے



اور اس نے نہ صرف ہمارے کئی نامیٹ کلبوں اور قمار خانوں کے لائسنس منسوخ کر ڈالے ہیں، بلکہ ہمارے بہت سے اہم ساتھیوں کو بھی گرفتار کر کے لے گیا تھا۔ جن کا آج تک کچھ نہیں پتا چل سکا۔" وہ لمحے بھر کورکا پھر بولا۔

"بہی نہیں، اس رذیل مائیکل ٹائیڈل نے میرے چھوٹے بھائی ٹیڈ کو بھی گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا ہے۔ تم اگر کسی طرح میرے بھائی ٹیڈ کو مائیکل ٹائیڈل کے شکنجے سے چھڑا لو یا صرف یہ پتا چلانے کی کوشش کرو کہ اسے کہاں قید رکھا ہے تو سمجھو تم نے میری دوستی کا حق ادا کر دیا۔"

"میں تمہاری بات سمجھ گیا۔" اس کی بات مکمل ہوتے ہی میں نے فوراً کہا۔

"میں کوشش کروں گا تمہارا یہ اہم کام کرنے کی، بلکہ مجھے یقین ہے کہ میں اپنی سی اس کوشش میں ضرور کامیاب بھی رہوں گا۔"

"ایکسیلیٹ! میرے پراعتماد اور مضبوط لہجے پر اس نے تو سنی لہجے میں کہا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اکھنڈ متانت سے میری طرف گھورتے ہوئے بولا۔

"ایک بات کا خیال رکھنا۔ تم اس سے پہلے بھی مجھے ڈانچ دے چکے ہو اور اس کا خمیازہ تم نے اپنے چھوٹے بھائی عالم خان کی موت کی صورت میں بھگتنا پڑا تھا۔ اگرچہ میرا ارادہ تمہارے بھائی کا قتل کرنا نہیں بلکہ اسے ریغمال بنا کر تمہیں جھکا نا چاہتا تھا، لیکن سوانو نے اپنی عادت کے مطابق غلط پسندی سے کام لیا اور۔۔۔۔۔"

اس نے ماحول میں کشیدگی طاری ہونے کے خیال سے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا، مگر اس کے لفظوں نے میرے سینے کے سنگتے ہوئے آتش فشاں کو دوبارہ بھڑکا دیا تھا لہذا میں راسکل کنگ کے قریب ہی بیٹھے غصے اور بے بسی کے مارے سوانو کو خوں رنگ نظروں سے گھورتے ہوئے راسکل کنگ سے بولا۔

"مسٹر کنگ! سوانو اور میرے درمیان تمہارا کیا فیصلہ ہے؟"

"ہاں۔ یہ فیصلہ بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا۔" وہ پھر وہ سوانو کو مخاطب کر کے بولا۔

"سوانو! چوں کہ تم نے میری ہدایت کے باوجود عالم خان کا قتل کر ڈالا تھا، اس طرح تم دوسرے جرم کا ڈا۔ ہوئے، لیکن میں تمہیں اتنی رعایت دوں گا کہ۔۔۔۔۔" کہہ کر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "تم دونوں کے درمیان انڈر گراؤنڈ "پٹ فائٹنگ" کا مقابلہ ہو، آہم دونوں "پٹ فائٹنگ" کے اصول سے اچھی طرح واقف ہو کہ یہ ایک طرح کی دعوت "مبارزت" ہوئی ہے جس میں دونوں حریفوں میں سے ایک کو یقینی موت سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے۔"

"مجھے منظور ہے۔۔۔۔۔ چیف مجھے منظور ہے۔" سوال ایک دم جوش بھری عناد سے بولا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک لالچی سفاکانہ چمک اتر آئی تھی۔ گویا اسے مجھ پر بڑا بد دوست ادھار تھا اور وہ مجھ سے فری اسٹائل پٹ لڑنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا یہ چھچھوندہ مجھے اتنا ہی تر توالہ کبے ہوئے تھا۔

"لیکن مجھے منظور نہیں ہے۔" میں نے پاٹ وا آواز میں کہا اور سوانو سے زیادہ راسکل کنگ بری طرح چونکا تھا۔ اسے شاید مجھ سے اس بزدلی کی توقع نہ تھی۔ "کیوں۔۔۔۔۔ مسٹر افتخار! کیوں کیا تم سوانو سے ڈرتے ہو؟" اس کے لہجے میں اجتہاد رعبے کی الجھن آمیز پریشانی تھی۔ میں اس کی بات پر ایک استہزاءمہ نظر سوانو پر ڈالتے ہوئے حقارت سے بولا۔

"بھلا میں اس چھچھوندہ سے کیوں ڈرنے لگا، مگر میرے انکار کی وجہ کچھ اور ہے مسٹر راسکل کنگ!" "کون سی وجہ؟"

"وجہ یہ کہ سوانو زخمی رہ چکا ہے اور میں اتنا بزدل نہیں

ہوں کہ لزور و من سے دو بہ دو مقابل کروں۔۔۔۔۔ میں نے گہری متانت سے کہا۔

"گڈ! اب میں تمہاری بات سمجھا، مگر پھر اب کیا؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"اس کا آسان حل یہ ہے کہ پٹ فائٹنگ کے اران سوانو کو غیر آتشیں دھاتی ہتھیار ملنا چاہیے جب کہ میں نہتا اس سے مقابلہ کروں گا۔" میری بات پر ہالو کی آنکھوں کی سفاکانہ چمک مزید گہری ہو گئی اب کہ راسکل کنگ الجھ کر رہ گیا، جیسے اسے میری اس بیڑ پر عار محسوس ہو رہی ہو۔ میں جانتا تھا کہ راسکل کنگ کے مفاد میں میرا ہار کر مرنا نہ تھا۔

"مگر تم سے یہ نا انصافی ہے۔"

"یہ نا انصافی نہیں ہے مسٹر راسکل کنگ!" میں نے گہری متانت اور پراعتماد لہجے میں کہا۔ "بلکہ اس طرح مجھے اور سوانو کے درمیان طاقت کا توازن برقرار رہے گا۔"

"تم اور راسکل کنگ کا شکار ہو رہے ہو۔ مسٹر افتخار!"

راسکل کنگ نے جیسے مجھے خبردار کیا۔

"یہی ایک طریقہ ہے، اگر منظور ہے تو ٹھیک درندہ

لہجے میں نے انکار یہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو راسکل کنگ لمحے بھر کی پرسوج خاموشی

کے بعد ایک گہری ہنکاری بھرتے ہوئے بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔"

☆

"پٹ فائٹنگ" کی ابتدا امریکا کے انڈر گراؤنڈ ورلڈ سے شروع ہوئی تھی۔ یہ ایک غیر قانونی فری اسٹائل لڑائی تھی، جس میں ایک حریف کو یقینی طور پر موت کے گھاٹ اتارنا پڑتا ہے۔ اس کی مختصر تاریخ رے برڈی کے دور سے تعلق رکھتی ہے۔ رے برڈی انڈر ورلڈ مافیا کے بے تاج بادشاہ تھا۔ اس کے گرد وہ میں اگر کسی کی آپس میں جانی دشمنی ہو جاتی تھی تو وہ فوراً پٹ فائٹنگ کا

سم صادر کر دیا کرتا تھا۔ یہ فیڈوں کے لیے ایک مہم تھی، مگر ڈنک کی تاریخ خاصی پرانی تھی۔

رے برڈی کا درحقیقت پٹ فائٹنگ کا مقابلہ کروانا ایک طرح سے دونوں فریقوں کے لیے سزا کا بھی درجہ رکھتا تھا۔ ظاہر ہے دونوں فریقین میں سے کسی ایک کو ہلاک ہونا پڑتا تھا اس لیے ان پر نفسیاتی خوف بھی طاری ہو جایا کرتا تھا اور یوں وہ آپس میں لڑنے جھگڑنے سے اعراض واجتناب ہی برتا کرتے تھے۔ بہر طور بعد میں پٹ فائٹنگ شائقین کے لیے رفتہ رفتہ ایک سنسنی خیز کھیل بن کر رہ گئی۔ بعد میں یہ سوت کا کھیل امریکا سے لندن آچکا، ساؤتھ افریقہ، آئرلینڈ اور دیگر یورپی ممالک میں زہری کی طرح سرایت کرتا چلا گیا۔ اس پر دگرام میں شریک ہونا بھی جرم تھا۔ اگرچہ میں چوری چھپے پٹ فائٹنگ کے دو تین کھیل دیکھ چکا تھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے، پھر میں نے اس لغو اور جان لیوا موت کے کھیل پر لعنت بھیج دی تھی۔

لیکن آج جب کہ میں اپنے چھوٹے بھائی عالم خان کے قاتل سوانو کے سامنے تھا تو مجھے پٹ فائٹنگ کی افادیت کا احساس ہوا، مگر اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ میں پٹ فائٹنگ جیسے خون ناک کھیل کے حق میں تھا۔ درحقیقت پولیس ڈیپارٹمنٹ میرے بھائی عالم خان کے بے گناہ قتل پر جانب داری اور تسال سے کام لے رہی تھی اور میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ سوانو کو چوں کہ راسکل کنگ جیسے انڈر ورلڈ ڈان کی آشریاد حاصل تھی اس لیے جب تک سوانو اپنے گرد گھنٹال راسکل کنگ کے پروں میں چھپا بیٹھا تھا پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی، اس لیے اب مجھے اپنے بھائی کے قاتل سوانو کو جہنم واصل کرنے کا اچھا موقع ہاتھ لگا تھا۔

☆

پٹ فائٹنگ کا انتظام دالغرام کلب کے زیر زمین ایک وسیع ہال میں کیا گیا اور میں یہ دیکھ کر ششدر رہ



گیا۔ شائقین کی بیشتر تعداد اسے دیکھنے کے لیے جوق در جوق آ رہی تھی۔ وہ لوگ باقاعدہ ٹکٹ خرید رہے تھے۔

وسط میں پٹ فائٹنگ کی جان لیوا لڑائی کے لیے خاصا بڑا حصہ چھوڑ رکھا تھا اور اس کے چاروں طرف شائقین کے بیٹھنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ درمیان میں تقریباً بارہ فٹ اونچا آہنی تاروں کا جال سا ایستادہ کر رکھا تھا۔

راسکل سنگ نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا تھا کہ شائقین کے لیے یہ مقابلہ انوکھی نوعیت کا تھا جس میں سوانو جیسے تربیت یافتہ پٹ فائٹر کے مقابلے میں میرے جیسا ایک ایشیائی نوجوان تھا۔ کیوں کہ راسکل سنگ مجھے سوانو کے بارے میں یہ حقیقت پہلے ہی بتا چکا تھا کہ وہ رذیل اور حد درجہ سفاک انسان متواتر نو بار یہ مبارزت پٹ فائٹنگ جیت چکا تھا یعنی تو افراد کو بڑی سفاکی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

گویا ”اکھاڑے“ میں اترتے ہی جانے کیوں پہلی بار مجھے اپنے وجود میں موت کی سی سنسناہٹ کا احساس ہونے لگا مگر میں نے فوراً اپنے اعصاب پر قابو پالیا۔ پنڈال میں نیم تاریکی کا سا سماں تھا لیکن اکھاڑے میں اسپاٹ لائٹس روشن تھیں۔ ہم دونوں کو میدان میں اتار دیا گیا تھا۔ ہال میں تالیوں اور Cat Calling کا بے پناہ ہم آہنگی ابھرا۔ وہ سب سوانو کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ گویا پٹ فائٹنگ کی دنیا میں سوانو بہت بڑا لڑاکا رہا ہو اور اس میں شبہ بھی نہ تھا کہ سوانو اس میدان کا پرانا کھلاڑی رہ چکا تھا جب کہ میں اس کے مقابلے میں نو آموز تھا، مگر صرف ”پٹ فائٹنگ“ کے میدان میں نو آموز، ورنہ تو میں بھی بڑے بڑے تربیت یافتہ خطرناک دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا چکا تھا اور اس میں سوانو بھی شامل تھا۔

اسی لمحے ہال میں ایک چھناکے دار آواز ابھری اور میں نے دیکھا کہ سوانو کے قریب ایک Smooth طرز کی تلوار اور دوسرا دودھار چھرا آ پڑا، جسے سوانو فوراً اٹھالیا۔ اب وہ بڑی کینہ توڑ اور خون آشام نظروں سے میری طرف گھور رہا تھا۔ دودھاتی ہتھیاروں کے پھل تیز اسپاٹ لائٹ میں چمک رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ سوانو کو دھاتی ہتھیار دینے کا میرا فیصلہ درست تھا کیوں کہ اس کے قدموں میں تھوڑی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے والے زخمی درندوں کی طرح گھورے جا رہے تھے۔ ہال میں موجود لوگوں کو جیسے سانپ سگھ گیا تھا۔ یہ ایک موت کا میدان تھا، جہاں موت کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ یعنی موت کا۔۔۔ دونوں میں سے ایک کو لازماً مرنے کا۔

میں اور سوانو ایک دوسرے کے گویا ازلی جانی دشمن تھے۔ وہ مجھے ہلاک کرنے کے لیے بے چین تھا اور میں اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے بے تاب۔ دفعۃً ہال میں ”ریڈی“ کی گونجی آواز ابھری اور سوانو لپک کر تلوار اور چھرا اپنے دونوں ہاتھوں میں تولے کھل کی طرح میری طرف لپکا۔ میں محتاط انداز میں ایک طرف ہو گیا۔ وہ آگے نکل جانے کی بجائے یک دم جم گیا۔ ہم دونوں ایک لمحے خوں خوار نظروں سے ایک دوسرے کے چہروں کو گھورتے رہے۔ پھر اس کے بعد سوانو نے مارشل آرٹ کے انداز میں ایک جست بھری اور ساتھ ہی یہ ایک وقت تلوار اور چھرا لہراتا ہوا آسمانی بجلی کی طرح مجھ پر کڑکا۔ میں نے فوراً جھکا کی دی اور اس نے اپنا وار خالی جاتے دیکھ کر چھرا میری طرف پھینکا۔ ”شپاشپ“ کی سنسناتی آواز کے ساتھ چھرا میری طرف لپکا، مگر میں فرش پر لٹو کی طرح گھوم گیا۔ چھرا میرے چہرے سے چند ایک انچ کے فاصلے پر ٹائٹس کی آواز سے نکل گیا۔ سوانو کا یہ بہت حد تک

خطرناک وار تھا، کیوں کہ جس اسٹاک سے اس نے چھرا میری طرف پھینکا تھا وہ چشم زدن میں میرا سر قلم کر سکتا تھا۔ اپنا یہ بھی وار خالی جاتے دیکھ کر سوانو جھنجھلاہٹ میں جھلا ہو گیا اور یہی میں چاہتا تھا کہ اس کی ہوشیاری اور محتاطی جھنجھلاہٹ کی زد میں آ جائے چنانچہ وہ تلوار سونت کر میری طرف بڑھا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا اور اپنی جنگلے سے پشت نکا دی اور ساتھ ہی چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کے آثار بھی طاری کر لیے۔ سوانو میری بے بسی والی اداکاری پر سفاکی کے ساتھ مسکرایا اور تلوار کا ایک بھرپور وار مجھ پر کیا۔ میں نیچے جھک گیا۔ تلوار اپنی جنگلے سے گرائی اور چنگاریاں سی اڑیں۔ میں نے جھکتے ہی سوپ کیا اور سوانو دھڑام سے نیچے آ رہا۔ ہال میں ایک پر جوش شور ابھرا۔ اب میں سوانو کو موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کم بخت بلا کا لڑاکا ہی نہیں تلوار بازی میں بھی ماہر تھا۔ میں چپیتے کی طرح غرا کر اس پر جھپٹا اور اس کی تلوار چھیننے کی کوشش کی۔ اس نے فرش سے اٹھنے کی کوشش کی بجائے تلوار لہرا دی۔ یہاں میں اپنے جوش آمیز زعم میں مار کھا گیا اور اس کی تلوار نے میرے بائیں بازو پر بے رحم چرکا لگا دیا۔ اذیت کی ایک سنسناتی لہر میرے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ اگر میں اپنے زخم کو پکڑ کر بیٹھ جاتا تو مار کھا جاتا لہذا میں نے ایک لمحہ بھی اس کی پروا نہ کی اور سوانو کے چہرے پر لات رسید کر دی۔ اس کے حلق سے اوغ کی بدہیت آواز ابھری اور میں نے اسے موقع دیے بغیر دوسری لات اس کے تلوار والے ہاتھ پر رسید کر دی۔ نتیجتاً تلوار بھی اس کے ہاتھ سے نکلتی چلی گئی۔ وہ اب بالکل نہبتا ہو گیا تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا تو اس رذیل نے اپنے سر کی ٹکر میری ناک پر جڑ دی۔ میری آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے۔ پھر جب تک میں سنبھلا اس نے اپنا گھٹنا میرے پیٹ پر رسید کر دیا۔ میں دھری نکالیف کے باعث رکوع کے بل جھکا تو اس نے

دوبارہ اپنے گھٹنے کی ضرب میری مغزوب ناک پر رسید کر دی۔ ابھی پہلے والی ضرب سے ہی نہیں سنبھل سکا تھا کہ میرے ذہن میں تار کی چھانے لگی۔ سوانو کی متوقع جیت پر ہال میں جوش و خوشی سے جھم دھاڑ بج گئی۔ گویا شائقین سوانو سے توقع رکھے ہوئے تھے کہ وہ اس پٹ فائٹنگ میں اپنے دسویں شکار یعنی مجھے جیت کر ڈالے۔ سوانو اب مجھے ایک لمحے کے لیے بھی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے فرش پر گرا لیا اور پھر میرے پیٹ اور کمر کے گرد اپنی دونوں ٹانگوں کی قینچی پھنسا لی۔ یوں میرا اوپر کا سانس اور پر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ میں سخت اذیت محسوس کرنے لگا۔ وہ اپنی دونوں ٹانگوں کی قینچی سے میرا پیٹ دبائے جا رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے مگر اس کے لیگ لاک نے جیسے میرے وجود کی ساری طاقت سلب کر لی اور میرا سانس تک لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ میرا سر ناک پر لگنے والی پے در پے ضربات کے باعث اب تک چکرا رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں ہوش دھواں سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہوں۔ میرا بے ہوش ہونا موت کے مترادف تھا۔ پھر اچانک میری ڈوبتی آنکھوں میں اپنے چھوٹے بھائی عالم خان کا چہرہ ابھرا، جو مجھ سے ٹکڑے کر رہا تھا۔ ”ادا سائیں! کیا تم میرے قاتل کو زندہ چھوڑ دو گے۔ تم تو ایسے موفتے کے منتظر تھے کہ میرا قاتل اور تمہارا دشمن تمہارے دو بہ دو ہو۔“

اچانک میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ میں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے پیچھے اور پھر اپنے ٹکست خوردہ سے وجود کی رہی سہی قوت کو جیسے اپنے دونوں بازوؤں پر منتقل کر کے میں نے دونوں ہتھیلیاں فرش پر جمائیں اور کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

سوانو اپنی دونوں ٹانگوں کا کھنبہ میرے پیٹ اور کمر کے گرد بہ دستور کسے ہوئے تھا اور دباتا جا رہا تھا جب کہ میں سوانو پر ایک خطرناک داؤ آ زمانے کے پرتول



رہا تھا، لیکن اس داؤ کو آزمائے کے لیے مجھے دانتوں تلے پسینہ آ رہا تھا، مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور بالآخر انتہائی کوشش اور مضبوط قوت ارادی کے باعث میں اپنی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اب سوانو کی پوزیشن یہ تھی کہ وہ سر کے بل ہو چکا تھا۔ میں نے فوراً ہی اپنی دونوں ٹانگوں پر گول گھوسنا شروع کر دیا۔ یوں سوانو بھی چکرانے لگا۔ میرے گول گھوسنے کی رفتار بہت تیز تیز ہونے لگی اور پھر میں نے گول گھوسنے آہنی جنگلے کے ساتھ سوانو کو کھرا دیا۔ سوانو کے حلق سے دل خراش چیخ نکلی اور پورے ہال کو سانپ سوکھ گیا۔

سوانو کا سر آہنی جنگلے سے ٹکرایا تھا۔ وہ ہٹ کر کے گرا۔ کھنجر ٹوٹ چکا تھا۔ میں چند لمحوں کے جنگلے کا سہارا لیے ٹھٹھا سا کھڑا کمرے کمرے سانس لینے لگا۔ میری ناک سے خون بہہ کر چہرے کو دھشت لہو رنگ بنا رہا تھا اور یہی حال سوانو کا بھی تھا۔ اس کا سر اور پیشانی پھٹ گئی تھی۔ سرخ اور گاڑھے خون کے باعث اس کا چہرہ دھشت انگیز نظر آ رہا تھا۔ پھر میری طرح اس نے بس اپنی چوٹ پر قابو پایا اور جنگلے کا سہارا لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں ایک بار پھر ہال کے وسط میں آ کر دوبارہ دو ہو گئے۔ ہال میں پھر شور مچا۔ بیشتر شائقین سوانو کو ہلا شیر دے رہے تھے۔ کچھ چلا چلا کر میری ہمت بھی بڑھا رہے تھے۔

سوانو غرا کر میری طرف لپکا۔ اس بار میں نے جھکا کر دینے یا پرے ہٹنے کی بالکل سستی نہ کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اب میری طرح بالکل ٹھٹھا ہو چکا تھا۔ وہ جیسے ہی زخمی درندے کی طرح غراتا ہوا مجھ پر جھپٹا میں بھی اس پر جھپٹ پڑا۔

ہم دونوں اب ٹھٹھا حال ہونے کے قریب ہو گئے تھے۔ سوانو کے لیے یہ بات باعث ذلت تھی کہ وہ دھاتی ہتھیاروں کے باوجود مجھے ابھی تک زیر نہیں کر سکا تھا۔ بہر طور ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور ایک

دوسرے کو بچاڑنے کی سرٹوڑ کوستیں کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ سوانو غضب کا لڑا کے ہار فٹس تھا، مگر میں بھی اپنی جگہ ایک بھر پور کھڑا کھڑا تھا۔ ایک موقع پر سوانو نے اپنے دونوں ہاتھ فرش پر ٹکائے اور پشت کو مکان کی صورت میں کھڑا کر اس نے اپنی دونوں ٹانگوں کا وہی پرانا داؤ میری گردن پر آزمایا اور مجھے نیچے گرا دیا۔ اس کا یہ داؤ مجھے پل بھر میں بے بس اور جینی موت سے ہم کنار کر سکا تھا اس لیے میں نے گرتے ہی سنبھالا لیا۔ ابھی اس کا نیک لاک میری گردن پر مضبوطی سے گرفت نہیں جتا پایا تھا لہذا میں نے بجلی کی طرح تڑپ کر اپنی ایک ٹانگ سیکڑ کر اس کی ناف سے نیچے نازک مقام پر جڑی۔ اس کے حلق سے تیل جیسی خوف ناک ڈکراہٹ ابھری، پھر جیسے ہی اس کی دونوں ٹانگوں کی گرفت میری گردن پر کمزور پڑی میں نے فوراً اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا اور اسے گول چکر دیے لگا۔ ہال میں شور مچا۔ سوانو کا وجود کسی کھلونے کی طرح سر کے بل گولی چکر کھار ہوا تھا۔ وہ بالکل بے بس ہو چکا تھا۔ ایک آخری زوردار چکر دے کر میں نے اس کی دونوں ٹانگیں چھوڑ دیں۔ وہ ہوا میں اڑتا ہوا دائرہ نما آہنی جنگلے سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے ابھرنے والی چیخ بہت بھیانک تھی۔ مجھ پر دھشتانہ جنون طاری ہو گیا تھا۔ میں غراتا ہوا پھر اس کی طرف جھپٹا اور اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر کمرے کے بل موڑنے لگا۔ میری دھشت لہو رنگ آنکھوں کے سامنے میرے چہرے بھائی عالم خان کا چہرہ بار بار گردش کرنے لگا۔ سوانو پیٹ کے بل پڑا چھین مار رہا تھا۔ میں اس کی ٹانگ پر اپنے پورے وجود کا وزن ڈالے جا رہا تھا۔ اچانک زبردست کڑا کے کی آواز ابھری اور سوانو کے حلق سے جگر پاش چیخ خارج ہو گئی۔

”سوانو!۔۔۔ تم نے میرے معصوم بھائی عالم خان کے علاوہ پروفیسر مالکھم کا بے گناہ خون کیا۔۔۔ اب

ترپ تڑپ کر مرنے لگے لیے تیار ہو جاؤ۔“ میں دھشت خون رنگ لہجے میں اس سے غرا کر بولا۔ وہ بھی بلا کا سخت جان ثابت ہوا تھا۔ اس نے اپنی روح فرساد اذیت کو بھلا کر دوسری ٹانگ میری چنڈیوں پر رسید کر دی۔ میں دھڑام سے نیچے گرا۔ وہ میرے اوپر آ گیا۔ اس کی ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی مگر اس نے میرے سینے پر سوار ہوتے ہی اپنے دونوں ہاتھوں سے میری گردن دیوچ لی۔ اس میں اب بھی بلا کی طاقت تھی۔ اپنی گردن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت مجھے یوں محسوس ہونے لگی جیسے وہ آہنی کھنجر ہو۔ مجھے اپنا دم کھٹکا محسوس ہونے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلاسیاں پکڑ لیں اور اس کے ہاتھوں کا کھنجر کھولنے کی کوششیں کرنے لگا۔ وہ پہلے ہی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹنے سے بلبلایا ہوا تھا مگر باوجود اس کے مجھے بڑی طاقت صرف کرنا پڑ رہی تھی۔ زور آزمائی کے دوران میں پیچھے میں نہ گیا، مگر بالآخر اس کے دونوں ہاتھوں کا کھنجر کھولنے میں کامیاب بھی ہو گیا اور پھر میں نے اسے بڑی زور سے دوسری طرف اچھال دیا۔ اب میں اس کے اوپر تھا اور اس کی گردن دیوچ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھیں باہر ابل پڑیں اور پھر اس نے ایک جھٹکا لیا پھر ٹھٹھا اٹھا رہا تھا۔

پورا ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ میں ایک طرف کھڑا ہری طرح ہانپ رہا تھا۔

☆  
سوانو کو اپنے ہاتھوں سے جہنم حاصل کرنے کے بعد جیسے میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ جان ٹائٹل کے بعد میرے بھائی کے ایک اور قاتل سوانو کا بھی قصہ پاک ہو چکا تھا۔ باقی رہا راسکل سنگ!۔۔۔ اس پر ابھی میرا ادجار باقی تھا۔

اگرچہ وہ براہ راست میرے بھائی کے قتل میں ملوث نہ تھا لیکن بہر حال اس نے ہی میرے بھائی عالم خان کو

غوا کرنے میں سوانو کی سپورٹ لی تھی، میرے بھائی عالم خان کے قتل کے سلسلے میں اس کا خاص ملوث تھے۔ سوانو ہاں ٹال لال اور اس کا دو کو میں نے؟ ہم اصل کرنا تھا اب ہائی رائلنگ بچا تھا، مگر قتل کا اصل مجرم سوانو ہی تھا۔ بہر طور اس سنگ نے مجھے فتح پر مبارکباد دی۔

میں اس کے ہمرے ایک کمرے خاص میں آ گیا جہاں میری ہلکی پھلکی حصار داری کر کے والی نمین حد دیکھ کر چڑیاں موجود تھیں۔ میں ایک آرام دہ کانا بیچ پر لونا آنکھیں موندے اپنی ”ادور ہالنگ“ کراتا رہا تھا۔

☆

میں لیڈز یونیورسٹی کیسپس پہنچا تو روزی میرے کمرے میں موجود تھی۔ (کمرے کی ایک ڈیپٹی کیت چابی میں نے اسے دے رکھی تھی) وہ مرہم پٹیاں دیکھ کر یک دم پریشان ہو گئی اور فوراً متوحش لہجے میں بولی۔

”انی! انی!۔۔۔ یہ کیا ہوا۔ کس نے تمہیں مارا۔۔۔ تم ٹھیک تو ہونا؟“  
اس کا مشرقی لڑکیوں کی طرح پریشان ہونا میرے دل کو بھا گیا۔ میں مسکراتے ہوئے اس سے بولا۔  
”سوانو نے مارا تھا مجھے۔“

”او۔۔۔ مائی گاڈ!“ وہ مزید ہراساں ہو گئی۔  
”زیادہ چوٹ تو نہیں آئی تمہیں؟“

”دیکھ لو۔ تمہارے سامنے ہوں۔ As it is“ میں نے چپکتے ہوئے کہا۔

”او۔۔۔ انی! ایک تو تم کسی معاملے میں سنجیدہ ہی نہیں ہو کر دیتے۔“ وہ جھلا کر بولی تو مجھے پھر شرارت سوچھی۔

”کم از کم تم سے شادی کے معاملے میں تو ضرور سنجیدہ ہوں۔“

وہ ایک بار پھر مشرقی عورتوں کی طرح شرما گئی۔ بے



اختیار اس کے سرخ بھرے بھرے گدازلیوں پر حیا آمیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مجھے اس کا یہ مشرقی انداز بہت اچھا لگتا تھا۔

میں اپنی رانگ چیر پر بیٹھ گیا اور بالا خراسے ساری روداد بتادی، جسے سن کر وہ ایک لمحے کو بت بنی میری طرف نگہ رہ گئی۔

”کنگ..... کیا..... تم نے اس موڈی سوانو کو ختم کر ڈالا؟ وہ غیر یقینی انداز میں خوشی سے بولی تو میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں..... نہ صرف یہ بلکہ میں راسکل کنگ سے بھی دوستی کر آیا ہوں۔“

”تمہیں کم از کم راسکل کنگ جیسے اڈر ورلڈ کینکسر سے دوستی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ وہ ایک نمبر کا بد معاش اور چلر ہے۔“ وہ پر تشویش لہجے میں بولی۔

”تم کیا اپنے انی کو کم کینکسر سمجھتی ہو؟“ میں نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”ہاں، کیوں کہ تم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان ہو اور وہ ایک پورے گروہ کا بگ چیف ہے۔“ وہ بولی۔

”اؤم آن..... روزی! ناؤ اگنور دس ٹاپک!“ میں اس کے گرد ایک جال بنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ہاتھی ہے اور میں اپنے آپ کو اس کی نظروں میں چھوٹی ظاہر کر کے اسے ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا تم بھول گئے انی! کہ تم نے پہلے ہی اسی طرح راسکل کنگ جیسے سفاک انسان کو ڈاج دینے کی کوشش کی تھی اور بعد میں اس کا انجام تمہارے چھوٹے بھائی عالم خان کی لاش کی صورت میں ہوا تھا۔“ روزی نے بڑی بے رحم حقیقت سے مجھے آگاہ کیا۔

”ہاں، لیکن اس بار صورت حال ذرا مختلف ہے۔“ میں نے پرسوج لہجے میں کہا۔ ”وہ دراصل مجھ سے ایک انتہائی اہم کام لیتا چاہتا ہے۔ اس بار ہم دونوں کے

ڈانڈے ملتے جلتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا دشمن مشترک ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے روزی کو اصل بات سے آگاہ کر دیا۔ وہ پہلے تو چند ثانیے صمم صمم ہی رہی پھر میرے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کیے ہوئے اسرار بھرے لہجے میں بولی۔

”کیا تم دونوں مل کر میرے پاپا کو ہلاک کرنا چاہتے ہو؟“

روزی کے اس بھید بھرے لہجے پر میں نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بلاشبہ وہ ایک ذہین و فطن لڑکی تھی۔

”ہاں..... مگر ہم تمہارے پاپا کو ہلاک کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ صرف راسکل کنگ کے چھوٹے بھائی ٹیڈ کو اس کی قید سے آزاد کرانا چاہتے ہیں اور بس.....“

”ٹیڈ اگر راسکل کنگ کا چھوٹا بھائی ہے تو کیا..... تم سمجھتے ہو کہ وہ ایک شریف انسان ہوگا، جو تم نے اسے ایف بی آئی کی قید سے چھڑانے کا فیصلہ کیا؟“ روزی کے لہجے میں جانے کیوں مجھے طنز کی ہلکی کاٹ سی محسوس ہوئی تھی۔

”I Know That“ میں نے کہا۔ ”میں درحقیقت تمہارے پاپا سٹر مائیکل ٹائیڈل کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہوں اور راسکل کنگ کو ڈاج دے کر اسے تحفتاً تمہارے پاپا کو دینا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

روزی لاکھ اپنے باپ سے متفرس سی مگر بہر حال وہ اس کی بیٹی تھی اور مائیکل اس کا باپ۔

”مگر پاپا تمہارا یہ قیمتی تحفہ قبول کرنے کے باوجود تمہاری طرف ہرگز دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھائیں گے، کیوں کہ میں ان کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔“ روزی بالکل سپاٹ لہجے میں بولی۔

”پاپا کے دل و دماغ میں تمہارے خلاف غضب کا کینہ بھرا ہوا ہے۔ وہ کسی صورت بھی تمہاری طرف

نہیں بڑھائیں گے، التام دھر لیے جاؤ

..... اب یہ گورکھ دھندہ چھوڑ دو۔ ہماری

تم ہونے میں تھوڑا ہی عرصہ باقی بچا ہے۔

مالی مکمل کرتے ہی پاکستان چلے چلیں

ہیں۔“

برقی لہجے میں اس کی روایتی ضد آمیز بندی

لی تھی۔

تم درست کہتی ہو۔“ میں نے غیر مرمی نقطے پر

مرکوز کرتے ہوئے پر خیال لہجے میں کہا۔

☆

نے روزی کو ابھی ”اسالٹ وائرس“ کے لے اور پروفیسر یونزال کے خطرناک عزائم کے اندیشہ نہیں بتایا تھا البتہ ایلیز کے مشورے کے میں نے سر دست یہی بہتر سمجھا تھا کہ اسالٹ کے منصوبے کو ادھورا ہی چھوڑ دوں گا۔ یہ ان میں جان بوجھ کر خود کو ایک نئے کھڑاگ میں کے مترادف ہوگا۔

لی پڑھائی ختم ہونے والی تھی اور مجھے اس سال امتحان پاس کرنا تھا، کیوں کہ میری اسکا لرشپ چھ ماہ میں نے جو بانڈ بھرا تھا اس کی مدت بھی ختم الی تھی اور اس میں توسیع بھی ممکن نہ تھی۔ چھ ماہ میں آگے اپنے ذاتی خرچ پر پڑھائی جاری رکھ کر میں اسکا لرشپ کے بانڈ کی مدت کے ہی اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتا تھا، ورنہ میرے تعلیمی سے اسکا لرشپ کی مہرمت سکتی تھی۔

حال راسکل کنگ کے چھوٹے بھائی برڈو ٹیڈ کو ٹائیڈل کی قید سے چھڑانے والا معاملہ..... وہ

ی کر سکتا تھا۔ میں نے اب اپنی تمام تر توجہ اپنی

پر مرکوز کر دی تھی۔

میر میں نے پروفیسر یونزال کے ہاں بھی جانا چھوڑ

دیا تھا اور میں جس اسالٹ وائرس کے فارمولے پر کام کر رہا تھا اور اب تک جتنا کام مکمل ہو چکا تھا اس کی ایک فلاپی بنا کر باقی سارے کاغذی فارمولے تلف کر چکا تھا۔ اسالٹ وائرس کے فارمولے کا تقریباً پچھتر فی صد کام مکمل ہو چکا تھا۔

جب کہ ادھر راسکل کنگ بھی متواتر مجھ سے رابطے کیے جا رہا تھا کہ میں نے اس کے کام کو کس حد تک آگے بڑھایا تھا۔ میں اسے بھی بڑی خوب صورتی کے ساتھ بتاتا جا رہا تھا، البتہ پروفیسر یونزال کراڈاپ تو جیسے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ایک روز سیدھا میرے کیمپس میں آدھمکے۔

”یہ تمہیں اچانک کیا سوچھی افتخار کہ تم اپنے فارمولے کو آخر میں ادھورا چھوڑ کر یوں آرام سے بیٹھ گئے ہو؟“ وہ چھوٹے ہی بولے۔ اس وقت روزی وہاں موجود نہ تھی۔ وہ اپنے روم میں تھی۔ یوں بھی اگر وہ وہاں ہوتی تو پروفیسر یونزال فارمولے کی بات اس کے سامنے کبھی نہ چھیڑتا۔ اب میرا پروفیسر یونزال جیسے گرم باراں دیدہ و جہاں دیدہ شخص کو مطمئن کرنا لازمی تھا لہذا محتاط لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

”سرا..... اس کی ایک اہم وجہ ہے؟“

”وائس میٹر.....؟“

”سرا..... درحقیقت میرا تھیسس آخری مراحل پر آچکا ہے۔ اس کے ساتھ بے بانڈ کی مدت بھی پوری ہونے والی ہے، اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ آخری امتحان میں کامیاب ہو کر رہوں۔“

”بانڈ سے کیا ہوتا ہے؟ تم ایک بہت بڑے لینڈ لارڈ کے بیٹے ہو، اپنے ذاتی خرچ پر بھی تعلیم جاری رکھ سکتے ہو۔“

”نہیں سرا“ میں نے پرستانت سے کہا۔

”اسکا لرشپ کا لیبل میرے تعلیمی کیریئر کے لیے

باعث فخر ہوگا۔“



”یہ تم بچوں والی بات کرنے لگے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہیں اپنے ادمورے فارمولے پر فوراً کام شروع کر دینا چاہیے۔“

مجھے پروفیسر یونزال کی خود غرضی پر غصہ تو بہت آیا، مگر میں پی گیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں اس کی مکروہ اصلیت سے واقف ہو چکا تھا۔

”سوری سر میں پہلے اپنے فائل تھیمس پر کام ختم کروں گا، اس کے بعد ہی فارمولے کا بقیہ اور ادمورا کام شروع کروں گا۔“ میں نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا تو وہ چند ٹاپے میری طرف عجیب پراسرار نظروں سے دیکھتا رہا، جیسے میرا اندر بھاپنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے بعد وہ ایک گہری ہکاری خارج کر کے بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے لیکن۔۔۔ تم نے تو تجربہ گاہ سے اپنے ادمورے فارمولے کے کاغذات ہی سمیٹ لیے ہیں۔ میں چاہتا ہوں جب تک تم اپنی تعلیم سے فارغ نہ ہو۔۔۔ میں تم سے Hint لے کر اس فارمولے کو مکمل کرنے کی کوششیں کرتا رہوں۔“

اس کی مکاری پر میں اندر ہی اندر کھول اٹھا، مگر میں اپنے لہجے اور انداز و اطوار سے کسی طور پر بھی برہمی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ صورت دیگر وہ شاطر انسان میری طرف سے تشکیک میں مبتلا ہو کر میرے لیے پریشانی کمزری کر سکتا تھا، لہذا میں نے کھلے دل سے مسکراتے ہوئے رضامندی ظاہر کر دی اور کہا کہ میں کسی وقت اسالٹ وائرس کے ادمورے فارمولے کی تصویر بننے لے کر ان کے ہاں حاضر ہو جاؤں گا۔

وہ متذبذب کیفیات کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میرے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ دراصل میں اسے غلط سلسلہ تصویر دینا چاہتا تھا جسے تا قیامت اس کے فرشتے بھی مکمل نہیں کر سکتے تھے۔

حالات یہ ظاہر معمول پر آچکے تھے۔ وہ اور سوانو کا ٹٹکا نکل چکا تھا۔ راسکل کنگ دوستانہ مراسم قائم کر چکا تھا۔ مائیکل مائیکل اپنے زخم چاٹ رہا تھا۔ پروفیسر یونزال کو میں رکھ چکا تھا۔ حالات کے کسی حد تک معمول ہوا میں خود کو کافی فریش اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ایک روز راسکل کنگ نے موبائل پر رابطہ کیا۔

”افتخار! فوراً میرے پاس پہنچو۔“ اس کی آہٹ ہوئی تھی۔ مجھے اس کا اچانک بلاوا اچنبھے سے لگا۔ ”ٹھیک ہے، میں آ جاؤں گا۔“ میں نے ذرا دیر بعد میں اس کے نیوڈ کلب میں اس کے ساتھ کمر آخاس میں موجود تھا۔ اس کے چہرے پریشانی مترشح تھی۔

”افتخار! تم نے میرے بھائی ٹیڈ کی بازیابی میں اب تک کیا کیا ہے؟“ وہ چھوٹے ہی بولا۔ ”میں نے روزی کو اس کے باپ مائیکل ٹاٹا پیچھے لگا رکھا ہے۔“ میں نے قنات لہجے میں دروازے کا لیا۔

”پھر اس نے کوئی خبر دی؟“ وہ یہ غور اپنی میرے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے مستغرق ہوا۔ ”ہاں۔“ میں نے بلا تعویق کہا۔ اس کے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اپنے بھائی ٹیڈ کے بارے میں کوئی پریشان کن اطلاع ملی تھی، اسی لیے میں اپنے ذہن طباع سے کام لیتے ہوئے خامے ہلا لہجے میں کہا۔

”کوئی اچھی خبر نہیں ہے؟“ وہ میری بات پر غور کیا خبر ہے؟ کچھ بتاؤ تو۔ آخر اسے رکھا گیا ہے؟“

”وہ ایف بی آئی کے ہارچرسل میں تھا، اب ایف بی آئی کے قہر ڈونگ کے حوالے کر دیا ہے۔“

برائے کرنے کا مطلب موت کے حوالے۔۔۔۔۔ وہ چیخا۔ میرا اندھیرے میں چھوڑا لے پر لگا تھا۔

”یہی اطلاع ملی ہے۔ ٹیڈ کو ڈھچیر کے نے والا ہے۔“

ایک گہری سانس لی۔ وہ اپنی بات جاری لے خامے سخت لہجے میں دوبارہ مجھ سے بولا۔

”تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہیں دی؟“

”مگر لیتے؟“ میں نے کہا۔ ”جب کہ میں خود اس کے لیے کوشاں رہا ہوں۔ باقی دی دے، اطلاع ملی ہے؟“

”نہی۔ یہی اطلاع ملی ہے وہ ابھی تک ایف بی ٹیڈ کمانڈرسل میں ہے۔“

طاہت آمیز یو کلاہٹ اور پریشانی نے اس کی اداف کر ڈالی تھی۔ وہ میرے اندھیرے میں بے ہوئے تیر کو میری معلومات پر محمول کرتے اور ہی میرا راستہ آسان بنا رہا تھا ورنہ اگر وہ ایسا یہ سوالات کر کے میرا جھوٹ پکڑ سکتا تھا۔ جوابات بہر حال میرے پاس نہ تھے۔ چنانچہ بڑی مکاری کے ساتھ اس کی فراہم کردہ۔ کے سہارے بولا۔

”میں چاہتا تھا کہ روزی کے ذریعے ایک ڈراما ہمارا اس کے توسط سے لوکل کمانڈرسل والوں تک مائل کر کے بڑا بازیاب کردالوں۔“

”واقعی۔۔۔؟“ راسکل کنگ کے چہرے پر پہلی بار کے تاثرات اترے تھے۔

”پھر۔۔۔ تو پھر تم ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے۔“

”وہ؟ میرے بھائی کے لیے کچھ کرتے کیوں نہیں؟“ وہ عجلت آمیز بے قراری سے بولا۔

”جب تک ٹیڈ مائیکل مائیکل کی کسٹڈی میں تھا تو میں تنہا یہ کام کر سکتا تھا مگر اب اس کے اچانک اور درون خانہ فیصلے پر خود میں بھی پریشان ہو گیا تھا، مگر خیر میرے ذہن میں ایک پلاننگ تو ہے۔“ میں چالاکی سے کچھ سوچتا ہن کر بولا۔

”کیسی پلاننگ؟“

”مجھے کچھ تربیت یافتہ اور مسلح آدمی چاہیے۔“

”لے جاؤ، لے جاؤ۔ میرے سارے آدمی لے جاؤ، مگر میرے بھائی کو کسی طرح بچاؤ۔ میں اسے کسی دوسرے ملک بھجوا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے نو افراد درکار ہیں جس میں ایک دو افراد اتلا کھولنے کے بھی ماہر ہونے چاہیے۔“

”تمہیں مل جائیں گے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”مگر تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم سے شروع کر دو گے؟“

”آج سے ہی۔“ میں نے اس کی مرضی بھانپ کر کہا۔

”گذا“ وہ میری توقع کے صین مطابق خوش ہو گیا۔

”تو پھر ڈن ہوا یہ پروگرام۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”میں آج رات بارہ بجے یہاں آؤں گا۔ میری ٹیم کو بالکل تیار ہونا چاہیے۔“

”تم بے فکر رہو۔ بس تم آنے کی کرنا۔“ وہ کھڑے ہو کر مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

☆

اب میں ایک تیر سے دو تیار کرنا چاہتا تھا۔ میرا لائحہ عمل یہ تھا کہ سب سے پہلے ٹیڈ کو بازیاب کر دوں گا۔ راسکل کنگ کا مکمل اتحاد حاصل کر لوں۔ اس کے بعد میں راسکل کنگ کے خلاف بڑی گہری چال چلنے والا تھا۔



کہ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوگا، کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ میرے بھائی عالم خان کے قتل کا ماسٹر مائنڈ یہی مردود شخص تھا جو اب اپنے بھائی کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا بھائی ٹیڈ بھی اس کی طرح جرائم پیشہ شخص تھا اور میں دونوں بھائیوں کو کسی صورت میں بھی معاف نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں اس حقیقت سے بہ خوبی واقف تھا کہ ٹیڈ کو ایف بی آئی کے لوکل کمانڈر سیل کے قبضے سے چھڑانا معمولی بات نہ تھی۔ یوں تو میں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ راسکل کنگ کو تالا رہوں اور اپنی تعلیم مکمل ہوتے ہی روزی کے ساتھ واپس اپنے وطن چلا جاؤں، کیوں کہ وہاں مجھے اپنے بابا جانی کی بھی فکر سنا رہی تھی۔ سعید رضا احتشام میری غیر موجودگی میں ہماری حویلی پر وراثت نکوسے حملے کے لیے بے چین ہو رہا ہوگا۔ یوں تو اگرچہ میرے بابا جانی اب مشرب بن چکے تھے اور ان کی پارٹی مسٹر اقتدار پر فردکش تھی جو بہر حال سعید رضا احتشام کے لیے دوسری بڑی شکست تھی۔ وہ کم بخت اب ناکامی اور پرانی دشمنی کے باعث کسی بھی وقت گل کھلا سکتا تھا لہذا مجھے وہاں کی بھی فکر تھی، لیکن ٹیڈ کا پھنسا جھج میں پڑنے سے مجھے ایک بار پھر اس دلدل میں آہستہ ہونا پڑ رہا تھا۔ یوں بھی میں نے راسکل کنگ سے آخری حساب چمکا تو کرنا ہی تھا اس لیے میں نے سوچا اگر نگے ہاتھوں مجھے اس کا موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھالینا چاہیے۔

میں رات بارہ بجتے سے چھ منٹ پہلے ہی اپنے ذاتی ہتھیاروں سے لیس راسکل کنگ کے نیوڈ کلب پہنچ گیا۔ وہ مجھے سرتاپا تیار اور فٹ فائٹ پا کر خوش ہو گیا۔ میں اس کے نو مسلح افراد میں تھا۔ ہمیں ایک سٹیشن دیکھن دے دی گئی مگر میں نے دو تیز رفتار کاروں کا مطالبہ کیا اور فوراً ہی مطالبہ پورا کر دیا گیا۔ میں راسکل کنگ کے نو افراد کو لے کر روانہ ہو گیا۔

L.C.S. ونگ کی عمارت راہری کے علاقے تھی۔ وہاں سخت پہرہ تھا۔ حالات ایک ایسا جنگ کے متقاضی تھے۔ میری ذرا سی لٹرنش مجھے ڈالتی اور ایسے میں جب کہ میں اپنا تعلیمی کیریئر کر کے ہمیشہ کے لیے لندن سے کوچ کر جانے والا بہر طور میں نے اللہ کا نام لیا اور مطلوبہ عمارت خاصی دور میں نے کارروک دی پھر اپنے نو ساتھیوں سے تعلیمی ہدایت دینے لگا۔

میں نے سب سے پہلے نو افراد کو تین نفر میں تقسیم اور تین نفر کی ٹیم میں ایک کو لیم لیڈر بنایا۔ میرے ساتھ دو افراد تھے جو ہر قسم کا ڈھٹ تالا کھولنے کے ماہر تھے۔ دو گروپوں میں سے ایک کو میں نے محض یہ ہدایت دے کر روانہ کر دیا کہ وہ عمارت کے مرکزی دروازے کے قریب سے گزرتے ہوئے شرابیوں کے انداز اور ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے گزریں گے۔ جیسے ہی مرکزی گیٹ کے محافظ ان کی طرف متوجہ ہو تو دوسرا گروپ ان پر خاموش حملہ کر کے محافظوں کو موت کی نیند سلا دے۔ اس کے بعد دونوں گروپ عمارت کے دائیں بائیں پھیل کر ذرا فاصلے پر موجود بند ہو کر عمارت پر بے دریغ فائرنگ کر ڈالیں گے کہ از کم نصف گھنٹے تک فائرنگ کرنے کے بعد پیچھے چلے جائیں گے۔ مقصد عمارت کے اندر باہر مہم پہرے داروں کو اپنے پیچھے لگانا تھا۔ اس کے بعد جہاں چاہتے فرار ہو جاتے۔ کاروں کی نمبر پلیٹس جعلی تھیں۔

یہ ہدایات دے کر میں نے دونوں گروپس کو اپنی پروازیاں بھانے کے لیے روانہ کر دیا۔ L.C.S. یہ عمارت Rawhery کے قدرے نواح میں تھی جو کے چار اطراف سرسبز گھنا جنگل تھا۔ میں نے وہاں گروپس کو روانہ کرنے کے بعد ذرا فاصلے سے انفرادی وین دور بین سے عمارت کا جائزہ لیا۔ عمارت مسکما

اور خاصے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ انداز میں اس قدر بلند تھیں کہ انہیں اڑ کر ہی پھلانگ سکتا تھا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ اندر باہر موجود وقت چوکی مسلح پہرے داروں کی نظروں میں آئے، ورنہ وہ گولیوں سے چھلنی کر کے رکھ ڈالتے۔

اب میں غور تھا کہ کب گروپ اے اور بی اپنا کام مانتے ہیں۔ مجھے شور شرابے کی آواز سنائی دی۔ میں چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ گروپ اے نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اب گروپ بی کی باری تھی۔ میں بہ متور اپنی آنکھوں سے انفرادی دور بین لگائے صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے دیکھا۔ گروپ اے کے تینوں ارکان نے شرابیوں کی طرح لڑکھڑاتے ہوئے عمارت کے مین گیٹ کے قریب آپس میں لڑنا بگڑنا شروع کر دیا۔ جالی دار احاطے کے آہنی گیٹ کے دائیں جانب بنے گاڑڈ کیبن سے چار مسلح افراد نصوص چست درویشوں میں نمودار ہوئے۔ ان کی طرف بڑھے اور ان کے ساتھ الجھ گئے۔ دفعۃً گروپ اے ایک طرف تاریکی سے ابھرا اور پھر اے اور بی گروپ نے نہایت ہوشیاری اور قابل داد پھرتی کے ساتھ ان چاروں مسلح افراد کو خاموشی سے موت کی نیند سلا دیا۔ سرچ لائٹ گردش کر رہی تھی۔ وہ خود کو اس کی زد سے نہ بچا پائے۔ لائٹ پڑتے ہی سنائے دار تاریک ماحول میں گولیوں کی بوچھاڑ ابھری۔ دو افراد کی دل خراش چیخیں گونجیں اور باقی چار بے دریغ فائرنگ کرتے ہوئے منصوبے کے مطابق عمارت کے دائیں بائیں دو دو حصوں میں بٹ کر دوڑے۔

عمارت کے اندر باہر بھگدڑ سی جھج گئی۔ ہم تینوں نے اپنی گتیں نکال کر ہاتھوں میں پکڑ لی تھیں۔ "لیٹس گو....." میں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا اور پھر ہم تینوں جھجکے جھجکے اور نہایت احتیاط کے ساتھ عمارت کے مین گیٹ کی طرف دوڑے۔ گیٹ

ظاہر ہے کھلا ہوا تھا۔ ہم تینوں اندر داخل ہو گئے۔ عمارت کا مرکزی دروازہ ہمارے سامنے تھا مگر میں ابھی عجلت آمیزی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ دفعۃً مجھے میدانِ احاطے کی پختہ روش پر بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔ ہم تینوں ایک دم خالی کیبن کی دیوار سے ملحقہ ایک پتلی گلی میں داخل ہو گئے۔ میری پلاننگ اب تک کامیاب جا رہی تھی۔ آن کی آن میں عمارت سے کئی مسلح باوردی لوگ گتیں سنہالے باہر کو دوڑے تھے۔ پھر چند لمبے گرد و پیش کی اچھی طرح سن گن لینے کے بعد ہم تینوں باہر نکلے اور سیدھے عمارت کے اندرونی مرکزی دروازے کی طرف بڑھے۔ میرے عمارت پر اچانک فائرنگ کرنے کے منصوبے کی کامیابی کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ مسلح باوردی افراد بوکھلاہٹ اور پریشانی کا شکار ہو کر دروازہ کھول کے نکل دوڑے تھے لہذا میں اپنے دونوں ساتھیوں کو لے کر اندر داخل ہوا۔ اندر ٹیوب لائٹس اور مرکزی کے بلب روشن تھے اور دائیں بائیں پتلی پتلی راہ داریوں کی بھول بھلیاں سی پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے اندر ہی دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ اچانک تین مسلح باوردی افراد سامنے سے ابھرے۔ "فائر" مین چیخا اور ساتھ ہی فرش پر گر گیا۔ ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ماری گئی۔ ہمارا ایک ساتھی خوں ناک گولیوں کی زد میں آ کر لرزہ خیز چیخ لگے ساتھ گرا۔ ہم دونوں نے فرش پر گرتے ہی اپنی گنوں کے دھانے کھول دیے۔ وہ تینوں باوردی مسلح اہلکار جگر پاش چیخیں مار کر لہرائے اور زمیں بوس ہوتے چلے گئے۔ ہم دونوں اٹھ کر دوڑے۔ دفعۃً عقب سے گولیوں کی ترتر اہٹ ابھری۔ میں تو پھرتی کے ساتھ دائیں جانب کی راہ داری میں مڑ گیا مگر پھر بھی ایک گولی میرے بائیں بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی جب کہ میرا آخری بدنصیب ساتھی گولیوں کی خوں ناک ترابوی کی زد میں آ کر ڈھے گیا۔ میرے زخمی



بازو سے خون جاری ہو گیا۔

عقب میں دوڑتے قدموں کی آواز قریب آنے لگی۔ میں نے یہ چالاکی کی کہ آگے بھاگنے کی بجائے اپنی گن کا رخ سامنے موڑ دیا اور پھر جیسے ہی وہ دونوں حملہ آور اپنی جھونک میں میرے سامنے آئے تو میں نے لیلیٰ دبا دی۔ دونوں تیرا کر گرے اور ٹھنڈے پڑ گئے۔ میرے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا۔ پھر میں نے فوراً ایک مردہ اہلکار کی وردی پہن لی اور اس کی کپ بھی۔ اب بادی التکر میں میں بھی ایف بی آئی کا ایک اہلکار نظر آ رہا تھا۔ میرا دل بے تحاشا دھڑ دھڑا رہا تھا۔ اعصاب تن کر جیسے مضبوط حوصلوں کی چٹان بن گئے۔

میں آگے بڑھا۔ اچانک سامنے سے ایک بادر دی اہلکار آنا دکھائی دیا۔ میں نے کپ دانستہ چہرے پر چھرا جھکا دی۔ انداز ایسا ہی رکھا جیسے میں بڑی جنگ کر کے آ رہا ہوں۔ مجھے اپنا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ قریب آیا تو میں نے اس سے کہا۔

”ٹیڈ ٹائی قیدی کو فوراً کوئی مار دو۔ ابھی ابھی مجھے حکم ملا ہے۔ جلدی کرو۔ ہری اپ دشمن نے اسے آزاد کرانے کے لیے ہماری تعداد میں حملہ کر دیا ہے۔“ میری بات ہی ایسی تھی کہ وہ یقین کر گیا اور واپس دوڑا۔ میں بھی اس کے عقب میں دوڑا۔ پھر مختلف راہ داریوں سے ہوتا ہوا ایک پارک کے دروازے کے سامنے رک گیا۔ میں دعا مانگ رہا تھا کہ میری یہ چال کامیاب جائے اور کوئی دوسرا اہل کار یہاں نہ آجائے۔ بہر طور اس اہلکار نے فوراً اسکیئر پر اپنے منکر پرنٹ دیے پھر دروازے کی آہنی چوکھٹ پر نصب ڈیجیٹل نمبروں کو بچ کیا۔ موٹا بھاری فولادی دروازہ ہلکی گڑگڑاہٹ کے ساتھ سلائیڈ ہوتا چلا گیا۔ سامنے ایک چھوٹے قد مگر کشی ہوئی جسامت کا ٹھہکا ہوا شخص ایک آئرن اسٹول پر بیٹھا تھا۔ اس اہل کار نے جیسے ہی

اپنی گن سے اس کا نشانہ لیا۔ میں سمجھ گیا۔ یہی راسکل کنگ کا چھوٹا بھائی ٹیڈ ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی گن کی نال اس کی کمر سے لگا کر ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور وہ بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو گیا۔

”آؤ جلدی کرو۔“ میں نے حیران پریشان ٹیڈ سے کہا۔ مجھے وردی میں دیکھ کر وہ مجھے بھی پہلے اہل کار سمجھا تھا، مگر پھر میں نے اسے مختصر اپنے بارے میں بتایا تو اس کے سنے ہوئے چہرے پر ہلاکت آ گئی۔

”ادھر ایک خفیہ راستہ باہر کو جاتا ہے۔“ وہ میرے ساتھ دوڑتے ہوئے ہاتھی آواز میں بولا اور پھر میں اس کے بتائے ہوئے راستے پر ہولیا۔ تھوڑی سی جو کم کے بعد ہم عمارت سے باہر نکلے تار یک جنگل میں تھے۔ تار یک جنگل کے ایک قدرے محفوظ گوشے میں پہنچ کر میں نے اپنے ساتھیوں سے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تو صرف دو افراد سے رابطہ ممکن ہو سکا۔ گویا باقی سات کام آچکے تھے۔ میں نے انہیں مشن کے مکمل ہونے کی خوش خبری سنائی اور کار لانے کا کہا۔ کاریں ہم نے محفوظ گوشے میں کھڑی کر رکھی تھیں۔ ذرا دیر بعد وہ دونوں ایک کار میں میری بتائی ہوئی نشان دہی کے مطابق ہمیں لینے آئے۔ اس کے بعد ہم اس میں سوار ہوئے اور راسکل کنگ کے نیوڈ کلب کی طرف روانہ ہو گئے۔

ٹیڈ تو مجھے حیرت آمیز نظروں سے بت ہانکے جا رہا تھا۔ اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے ایف بی آئی کے ایک خطرناک دستے سے چھڑا لیا تھا۔ میں کلب پہنچا تو راسکل کنگ اپنے بھائی ٹیڈ سے دیوانہ وار لپٹ گیا۔ اس کے بعد راسکل کنگ نے مجھے بھی اپنے گلے سے لگا لیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا، جیسے میرا غلام بن گیا۔ اس نے فوراً زبردست جشن کے اہتمام کا حکم دیا تو میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”مستر کنگ! یہ وقت جشن منانے کا نہیں ہے۔ اپنے

بھائی ٹیڈ کو فوراً پہلے ملک سے باہر بھیجنے کا بندوبست کرو۔ اس کے چھوٹے بھائی ٹیڈ نے بھی میری بات کی حمایت کی۔ راسکل کنگ بھی راضی ہو گیا۔ میں نے اس کے بھائی کو بازیاں کر دیا کہ جیسے اسے خرید لیا تھا، تاہم وہ بولا۔

”انتظار میں اتنے عرصے بعد بھائی سے ملا ہوں۔ ار اسے دیکھ تو لوں جی بھر کر۔“

بلاشبہ وہ اپنے بھائی سے بہت محبت کرتا تھا۔ میں دل میں کھول اٹھا اور جی میں آئی کہ اس سے کہہ ڈالوں۔ ”ذلیل انسان! میں بھی تو اپنے چھوٹے بھائی عالم خان سے ایسی ہی محبت کرتا تھا، مگر تو نے اس بے گناہ کو بے دردی کے ساتھ سوانو کے ہاتھوں مراد دیا۔“

”بہر طور میں نے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہا۔“

”مستر کنگ! ٹیڈ کو یہاں زیادہ دیر رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ کالی بھیل میں ہر جگہ موجود ہوتی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی تمہارا برگشتہ آدمی غداری کر بیٹھے اور۔۔۔۔۔“

میں نے باقی جملے کا مطلب اس کی سمجھ داری پر چھوڑتے ہوئے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بڑے رعوت آمیز لہجے میں سینہ پھلا کر بولا۔

”میرے سارے آدمی وقادار ہیں۔ کسی میں ایسی جرات نہیں۔“

میرا کام ہو چکا تھا۔ میں خاموشی سے واپس گیا، پھر منصوبے کے مطابق سب سے پہلے ایک کال بوتھ پر چند فٹ ڈال کر میں نے مائیکل ٹائیڈل کو راسکل کنگ کے کسی برگشتہ آدمی کی طرف سے ایک گم نام کال کر کے بتایا کہ ”ٹیڈ کو چھڑانے والا اس کا بھائی راسکل کنگ اور ساتھی تھے۔ وہ سب اس وقت ساؤتھ امریٹ کے نیوڈ کلب میں موجود ہیں لہذا وقت ضائع کیے بغیر فوراً چھاپا مارا جائے ورنہ ٹیڈ کو ملک سے باہر فرار کر دیا جائے گا۔“ یہ گم نام اطلاع دینے کے بعد میں

واپس اپنے کیمپس آ گیا۔

میں جانتا تھا کہ ٹیڈ کے سلسلے میں مائیکل ٹائیڈل کو اب تک مطلع کیا جا چکا ہوگا۔ اب میں تصویر ہی تصویر میں ایک خون ریز تماشے کو دیکھ رہا تھا۔

☆

اگلے ہی دن ایوننگ اسٹیشنل کے اخبارات سنسنی خیز سرخیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میرا ڈیل کر اس منصوبہ بھرپور طریقے سے کامیاب ہوا تھا۔ اخبارات میں سب سے پہلے ٹیڈ کے خون ریز معرکے کے بعد فرار کی داستان کے ساتھ ایف بی آئی والوں کا فوراً بعد راسکل کنگ کے نیوڈ کلب میں چھاپے کی کہانی تفصیل درج تھی اور اس چھاپے کے دوران راسکل کنگ کے بیشتر ہرکارے مارے گئے تھے اور ٹیڈ بھی ایف بی آئی والوں کے ہاتھوں بعد ازاں مارا گیا تھا جب کہ راسکل کنگ شدید زخمی حالت میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اپنی اس کامیابی پر مجھے اپنے وجود میں سنسنی خیزی کا احساس ہوا۔ راسکل کنگ کو اس بار میں نے بڑی زبردست ذک پہنچائی تھی۔ وہ بھی اس طرح کہ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہو پایا تھا کہ یہ میری حرکت تھی اور نہ ہی راسکل کنگ کا میری طرف دھیان جاسکتا تھا کیوں کہ میں اپنی جان جو کم میں ڈال کر ٹیڈ کو ایف بی آئی کے جنگل سے چھڑا کر لایا تھا اور پھر چوں کہ میں پہلے ہی منصوبے کے تحت نفسیاتی طور پر راسکل کنگ کے ذہن میں خطرہ بٹھا چکا تھا کہ وہ کالی بھیلوں سے ہوشیار رہے اور جلد سے جلد اپنے بھائی ٹیڈ کو ملک سے باہر بھیجنے کی کوشش کرے اس لیے لاحالہ اس کا دھیان اپنے ہی کسی برگشتہ ساتھی کی طرف ضرور گیا ہوگا، جس نے اس کی پینٹ میں خنجر گھونپا ہوگا۔

میں تصویر ہی تصویر میں راسکل کنگ کو غم و غصے سے ٹھہکا ہوا دیکھ کر مسرور ہو رہا تھا۔ اس دوران پرو فیسر یونزال نے فوراً دوبارہ مجھ سے بالمشافہ رابطہ کر کے مجھ



سے اسالٹ وائرس کے ادھورے فارمونے دینے کا تقاضا کیا۔ میں پہلے ہی اصل کی بجائے نقل فارمولا تیار کر چکا تھا جو محض کاغذی لکیروں پر ہی مشتمل تھا۔ میں نے اسے دے دیا۔

☆

وقت نے ایک اور زقہ بھری اور میں نے اپنا تھیسس مکمل کر لیا اور میں بھی اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی ہم نے فوراً پاکستان کوچ کرنے کا پروگرام بنایا لیکن اس سلسلے میں میں نے ہوشیاری کا دامن نہ چھوڑا تھا۔ کیوں میں جانتا تھا کہ روزی کا کینہ پرور باپ مائیکل ٹائیڈل ہم پر نظر رکھے ہوئے ہوگا اور وہ ہم دونوں کے لندن سے کوچ کرنے پر روڑے اٹکانے کی کوشش کرے گا لہذا میں نے اسے ڈاج دینے کے لیے ایک کام یہ کیا کہ یونیورسٹی آف لندن میں ہم دونوں نے نوکری کی درخواست دے ڈالی اور مائیکل ٹائیڈل کو میں نے روزی کے ذریعے جاب پھارش کے لیے کہا۔ ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا تھا تاکہ مائیکل ٹائیڈل اس بات سے اندھیرے میں رہے کہ ہم ابھی پاکستان جانا نہیں چاہتے تھے اور ادھر ہی اپنا مستقبل بنانا چاہتے تھے۔ بے شک دونوں باپ بیٹی کے درمیان ناراضگی تھی مگر بہر حال یہ باپ بیٹی کا معاملہ تھا۔ مائیکل نے میری توقع کے عین مطابق اپنی بیٹی سے مذکورہ یونیورسٹی میں جاب دلانے کا وعدہ کر لیا۔ میں بس اتنا ہی چاہتا تھا۔ حالات تیزی کے ساتھ کروٹیں بدل رہے تھے۔ تب اچانک مجھے جمعہ خان نے پاکستان سے ٹیلی فونک اطلاع دی کہ وہاں بابا جانی کی پارٹی کو مسجد اقتدار سے سبک دوش کر دیا چکا ہے اور اسبیلیاں توڑ دی گئی ہیں۔

میں یہ سن کر سٹائے میں آ گیا۔ اس نے مزید ملکی سیاسی فضا کے بارے میں بتایا کہ اب شدید ہے کہ نوے دن کے اندر اندر ہونے والے عام انتخابات میں سعید

رضا احتشام کی پارٹی عثمان اقتدار سنبھالے گی نیز بابا جانی کو سعید رضا احتشام نے یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اب وہ متوقع اقتدار عثمان سنبھالے ہی بابا جانی اور مجھ۔ گن گن کر بد لے لے گا۔

”سائیں مٹھا! آپ کا اب واپس ملک لوٹنا انتہائی ضروری ہو گیا ہے۔“

ان ساری باتوں کی مختصر آگاہی دینے کے بعد جمعہ خان اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ اس کے لہجے سے پریشانی اور تشویش مترشح ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دینے کے ساتھ یہ خوش خبری بھی سنائی کہ میں جن قریب پہنچنے والا ہوں۔

ادھر میں تیزی کے ساتھ مگر نہایت رازداری سے روزی کا پاسپورٹ اور ویزا تیار کر دانے لگا مگر سب سے پہلے ہم جاب لے کر جوائننگ کرنا چاہتے تھے تاکہ مائیکل ٹائیڈل کے دل و دماغ میں رہا سہا شک بھی دور ہو جائے۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے تیزی کے ساتھ ہماری سفارش پر عمل درآمد کر دیا تھا اور بالآخر ہمیں مطلوبہ یونیورسٹی میں جاب مل گئی۔ میں جانتا تھا کہ شاطر مائیکل ٹائیڈل نے مجھ سے دیرینہ مخاصمت کے باوجود پہلی فرصت میں کام کیا ہوگا۔ کیوں کہ وہ کسی طور بھی نہیں چاہتا ہوگا کہ ہم دونوں پاکستان روانہ ہوں۔ یوں میں نے روزی کے ذریعے اپنے تاثرات اس تک پہنچانے کی یوں کوشش کی کہ مجھے لندن کی فضا اس آجکی تھی اور اب میں ادھر ہی رہنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ میرا یہاں رہنا مائیکل ٹائیڈل کے مفاد میں تھا۔ یوں وہ مجھے رفتہ رفتہ اپنی سازشوں کے تار عنکبوت میں جکڑ سکتا تھا۔

بہر طور میں نے اور روزی نے مذکورہ یونیورسٹی (یونیورسٹی آف لندن) کی بہ طور پروفیسرز کے جوائن کر لی، لیکن جب حکومت پاکستان کو لندن یونیورسٹی کی طرف سے بانڈ ریٹرن کرنے کا وقت آیا تو

میں اس پر دستخط کیے بغیر ہفتے بھر کی رخصت پر چلا گیا۔ جب کہ روزی کو میں نے دانستہ چھٹیاں لینے سے روک رکھا تھا۔

اٹھائے راہ ہمارے تمام سفری ڈاکومنٹس تیار ہو چکے تھے۔ بالآخر ہم دونوں ایک روز ہیتھرو ایئر پورٹ لندن سے بذریعہ فلائٹ پاکستان کی طرف پرواز کر گئے۔

روزی جہاز کی ککڑ کی والی سائیڈ پر سیٹ کی پشت گاہ سے سر نکالے خاموش بیٹھی تھی۔ وہ نیچے لندن کی جگہ گاتی لہراتی نقطوں جیسی روشنیوں کو نگے جارہی تھی۔ میں نے اسے اچانک خاموش پا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو جیسے میرا دل تسخیر کیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی موٹی موٹی لکیروں شہابی گالوں پر بہ رہی تھیں۔

”روزی.....!“ میں نے ہولے سے مگر محبت بھری ملاوت سے اسے پکارا۔

”ہوں۔“ وہ بہ دستور ککڑ کی کی طرف دیکھتے ہوئے دیر سے بولی۔

”کیا اداس ہو رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔ میں سمجھ گیا تھا اپنا ملک جہاں وہ پیدا ہوئی، پلی بڑھی، اب اسے ہمیشہ کے لیے وداع کرنے پر اسے دکھ ہو رہا تھا۔ اس کے سوگوار چہرے پر یک ٹک ایک آرزو سی خاموشی طاری تھی۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے پیار سے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا اور بچوں کی طرح رونے لگی۔

”او کم آن روزی! میں تمہارا دکھ سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے محبت سے اس کے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ملاحت سے کہا۔ ”میں تمہارا دکھ سمجھ رہا ہوں، لیکن میرا تم سے یہ وعدہ ہے کہ تم جب بھی مجھے کہو گی میں پاکستان سے لندن تمہیں تمہارے مئی پاپا سے ملوانے کے لیے لاتا رہوں گا۔ اب تو خوش۔ چلو اب

مسکرا دو۔“ میں نے اس کے آنسو پونچھے وہ ہلے سے مسکرا دی۔

سفر جاری تھا۔ روزی اور میں کافی دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے اور مستقبل کے خوش آئند خواب فردا کی تعبیریں بنتے رہے اور پھر ہم دونوں نے اپنی چیمبرز اجڑی کر لیں تو روزی اپنا سر میرے سینے پر رکھے رکھے سو گئی۔ میں پیار سے اس کے روشنی بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ بالکل حسین گڑیا کی طرح لگ رہی تھی۔ جہاز کی لائٹیں تقریباً آف تھیں۔ مدہم روشنی میں جہاز کا ماحول بہت خواب ناک لگ رہا تھا۔ خوش احوال اور بااخلاق ایئر ہوسٹس نے ہمیں صاف سترے اور گرم لحاف لا دیے تھے۔ جہاز اپنی منزل کی جانب محو پرواز تھا۔

☆

لندن سے کراچی تک کا ہوائی سفر تقریباً اٹھارہ گھنٹے پر محیط تھا۔ وقفے وقفے سے انوائسٹ کے ذریعے مسافروں کو بتایا جا رہا تھا کہ ان کا جہاز اس وقت روم پر سے گزر رہا تھا، پھر قاہرہ، اس کے بعد بحرین۔ بالآخر عرب کی طرف سے فضائی موڑ کے بعد ہمارا جہاز پاکستانی فضائی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ لندن کا وقت پاکستان کے وقت سے چانچ گھنٹے پیچھے تھا۔

بہر طور میں اور روزی کراچی ایئر پورٹ پر اتارے اور کشم اور امیگریشن کے کاؤنٹرز سے ہوتے ہوئے باہر آئے تو جمعہ خان کو میں نے باچھیں پھیلائے دیکھا۔ اس نے فوراً اپنے ہاتھ ہلا دیے، پھر میرے ساتھ ایک گوری میم (روزی) کو دیکھ کر اس کی باچھیں مزید کانوں کی لودوں تک پھیل گئیں۔

”یہ کون ہے؟ دوست ہے تمہارا؟“ روزی نے جمعہ خان کو دیکھ کر مجھ سے پوچھا اور میں مسکرا کر بولا۔

”ہاں۔ دوست ہے..... میرا بھائی اور جاں نثار۔“ اسنے میں وہ ہمارے قریب آ گیا۔ اس کے ہونٹ



اب حیرت سے سکر گئے تھے۔ وہ پہلے مجھ سے لپٹ گیا پھر ہاتھ ملایا۔ روزی نے جب مسکرا کر معاف کے لیے جمعہ خان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو جمعہ خان بھونچکا رہ گیا، مگر میرے کھٹکھٹانے پر اس نے ہاتھ ملانے کی بجائے روایتی انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔  
”ہمارے ہاں عورتوں سے معاف نہیں کیا جاتا۔ چلو۔“

”یہ کون پری ہے سائیں مشا!“ جمعہ خان نے مجھ سے سندھی زبان میں پوچھا۔  
”اے یہ حیرتی ہونے والی بھابی ہے۔“  
”اچھا سائیں! ماشاء اللہ بہت کھوب صورت ہے۔“  
وہ یہ کہہ کر روزی سے مخاطب ہوا۔  
”سلام بھابی!“ (بھابی)۔  
”یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ روزی نے اپنی مادری زبان میں مجھ سے پوچھا تو میں ہولے سے ہنس کر بولا۔  
”یہ تمہیں اپنی مادری سندھی زبان میں سلام کہہ رہا ہے۔“

”او۔۔۔۔۔ اچھا، اچھا۔“  
وہ تہا کوٹھ (کندھ کوٹ) سے مجھے لینے آیا تھا۔ ہائی روڈ، اپنی بکیر میں۔  
”اب کہاں کے ارادے ہیں؟“ میں نے روزی سمیت سیٹ پر براجمان ہوتے ہوئے جمعہ خان سے پوچھا۔  
”سائیں مشا! ستارہ مینشن۔“

میرے لیوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔  
”سائیں مشا! مجھے بڑی خوشی ہوئی اب تو آپ واپس فرنگیوں کے ملک میں نہیں جائیں گے ناں۔“  
وہ گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔  
”نہیں۔ اب میں ہمیشہ کے لیے پاکستان آیا ہوں۔“  
وہ خوشی سے اپنا سر دھنسنے لگا۔  
”ستارہ مینشن میں چھوٹی اماں (کلثوم قاطرہ، قلمی

نام ستارہ) ہوں گی۔“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔  
”ہاؤ سائیں! پر دونوں ماں بیٹی کے چہروں سے لگ رہا تھا کہ وہ آپ کے آنے سے خوش نہیں ہیں۔“  
بولا۔ میرے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ کھل گئی۔ ان کے حوالے سے کچھ تلخ یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔  
”اچھا۔“ میں نے ہولے سے کہا۔  
”سائیں مشا! پر میں نے آتے ہی آپ کے لیے کمر اتیار کر دینے کا حکم دے ڈالا تھا۔ وہ میرا مطلب ہے سائیں وڈے (بابا جانی) کے حکم سے۔“

”ہوں۔ پھر وہ دونوں ماں بیٹیاں منہ پھلار ہی ہوں گی۔“  
”ہاؤ سائیں! جب میں وہاں پہنچا تھا تو دونوں ماں بیٹیوں نے اس طرح مجھے گھور کر دیکھا تھا جیسے میری بوٹیاں کھا جائیں گی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اپڑیں ماں دارے وڈے (بابا جانی) نے پہلے سے گوٹھ سے انہیں فون کر کے بتا دیا تھا ورنہ تو شاید مجھے یہ دونوں گھسنے ہی نہ دیتیں۔“ وہ بولا۔

مجھے طیش آنے لگا۔ میں جان بوجھ کر دونوں حراۃ ماں بیٹی کو ذہنی طور پر دق کیا کرتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا جب میری اماں جانی اور ادوی سسلی یہاں پہ غرض علاج رہنے کے لیے آئی تھیں تو ان ماں بیٹی نے انہیں رہنے کے لیے اسٹور والا کمرادے دیا تھا۔ بعد میں میرے آنے سے میں نے ان دونوں کی اکڑ فوں ہوا کر ڈالی تھی اور بابا جانی سے بھی ان دونوں کو ڈانٹ پلوائی تھی۔

مجھے وہ وقت بھی یاد تھا جب میری اماں جانی اور ادوی سسلی سعید رضا احتشام کی بزرگیت کا نشانہ بننے کے بعد دنیا سدھار گئی تھیں تو ستارہ نے گویا پرانا ادھار چکاتے ہوئے مجھے کراچی سے خاص طور پر گوٹھ (حویلی) فون کر کے بے ظاہر تعزیت کرتے ہوئے طنزاً کہا تھا۔ ”بیچ،

میں نے کلمہ رنج میں زہر ملا طرز کیا تھا اور پھر دوبارہ کاٹ دار زہر میں بجھے تھیک آمیز لہجے میں بولی تھی ”ویسے اگر تمہارا تہائی میں دل گھبرائے تو تمہارے لیے میرے ”ستارہ مینشن“ کے دروازے آں نہیں۔۔۔۔۔ اوپر والی منزل کے صرف اسٹور روم کا دروازہ کھلا ہے۔“ طرز اور زہر میں بجھے ہوئے یہ الفاظ مجھے آج بھی یاد تھے۔

”میں آ رہا ہوں۔۔۔۔۔ ستارہ بیگم! اب اچھی طرح تمہاری خبر لوں گا۔“ غصے کی شدت سے میں بڑبڑایا تو روزی بولی۔  
”آں۔ تم نے مجھ سے کچھ کہا۔“  
”نہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے جمعہ خان سے پوچھا۔  
”جمعہ خان! گوٹھ میں تو سب خیریت ہے ناں۔ بابا جانی، بڑی اماں (الماں خاتم)، بھابی حیات اللہ سب ٹھیک تو ہیں ناں؟“

”ہاؤ سائیں! سب ٹھیک ہیں پر وہ سائیں وڈے بہت پریشان ہیں۔“ وہ جوابا بولا۔  
”ہاں۔ جب تک وہ سیاست میں رہیں گے پریشان ہی رہیں گے۔“ میں نے ہولے سے کہا پھر پوچھا۔ ”یہ بتاؤ وہ کہاں ہیں اب۔“  
”سائیں مشا! وہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ ان کی حکومت ختم ہونے کے بعد ان کی پارٹی نے فوری طور پر ہنگامی اجلاس طلب کیا تھا۔ ویسے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایک دو روز بعد گوٹھ آ جائیں گے اور میں آپ لوگوں کو بھی وہیں لے کر پہنچوں۔“

”ہوں۔“ میں نے ایک طویل اور پرسوج ہرکاری بھری۔ گھنٹے بھر بعد ہم ستارہ مینشن میں تھے۔

”میں آ رہا ہوں۔۔۔۔۔ ستارہ بیگم! اب اچھی طرح تمہاری خبر لوں گا۔“ غصے کی شدت سے میں بڑبڑایا تو روزی بولی۔  
”آں۔ تم نے مجھ سے کچھ کہا۔“  
”نہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے جمعہ خان سے پوچھا۔  
”جمعہ خان! گوٹھ میں تو سب خیریت ہے ناں۔ بابا جانی، بڑی اماں (الماں خاتم)، بھابی حیات اللہ سب ٹھیک تو ہیں ناں؟“

”ہاؤ سائیں! سب ٹھیک ہیں پر وہ سائیں وڈے بہت پریشان ہیں۔“ وہ جوابا بولا۔  
”ہاں۔ جب تک وہ سیاست میں رہیں گے پریشان ہی رہیں گے۔“ میں نے ہولے سے کہا پھر پوچھا۔ ”یہ بتاؤ وہ کہاں ہیں اب۔“  
”سائیں مشا! وہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ ان کی حکومت ختم ہونے کے بعد ان کی پارٹی نے فوری طور پر ہنگامی اجلاس طلب کیا تھا۔ ویسے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایک دو روز بعد گوٹھ آ جائیں گے اور میں آپ لوگوں کو بھی وہیں لے کر پہنچوں۔“

”ہوں۔“ میں نے ایک طویل اور پرسوج ہرکاری بھری۔ گھنٹے بھر بعد ہم ستارہ مینشن میں تھے۔

”میں آ رہا ہوں۔۔۔۔۔ ستارہ بیگم! اب اچھی طرح تمہاری خبر لوں گا۔“ غصے کی شدت سے میں بڑبڑایا تو روزی بولی۔  
”آں۔ تم نے مجھ سے کچھ کہا۔“  
”نہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے جمعہ خان سے پوچھا۔  
”جمعہ خان! گوٹھ میں تو سب خیریت ہے ناں۔ بابا جانی، بڑی اماں (الماں خاتم)، بھابی حیات اللہ سب ٹھیک تو ہیں ناں؟“

دونوں ماں بیٹی مجھے دیکھ کر ناک بھوں چڑھالے لگیں۔ پھر ایک انگریز لڑکی یعنی روزی کو میرے ساتھ دیکھ کر ان کے بشروں پر ناگوار سی استہزائیہ مسکراہٹیں ابھریں۔  
”لو پتا نہیں کس فرنگن کو نفل میں دبا کر لے آیا ہے، لندن سے۔“

ستارہ (کلثوم قاطرہ) کی نائیکہ مار کہ ماں تارہ بیگم نے معنی خیز لہجے میں اپنی لاڈلی بیٹی کو ٹھوکے مارتے ہوئے کہا۔ دونوں کی زہر میں بجھی ہوئی نظریں روزی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔  
”تم کو اس سے مطلب؟“ میں نے خار کھائے ہوئے لہجے میں انہیں گھورا۔  
”ہاں، ہاں، ہیس کیوں مطلب ہونے لگا۔“ ستارہ ہاتھ چپا کر بولی۔

”میں ادھر ذرا تفریحی پروگرام کرتی ہوں تو تمہیں برا لگتا ہے۔ اب جو تم خود اتنے گورے چٹے پروگرام کے ساتھ یہاں رنگ رلیاں مناؤ گے وہ کس کھاتے میں جائے گا۔“ میں اس کے زہریلے طعنے لہجے پر ہتھے سے اکھڑ گیا۔  
”اپنی زبان کو لگام دے اے عورت! اور اپنی اوقات میں رہ کر بات کرو۔“ وہ جوابا ترکی بہ ترکی بولی۔

”اتفاقاً صاحب! جب میں آپ کو اپنے گھر میں آنا پسند نہیں کرتی ہوں تو تم کیوں ادھر آتے ہو؟“ وہ ہونٹ چپا کر جھنجھلائے ہوئے بولی۔ مجھے اس کی بے بس اور جھنجھلاہٹ پر مزہ آ گیا اور میں اسے مزید تاؤ دلانے والے انداز میں بولا۔  
”اول تو مجھے تمہاری پسند یا ناپسند سے رتی برابر بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے خاتون! ارے بات اس گھر کی تو یہ ہوا میں پہلے بھی تمہارے کھوکھلے دماغ سے نکال چکا ہوں کہ یہ گھر تمہارے باپ کا نہیں، میرے باپ کا ہے۔ اینڈ ناؤ یو بی آف!“ میں نے آنکھیں نکالتے

”میں آ رہا ہوں۔۔۔۔۔ ستارہ بیگم! اب اچھی طرح تمہاری خبر لوں گا۔“ غصے کی شدت سے میں بڑبڑایا تو روزی بولی۔  
”آں۔ تم نے مجھ سے کچھ کہا۔“  
”نہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے جمعہ خان سے پوچھا۔  
”جمعہ خان! گوٹھ میں تو سب خیریت ہے ناں۔ بابا جانی، بڑی اماں (الماں خاتم)، بھابی حیات اللہ سب ٹھیک تو ہیں ناں؟“

”ہاؤ سائیں! سب ٹھیک ہیں پر وہ سائیں وڈے بہت پریشان ہیں۔“ وہ جوابا بولا۔  
”ہاں۔ جب تک وہ سیاست میں رہیں گے پریشان ہی رہیں گے۔“ میں نے ہولے سے کہا پھر پوچھا۔ ”یہ بتاؤ وہ کہاں ہیں اب۔“  
”سائیں مشا! وہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ ان کی حکومت ختم ہونے کے بعد ان کی پارٹی نے فوری طور پر ہنگامی اجلاس طلب کیا تھا۔ ویسے انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایک دو روز بعد گوٹھ آ جائیں گے اور میں آپ لوگوں کو بھی وہیں لے کر پہنچوں۔“

”ہوں۔“ میں نے ایک طویل اور پرسوج ہرکاری بھری۔ گھنٹے بھر بعد ہم ستارہ مینشن میں تھے۔



ہوئے کہا اور دونوں غصے سے پاؤں پٹختی ہونٹ کاٹتی چلی گئیں۔

میں نے اسی وقت ملازموں کے ذریعے تین عدد کمرے تیار کرنے کو کہا۔ میرا ارادہ فی الحال چند روز ادھر ہی رہ کر ان دونوں حرافہ ماں بیٹیوں کا دل جلائے کا تھا۔ ویسے بھی میں روزی کو کراچی کی سیر کروانا چاہتا تھا، ورنہ سیدھا گوٹھ جا کر بے چاری گھبرا جاتی کہ کہاں صحرا اور جنگل میں آگئی ہے۔ یوں بھی جب تک بابا جانی اسلام آباد سے واپس گوٹھ نہیں آ جاتے۔ میں گوٹھ (حوٹلی) نہیں جانا چاہتا تھا۔

ادھر میرے آنے سے دونوں ماں بیٹی کا سکون لٹ چکا تھا، پھر روزی کے حسن کے آگے ستارہ کی مصنوعی چمک دمک اور میک اپ زدہ حسن مانند پڑنے لگا تھا۔ وہ روزی کی طرف سے بری طرح حسد میں جلا ہو گئی تھی مگر ان میں دم مارنے کی ہمت نہ تھی کیوں کہ میری سرکش فطرت اور غصہ در طبیعت سے بہ خوبی واقف تھیں۔ روزی نے ان دونوں کے بارے میں مجھ سے پوچھا تو میں نے اسے انکس میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ حیران رہ گئی اور بولی۔

”حیرت ہے انی اتھارے ڈیڈ نے اکٹھی تین تین شادیاں کر رکھی ہیں۔ کیا تینوں خوش ہیں؟“ میں مسکرا کر بولا۔

”یہ لمبی بحث ہے۔ آہستہ آہستہ اس ماحول میں رہو گی تو خود ہی سمجھ جاؤ گی۔“

میں نے اسے پھر اپنی اماں جانی اور ادی سلٹی کی جانکاہ موت کے بارے میں بھی بتایا پھر اسے اپنے خاندان کے ازلی دشمن سعید رضا احتشام کی خوں ناک عداوت کے بارے میں بتایا۔ اسے یہ سن کر بہت رنج ہوا۔ بہر طور میں اسے سیر کرانے کی غرض سے باہر لے گیا۔ جمعہ خان بھی ساتھ تھا۔ گاڑی میں چلا رہا تھا۔ جمعہ خان میرے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا جب کہ

روزی عقی سیٹ میں کھڑکی کے قریب باہر کراچی شہر کا بڑی دلچسپی کے ساتھ نظارہ کر رہی تھی۔ جمعہ خان نے مجھ سے کہا۔

”سائیں! بھاجائی کو سندھی بھی سکھاؤ ناں۔“ میں مسکرایا مگر مصنوعی غصے سے بولا۔

”کیوں؟ تو نے اس کے ساتھ کیا باتیں کر لی ہیں؟“ وہ بے چارہ گھبرا گیا۔ جلدی خفیف ہو کر بولا۔

”نن..... نہیں..... سائیں مثلاً! میں تو بس ایسے ہی کہہ رہا تھا۔“ اس کی بوکھلاہٹ پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

ہم سہ پہر سے رات گئے تک کراچی کے مختلف معروف تفریحی گاہوں کی سیر کرتے رہے۔ روزی کو کراچی بہت پسند آیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کراچی پاکستان کا ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی نوعیت کا شہر ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں بحیرہ عرب جیسا ٹھانڈا مارتا میلوں دراز سمندر ہے جو بارہ مہینے ہلکورے لیتا رہتا ہے جب کہ دیگر ممالک کے سمندر سال کے چھ مہینے برقاب بنے رہتے ہیں، نیز ابھی تو تم نے ہمارے پیارے ملک پاکستان کا صرف ایک ہی شہر دیکھا ہے، یہاں تو اور بھی بڑے بڑے اور خوب صورت شہر ہیں، پھر میں نے اسے سب سے پہلے سندھ کے بڑے بڑے شہروں کے متعلق بتایا، جن میں کراچی سمیت حیدر آباد، نواب شاہ، دادو، سکون، لاڑکانہ، سکھر اور جیکب آباد کا بتایا، جو ایشیا کا انتہائی گرم ترین شہر ہے۔ اس کے بعد میں نے اسے صوبہ بلوچستان کے بڑے شہر کوئٹہ، سی اور چمن کے نام اور ان کی جغرافیائی حیثیت آب و ہوا کے بارے میں بتایا پھر بالترتیب سرحد اور پنجاب زندہ دلاں شہر لاہور کے بارے میں بتایا کہ جس کے بارے میں یہ کہادت مشہور ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ پھر شمالی علاقہ جات، مری، اسلام آباد، پٹنڈی وغیرہ

میں بتایا تو اس کے دل میں بے اختیار ان تہ شہروں کو دیکھنے اور سیر کرنے کی خواہش میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں اسے ضرور پہلے پورے پاکستان کی سیر کرواؤں گا۔

میں تو بارہ مہینے اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ وہاں اب بھی نعت کو ترسا کرتے تھے۔ یہاں جب کڑی دھوپ دیکھی اور پھر ساحل سمندر تو اس نے مجھ سے ”سن باجھ“ لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے اسے ڈانٹ دیا۔

”جمع لگاؤ گی یہاں۔ ویسے ہی سب لوگ تمہیں لگاؤ دیکھ رہے ہیں۔“

یہ تو میں بھی دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں۔ چنے حسن کا یہاں آ کر پنا چلا ہے۔ یہ لوگ اگر ملے جائیں تو.....؟“

بس اب اتنے بھی ہلکے نہیں ہیں یہاں کے قصبے بڑے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ یہاں تو تمہیں ان والے لوگ بھی ملیں گے جن کے دم سے ہی یہ دنیا قائم ہے۔“

مسترحن انداز میں اپنا سر ہلانے لگی۔ سیر کے بعد خان کی کھوپڑی میں جانے کیا سائی کہ اس کباب میں بڑی متصور کرتے ہوئے وہاں جانا چاہا مگر میں نے اسے روک رکھا۔

”نئے کے بعد ہم گھر آ گئے۔ روزی تھکی ہوئی اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ جمعہ خان اور کمرے میں آ گئے۔ رات کے گیارہ بجے کا فون کی گھنٹی بجی۔ ایک ایکشنیشن ہمارے میں بھی موجود تھا۔ بیل دوبار بجنے کے بعد ہو گئی۔ شاید دوسرے کمرے میں موجود ستارہ در اٹھالیا تھا یہاں زیادہ تر فون اس کے ہی کمرے میں جی میں جانے کیا آئی کہ میں نے

ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے کوئی پروڈیوسر ستارہ سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ کمر کھراتی آواز میں بولا۔

”کیا ہوا میڈم! آپ نے اپنے سائیں جی سے اجازت لے لی؟“

میرے کان یک دم کھڑے ہو گئے۔ میں اب خاموشی کے ساتھ ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

”ارے میاں صاحب! اس بڑھے نے تو مجھے رہی سہی سیریلز اور فلمیں ہی بڑی مشکلوں کے ساتھ کھل کرنے کی اجازت دی تھی۔“

ستارہ کی ناگوار آواز ابھری اور میرا خون کھول اٹھا۔ بابا جانی کو ایسے لقب سے پکارنے پر مجھے ستارہ پر بہت طیش آنے لگا، تاہم گفتگو ضروری نوعیت کی تھی اس لیے میں ضبط سے کام لے کر سنتا رہا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”نئے کام کے لیے تو وہ مجھے ہرگز ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔“

”سوچ لیں میڈم! یہ بہت بڑے بجٹ کی فلم ہے اور بین الاقوامی معیار کی بھی۔ آپ کا ستارہ یک دم بلند یوں کو چھو لے گا۔ آپ ایک کوشش تو کر کے دیکھیں، آخر کو آپ سائیں جی کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیگم ہیں۔ آپ سے تو وہ بہت محبت کرتے ہیں۔“

چند ثانیے سوچنے کے بعد ستارہ کی افسردہ سی آواز ابھری۔

”میں نے اجازت لینے کی کوشش کی تھی میاں صاحب!“

”اچھا پھر کیا کہا سائیں جی نے۔“ دوسری طرف سے اس گھاگ پروڈیوسر کی پراسید آواز ابھری۔

”وہی ڈھاک کے تین پات۔ انہوں نے بہت بری طرح سے مجھے نہ صرف جھڑک دیا تھا بلکہ آئندہ اس موضوع پر پھر کبھی بات کرنے سے بھی سختی سے منع کر دیا۔“



”ہوں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوگی۔ مجھے حیرت ہے، آپ نے ایسے تنگ نظر بڑھے سے آخر کیا سوچ کر شادی کی تھی؟“

مجھے اس کہنے پر ڈیوٹر کے اپنے بابا سائیں کے اس برے رویہ پر بہت غصہ آیا، مگر ابھی میں احتیاط کا دامن چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ اس حرافہ عورت کے عزائم جاننے کے لیے۔

”کیا کروں تیاں صاحب! میں تو بہت بری طرح پھنس گئی ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ اس بڑھے کو شادی کے بعد اپنی زلف کا اسیر بنا کر منالوں گی، لیکن۔۔۔“ اس کی ہزار کن آواز ابھری۔

”یہ تو آپ نے بے وقوفی کی۔ یہ کام آپ کو اس وقت کرنا چاہیے تھا جب وہ آپ پر بری طرح فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس سے آپ شادی سے پہلے ہی یہ لکھوا لیتیں کہ آپ قلمی، نیا نہیں چھوڑیں گی۔“

”بس میاں، صاحب! غلطی ہوگئی۔ اس کی دولت نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔“

”تو کتنی دولت مل گئی آپ کو اس بڑھے سے شادی کرنے کے بعد۔“ پروڈیوسر کی طنزیہ آواز ابھری۔

”کر لیں طر میاں صاحب! آپ کو حق حاصل ہے۔ برے وقت میں تو دوست ہی کام آتے ہیں مگر آپ۔۔۔“

ستارہ کے لہجے میں پیشہ دارانہ مکاری تھی، چنانچہ دوسری طرف سے فوراً رد عمل ظاہر ہوا۔

”سوری۔۔۔ سوری۔۔۔ میڈم! درحقیقت میں تو آپ کے فائدے کے لیے ہی کہہ رہا تھا، دیے اگر آپ اس بڑھے سے چھٹکارا کیوں نہیں پالیتیں۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔“

”ہاں سوچا تو اب میں نے ایسا ہی ہے۔“

”تو بس ٹھیک ہے پھر، آپ اس سے دو ٹوک لہجے میں بات کر لیں، ورنہ طلاق کا مطالبہ کر لیں۔“ گھاگ

پروڈیوسر کے مشورے پر ستارہ چند ثانیے پر سوچ خاموشی میں مستغرق رہنے کے بعد ہی لہجے میں ہکاری خارج کرتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ سوچا تو اب میں نے یہی ہے، مگر مجھے طلاق کی صورت میں بھی نہ دے گا۔“

”تو کوئی بات نہیں، تم عدالت کے ذریعے لو۔“

”یہ بھی تو میں نہیں کر سکتی ناں۔ بس کیا بتاؤ صاحب! میں بہت بری پھنسی ہوں۔ اس بڑھے مجھے جیسے سونے کے بچرنے میں قید کر دیا ہے ساری آزادیاں سلب کر لی ہیں، جی چاہتا خود کشی کر لوں۔“ وہ یہ کہہ کر دڑتے لگی۔

”ارے ارے میڈم! خود کو سنہالے۔“

آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ ہمارا قیمتی سرمایہ آپ کو ہم اس طرح ضائع نہیں جانے دیں

آپ ایسا کریں مجھے ملاقات کا وقت دیں۔ مگر صاحب کو بھی ساتھ لے کر آ جاتا ہوں۔ پھر مل اس مسئلے کے بارے میں سوچ کر کسی حتمی فیصلہ کی کوشش کریں گے۔“

”میاں صاحب! آپ کی بڑی مہربانی۔ اب امیدیں آپ ہی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ پلیز، کریں، ورنہ میں گھٹ گھٹ کر دم دے ڈالوں گا روہانے لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے میں اور خان صاحب کل شام کے ہاں پہنچ رہے ہیں۔“ اس نے کہا تو ستارہ آئیز پریشانی سے فوراً بولی۔

”میاں صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ بڑھے کا چھوٹا بیٹا آج کل ادھر ہے۔ تم نے بھی مجھے وہی طور پر پریشان کر رکھا ہے۔“ جائے گا دو ایک روز میں اپنے گوتھ پھر تفصیل باتیں کر لیں گے۔“

اس صاف کرنا، اگر اس طرز آپ ڈرتی بھی اس قید سے آزاد نہ ہو نہیں سکی۔ وہ کی سے بولا۔ ”اسے بھلا تھا بے معاملات غازی کی کیوں کر جرأت ہونے لگی۔ ہم کل رہے ہیں۔ آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔“

لیک ہے میاں صاحب! لہجے وہ بہت سر۔ خیر، آپ نے صحیح کہا، یوں جب زدہ رہنے ہے میں اب آخری قدم اٹھاؤں۔“

حالی! بس تو ہم کل شام چھ بجے آپ کے دولت میں حاضر ہو رہے ہیں۔“

طائر پروڈیوسر نے مکاری سے ذریعہ لہجے میں مسلسل منقطع ہو گیا۔ میں نے احتیاط کی تھی کہ مجھ پر دیکھ کر دور نہ اگر میں جلالت پسندی سے کام لیں سے پہلے ریسیور رکھ دیتا تو میرے ریسیور ناہنگی سی بھی کلک اسے چونکا کر سکتی تھی پھر اس پر دیکھنے کی کلک سننے کے بعد میں نے بھی اس کے ساتھ ریسیور رکھ دیا۔

ہاں میڈم سے میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ستارہ کے جان کر مجھے اب اس پر بری طرح طیش آ رہا تھا۔ لے ساتھ اس کے دم چلنے پر ڈیوٹر (میاں ج) پر بھی میں غصے سے کھول رہا تھا۔ مجھے بابا

غصہ آنے لگا کہ جانے ان کے دماغ میں اس عمر سائی کہ ایک نو عمر جوان لڑکی سے تیسری شادی تھے اور وہ بھی ایسی لڑکی جو قلمی دنیا کا ستارہ ایسی لڑکیاں چراغ خانہ کبھی نہیں بنتیں۔ ہاں شمع

مردور بنتی ہیں۔ میرے جی میں تو آئی کہ ابھی تارہ کا منہ نوج لوں، لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ اس بارہ تصور بابا جانی کا ہوگا۔“ تو سمجھا مجھے بابا جانی کو

حقیقت سے آگاہ کر دینا چاہیے تھا یا پھر۔۔۔ میں نے کے مزید عزائم کے بارے میں اچھی طرح ری کے بعد کوئی ایسا قدم اٹھانا چاہیے تھا۔“ میں

سوچنے لگا اور مجھے اپنا دوسرا خیال زیادہ مناسب لگا۔ ”سائیں مشا! کیا ہوا۔۔۔؟ خیریت تو ہے؟“

مجھے اندر ہی اندر کھول سلگنا پا کر جمعہ خان نے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں۔ خیریت ہی ہے۔“ میں نے ہولے سے کہا۔

وہ دوبارہ کچھ نہ بولا۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ میں ذاتی

نوعیت کے معاملات میں اس سے کوئی بات نہیں کرنا

چاہتا تھا۔

☆

اب میری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح ان لوگوں کی کل

شام میں ہونے والی ملاقات کی ٹوہ لوں۔ دیکھوں ذرا

یہ لوگ کیا ارادے رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ہی بابا جانی

سے میری گفتگو وزن رکھ سکتی تھی، چنانچہ میں نے ستارہ

کا کام مزید سہل کرنے کی خاطر فوری طور پر ایک

پروگرام ترتیب دیا۔

درحقیقت میں چاہتا تھا کہ جس وقت ان لوگوں یعنی

ستارہ، پروڈیوسر میاں صاحب اور الف خان وغیرہ کی

جب آپس میں خفیہ میٹنگ شروع ہو تو میں انہیں آپس

میں گفتگو کرنے کا مکمل کمر موبچ دوں۔ اس طرح میں

ان کے عزائم سے زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل

کر سکتا تھا۔

چنانچہ اگلے دن شام پانچ بجے کے قریب ہم یعنی

میں، روزی اور جمعہ خان نے دوبارہ باہر سیر کے لیے

جانے کا پروگرام بنایا اور ہلکی پھلکی تیاریوں میں

مصرف ہو گئے۔

ستارہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ ہم بروقت

باہر جا رہے تھے۔ یوں وہ بچی آسانی کے ساتھ خفیہ

میٹنگ کا انعقاد کر سکتی تھی۔ میں نے بھی تاثر دیا تھا

کہ میں ان کی خفیہ میٹنگ کے انعقاد سے مزید سر

ناواقف ہوں۔

جب ہماری روانگی کا وقت آیا تو ستارہ اپنے کمرے



میں موجود تھی اور دیگر نوکر چاکروں کو میں نے بہانے سے ادھر ادھر کھسکا دیا تھا۔ میں نے جود خان سے کہا۔

”جود خان! اب تم ایسا کرو جلدی سے روزی کو لے کر بغرض سیر باہر نکل جاؤ۔ دو تین گھنٹے سے پہلے مت آنا۔“ وہ بے چارہ یک دم گھبرا کر بولا۔

”سس۔۔۔۔۔ سائیں مثالا آ۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ نہیں جائیں گے؟“

”نہیں۔ میں ادھر ہی رہوں گا مگر اس طرح کہ ستارہ اور اس کی ماں کو میری یہاں موجودگی کا علم نہ ہو۔“

”مم۔۔۔۔۔ مگر کیوں سائیں!“

”کیوں کو گولی مار۔۔۔۔۔ جو کہہ رہا ہوں، وہ کرو۔“

”پپ۔۔۔۔۔ پر۔۔۔۔۔ سائیں! نہ روزی میری زبان سمجھتی ہے نہ میں اس کی۔۔۔۔۔ ہم دونوں بھلا۔۔۔۔۔“

میں نے اسے گھورا تو وہ جلدی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”اچھا اچھا سائیں مٹھا ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“

پھر میں نے روزی کو مختصر اچھد باتوں سے آگاہ کیا اور انہیں روانہ کر دیا۔ خود میں گھر میں ہی موجود رہا مگر اس طرح کہ ستارہ کو میں نے ذرا بھی شبہ نہیں ہونے دیا تھا کہ میں گھر ہی میں موجود تھا۔ چنانچہ میں اپنے کمرے میں ہونے کی بجائے اس کے دروازے کو انٹر لاک کر کے میں اندر ہی کسی خفیہ اور محفوظ گوشے میں گھات لگا کر بیٹھا رہا۔ ستارہ اور اس کی ماں نے احتیاطاً اچھی طرح پھر کر گھر دیکھ ڈالا پھر مطمئن ہونے کے بعد ستارہ نے ٹیلی فون پر اس پروڈیوسر میاں صاحب سے رابطہ کر کے اسے پہنچنے کا کہا۔

گھنٹے کے بعد باہر گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ میں براہ داری میں گھات لگائے موجود تھا۔ پھر میں نے دو عدد بھاری بھر کم اشخاص کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ دونوں بیش قیمت سوٹ میں ملبوس تھے۔ دونوں کے قد وقامت مٹھی ہوئی جسامت کے تھے۔ عمریں پینتالیس کے قریب رہی ہوں گی۔ ایک سانولا تھا

جب کہ دوسرے کا رنگ الٹے توڑے کی طرح کالا اور گنجا بھی تھا جب کہ سانولے کے سر اور مونچھوں بال گہرے سیاہ تھے۔ صاف لگ رہا تھا اس نے ایک کو دوسرا کیا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا۔ ان میں سے ایک خبیث پروڈیوسر میاں صاحب اور دوسرا الف ہوگا۔ ستارہ نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا تھا۔ پھر ڈرائنگ روم میں ہی مراجعت ہو گئے۔

☆

ذرا دیر تک یہ لوگ آپن میں رسمی گفتگو کرتے اور اس دوران پینے پلانے کا بھی شغل جاری رہا۔ شراب کو دیکھ کر غصے سے سلگ اٹھا اور غیرت کی آتش جلنے لگا مگر میرا ضبط و تحمل اختیار کرنا بھی ضروری تھا۔

”ہاں، میڈم ستارہ! پھر آپ نے کیا سوچا؟“

سائن کر رہی ہیں یا پھر ہم کسی دوسری ہیروئن کا دورہ کھلنا تھیں۔“

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بالآخر میاں صاحب اچانک ستارہ سے پوچھا تو ستارہ کے جواب دینے پہلے اس کی ٹانگہ ٹائپ ماں تار نے اپنے مختصر بازاری انداز میں ہاتھ نچا کر اس سے کہا۔

”اتنی میاں صاحب! میری بیٹیا ستارہ کے ہوئے بھلا آپ کو کسی دوسری ہیروئن کا دورہ کھلنا تھانے کی کیا ضرورت ہے اور ویسے بھی ستارہ مقابلے کی دوسری ہیروئن کہاں؟“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔۔۔ پروڈیوسر (میاں صاحب) نے کہنا چاہا تو اس بار ستارہ اس کی بات کاٹ کر یک بولی۔

”میاں صاحب! یہ آپ کیسی غیروں والی بات کرنے لگے۔ میں نے تو آپ کو یہاں بلایا ہی ہے لیے تھا کہ آپ کوئی راستہ مجھے بھجائیں گے۔“

”میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“ ستارہ دلائل ادا لئے شکوہ کناں پر پروڈیوسر (میاں

صاحب) نے ذرا مسکرا کر معذرت چاہی، تو اس کے ساتھ بیٹھا کنبے سرد والا کالا بھنگ الف خان بھی اسے ٹوکتے ہوئے بولا۔

”ہاں بھی میاں صاحب! ستارہ خود مشکل کا شکار ہے، اس کی ہم مدد نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟“

دونوں ماں بیٹیاں الف خان کی طرف ممتون نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔

”مجھے اس کا پورا احساس ہے خان صاحب!“

بالآخر پروڈیوسر نے الف خان کی طرف دیکھ کر کہا پھر حریف بولا۔

”دراصل میں جو فلم بنا رہا ہوں ایک تو وہ بڑے بجٹ کی فلم ہے۔ دوسرے میں نے اسکرپٹ اور سچو شٹر کے مطابق نغمات بھی لکھوائے ہیں۔ انٹرنس میرا اب تک لاکھوں روپیہ خرچ ہو چکا ہے اس لیے میں جلد از جلد فلم شروع کر کے مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ زیادہ دیر میرے لیے پیشہ دارانہ گھائے کا سبب بنے گی۔ رہی بات آپ کی مدد کرنے کی تو میں نے خان صاحب (الف خان) سے بھی مشورہ لیا ہے لہذا اب یہی صورت ہو سکتی ہے کہ آپ اپنے شوہر سائیں جی سے عدالت کے ذریعے خلع لے لیں۔“

”لیکن میاں صاحب! خلع لینے کی صورت میں مجھے حق مہر میں ملنے والے دس لاکھ اور اس عالی شان کوٹھی سے بھی ہاتھ دھوئے پڑیں گے۔“ ستارہ کے لہجے میں حد درجہ حرص و طمع تھا۔ جواباً میاں صاحب نے الف خان کی طرف دیکھا اور ایک گہری ہرکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

”خان صاحب! اب آپ ہی ہمیں بتائیں کہ میڈم روہ کو اس مشکل سے کس طرح نکالا جاسکتا ہے۔ میں اسی لیے آپ کو ساتھ لایا تھا اور پہلے سے آپ کو میڈم کی مجبوری سے متعلق آگاہ بھی کر چکا تھا۔“ اس کی بات پر دونوں ماں بیٹی کی امید بھری نگاہیں کنبے الف خان

کے چہرے پر جم سی گئیں۔ الف خان نے ایک خاص انداز سے ستارہ کے چہرے پر نظریں جما کر سرسراہٹے لہجے میں کہا۔

”میڈم ستارہ! اپنے شوہر سے جان چھڑانے کا تو بس ایک ہی طریقہ مجھے بھجائی دیتا ہے کہ آپ اس بڑے کھوسٹ کو زہر دے کر ختم کر دیں۔“

الف خان کے اس سفاکانہ مشورے پر ستارہ کے چہرے پر ایک لمحے کو سراپائی کی آواز پھیل گئی جب کہ اس کی ٹانگہ مار کہ ماں تارہ بیگم کی آنکھوں میں ایک خاص چمک نمودار ہوئی تھی اور اس کا لے کنبے الف خان کے منہ سے اپنے بابا جانی کے خلاف اس سفاک مشورے پر میری رنگوں میں خون چلتے سکتے لاوے کی طرح اچھالیں مارنے لگا۔ ایک لمحے کو تو میرے جی میں آئی کہ ابھی اور اسی وقت اس کا لے بھنگ روٹل الف خان کی گردن دھاووں مگر میں نے یہ مشکل اپنے غیظ پر قابو پائے رکھا۔

”مم۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ مجھ میں۔۔۔۔۔ کسی کو قتل کرنے کی ہمت نہیں ہے اور وہ۔۔۔۔۔ بھی سائیں جی جیسی بھاری بھر کم شخصیت کا قتل۔۔۔۔۔ اس کا ایک منہ جڑھا بیٹا افتخار تو میری جان ہی نہیں چھوڑے گا۔“ لہجے بھر کی سراسیمہ خاموشی پر ستارہ نے خوف زدہ سے لہجے میں کہا۔

”یہ زحمت آپ کیوں کرنے لگیں بھلا؟“ الف خان نے مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا پھر اس کی ماں تارہ بیگم کی طرف دیکھ کر بولا۔

”آپ کی والدہ مجھے اس معاملے میں دلیر نظر آتی ہیں۔“

اس کی جڑ غیب دلانے والی بات پر میں نے دیکھا تارہ بیگم کے مکروہ چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔

”لل۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ افتخار! ستارہ کی آواز میں اس بار دبا دبا خوف تھا۔

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔“



اس مرتبہ پروڈیوسر میاں صاحب نے اسے ہمت دلائی۔ پھر اس سے پہلے کہ ستارہ کچھ کہتی اس کی ماں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”اری بیٹیا! خان بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ اس بڑھے سے جان چھڑانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ اب تو اس کی حکومت بھی چلی گئی ہے۔ دوبارہ اس کے جیتنے کی بھی امید نہیں۔ اس طرح تم اس کی جائدادوں کی بھی مالک بن جاؤ گی۔ تم بے فکر رہو۔ میں یہ کام کروں گی۔“

”جائدادوں کو کوئی مار دے میری کسی طرح اس سے جان چھوٹ جائے۔ میں خود بہت کمالوں گی۔ میں تو اب بری طرح اس بڑھے سے شادی کر کے پچھتا رہی ہوں۔“ ستارہ رو ہنسی ہونے لگی۔

”بس تو پھر میڈم! آپ بے غم ہو جائیں..... مگر زہر دینے والا کام آپ سے بہتر اور کوئی نہیں کر سکتا۔“ الف خان بولا اور سب اس کی طرف استغیاہیہ طلب نظروں سے ٹکٹنے لگے۔ وہ مزید بولا۔ ”اب دیکھو نا..... آپ کے شوہر زیادہ تر آپ کے ساتھ نہیں رہتے اور پھر اسے آہستہ آہستہ زہر دینے کی کوشش ہونی چاہیے۔ یعنی سلو پوائزنگ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے شوہر کے ساتھ ان کی گودھ والی حویلی میں رہیں۔“

”نا بابا نا..... وہاں تو اور بھی میرا دم گھٹ جائے گا۔“ ستارہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

”خان صاحب! میرا تو خیال ہے ادھر ہی جب وہ کبھی آئے تو اسے ایک ہی مرتبہ بہت سارا زہر دے کر ختم کر دیا جائے۔ تارا بیگم نے حتیٰ لچے میں کہا تو بلاخر سب لوگ اس بات پر متفق ہو گئے۔ سرج الاثر زہر لانے کا کام الف خان نے لے لیا تھا۔ مجھے وہ ستارہ پر کچھ زیادہ ہی رنجھتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ ان خبیثوں کے اپنے بابا جانی کے متعلق یہ خطرناک عزائم جان کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی، مگر میں ایسا

کام کرنا چاہتا تھا کہ یہ چاروں قانون کے شکنجے میں جکڑ دیے جائیں، کیوں کہ میں بہر حال ان کے عزائم سے واقف ہو چکا تھا اسی لیے میں اب سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اٹھانا چاہتا تھا۔

☆

اب میرا یہاں ستارہ مینشن میں رہتا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ میں اس بات پر شش دہج کا شکار ہونے لگا تھا کہ کیا اس کرہ یہ حقیقت سے بابا جانی کو آگاہ کروں؟ یا پھر خود ہی سانپ کے بانہی سے نکلنے کا انتظار کر کے اس کا پھن چل دوں۔ مجھے اپنا دوسرا خیال زیادہ بہتر لگا، کیوں کہ میں بابا جانی کی غصے دار طبیعت سے بے خوبی واقف تھا۔ وہ تو یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو جاتے اور جب کہ میں ان شیطانوں کو رستے ہاتھوں قانون کے شکنجے میں جکڑنا چاہتا تھا۔ ایک خیال میرے دامن میں یہ بھی آیا تھا کہ اگر میں بابا جانی کو مکمل کر دوسرے طریقے سے یہ سمجھانے کی کوشش کروں کہ وہ اپنی بیوی ستارہ کو بلا دیر طلاق دے ڈالیں..... تو..... اس تو کے آگے میں بے بس ہو گیا۔ بابا جانی کی غیریت یہ کبھی گوارا نہیں کرے گی کہ وہ اپنی نوجوان بیوی کو طلاق دے کر آزاد کر دیں اور وہ بعد میں گل چھرے اڑاتی پھرے یا بابا جانی کے نام سے مطلقہ کہلائے۔

بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے بہر طور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ روزی اور جمعہ خان سیر پائے کے بعد واپس آئے تو جمعہ خان کا منہ سو جا ہوا تھا۔ مجھے ان حالات میں بھی ہنسی آگئی۔ میں نے اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ اس ہندو کی طرح منہ پھلائے چپکا بیٹھا رہا بلکہ مجھ سے بھی خفا نظر آنے لگا تھا۔ میں نے روزی سے پوچھا۔

”کیا بات ہے روزی! اس ہندو کا منہ کیوں سو جا ہوا ہے؟“

وہ بھی بری طرح اپنی ہنسی دبائے ہوئے تھی۔ اس

کوشش میں اس کے چہرے کی سرخ و سپید رنگت مزید گہری ہو رہی تھی۔ وہ شاید جمعہ خان کی موجودگی میں کھل کر ہنسنے سے اجتناب برت رہی تھی۔ چہ جائے کہ یہ اداس گوریلا مزید ناراض نہ ہو جائے۔

”آخر ہوا کیا.....؟ بتاؤ تو سہی روزی! کیا تم نے اسے ڈانٹ دیا ہے؟“

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو روزی نے یہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بتایا۔

”انی! تمہارا یہ باڈی گارڈ تین چار مرتبہ خون خرابا کرتے کرتے رہ گیا ہے۔“

”کیا.....؟“ مجھے تشویش ہونے لگی۔

”ہاں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ جو بھی مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا یہ اس کی آنکھیں نکال دے۔ تین جگہوں پر تو اس نے کئی افراد کو مار مار کر بڑھال بھی کر ڈالا۔ وہ تو میں نے اسے روکا۔ اب بتاؤ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ ہم دیکھنے والوں کو تو نہیں روک سکتے ناں؟“ میں نے اس کی بات پر ایک گہری سانس لی اور بولا۔

”ہاں مگر جمعہ خان کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ وہ مجھ پر سچے جاں نثار ساتھی کی طرح جان چھڑکتا ہے۔ ظاہر ہے وہ اب تمہیں میری بیوی اور اپنی Sister

inlaw (بھابی) سمجھنے لگا ہے۔“

”مگر انی.....!“

”بس رہنے دو۔ اس موضوع کو، تم نہیں سمجھو گی۔“

میں نے اس کی بات کاٹی اور مسکرا کر بولا۔

”میں ذرا اس اداس لنگور کی بھی خبر لے لوں۔ پھر میں روزی کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر جمعہ خان کے کمرے میں آیا۔ اس کا منہ ابھی تک سو جا ہوا تھا۔

”کیا ہوا یار! اتنی ناراضگی..... اپنے سائیں مشا کے ساتھ؟“ میں نے ہلکا شکوہ کیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

”سائیں مشا! آ..... آپ بس..... بھا جانی (بھابی) سے کہیں کہ وہ..... وہ برقع پہننا شروع کر دے..... یا پھر میرے ساتھ نہ جایا کرے؟“

”ابے وہ تیرے ساتھ کہاں جانی ہے؟“ میں نے کہا۔

”بس سائیں! ٹھیک ہے۔ آپ دونوں ہی کھونٹے چلے جانا، اگر آئندہ میں بھی ساتھ چلا تو میں کسی کا خون کر ڈالوں گا۔“

”اچھا بابا ٹھیک ہے۔ چلو اب منہ سیدھا کر دو۔ بالکل جھپکے ہوئے پیٹے کی طرح ہوتا ہے۔“

وہ یہ مشکل مسکرایا۔ اس کے بعد میں گہری سنجیدگی کے ساتھ اس سے بولا۔

”جمعہ خان! ایک بہت گہیر مسئلہ آن کھڑا ہوا ہے؟“

مجھے یک دم گہری ستانت میں پا کر اس کا بخارا تر گیا اور وہ جلدی سے متھکر لچے میں بولا۔

”کیا ہوا سائیں مشا! خیر تو ہے ناں؟“

”بابا جانی کی جان خطرے میں ہے۔“

”گگ..... کیا.....؟“ اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ تشویش آمیز بے چینی سے بولا۔

”کیا ہوا سائیں! کچھ تو بتاؤ؟“

میں نے اسے ستارہ وغیرہ کی سازش سے آگاہ کر دیا جسے سن کر چند ٹاپے کے لیے وہ بھی ہکا بکار ہو گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں سے غیظ آلودہ چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔

”سائیں! پھر تو اس خطرناک عورت کا فوراً گلاد بوج لینا چاہیے اور ان دونوں خبیث پروڈیوسروں کا بھی۔“

آپ مجھے حکم کر دیا سائیں! ایسے ہی کافی عرصے سے مارا ماری نہیں ہوئی ہے۔“

”ابھی اس کا وقت نہیں آیا ورنہ یہ نیک کام میں پہلے ہی انجام دے چکا ہوتا۔“ میں نے گہیر لچے میں کہا اور اسے اپنے لائحہ عمل کے متعلق بتایا۔



”پرسائیں! ایسا نہ ہو کہ۔۔۔“

”میں نے ہر طرح سے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے جمعہ خان!“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”وقت آنے دو، میں بابا جانی سے ذرا بات کر لوں۔“

یہ کہہ کر میں نے موبائل پر بابا جانی کا نمبر شیخ کیا۔ ٹیل جاری تھی پھر اچانک دوسری طرف سے بابا جانی کی بجائے کسی اور کی آواز ابھری۔

”ہیلو۔“

بابا جانی کے موبائل پر اجنبی آواز سن کر میں بری طرح چونکا تھا تاہم بولا۔ ”ہیلو! بابا جانی سے بات کرنی ہے۔ آپ کون ہیں؟ یہ تو میرے بابا جانی کا موبائل نمبر ہے۔“

”او ویری ٹائس۔۔۔ تم افتخار ہی ہوتا۔ ان کے فرزند ارجمند!“

ایک سنسناتی ہوئی آواز ابھری اور میرے وجود میں دور تک چیختے ہوئے سنائے اترتے چلے گئے۔ یہ آواز۔۔۔ یہ آواز میں کیسے بھول سکتا تھا۔ یہ آواز تو میرے اس دیرینہ دشمن کی تھی جس نے میری اماں جانی اور بہن سلمیٰ کا بڑی سفاکی کے ساتھ قتل کیا ہے۔

”اوہ۔۔۔ لگتا ہے تم مجھے اب پہچانے ہو؟“ میری طویل خاموشی پر اس کی سرسراہٹ استہزائیہ آواز ابھری۔

تشویش نے جکڑ لیا۔ اندیش ناک دوسوں کے سنپولے یک لخت ہی میرے سینے میں کلبلائے گئے۔

”جلدی بتاؤ۔۔۔ بابا جانی کا یہ موبائل تمہارے پاس کیسے آیا؟“

”ہاں۔۔۔ یہ موبائل ہی نہیں بلکہ تمہارے بابا جانی بھی ہمارے قبضے میں ہیں۔“

”ذلیل۔۔۔ کتے۔۔۔ کینے۔۔۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ میرے اندر کا آتش فشاں ایک دم ہی پھٹ پڑا۔

”افتخار! اپنی زبان کو لگام دو۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ میں موبائل بند کر دوں اور پھر۔۔۔“ اس نے غرا کر تہدید

انداز میں دانت اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔

”دیکھو سعید رضا احتشام!“ میں نے اپنی آتش غیظ پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے دانت بھیج کر بولا۔

”تم پر پہلے ہی میری اماں جانی اور میری بہن کے خون کا قرض چڑھا ہوا ہے اگر میرے بابا جانی کا تم نے ذر بال بھی بیکا کیا تو یاد رکھنا سب سے پہلے میں تمہارے خاندان کو تمہاری آنکھوں کے سامنے بے دردی سے ادھیر کر رکھ دوں گا۔ اس کے بعد تم۔۔۔“

”گیدڑ بھمکیوں کی بجائے کام کی بات کر لیں تو زیادہ بہتر ہے۔ تم ضرور مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہے ہو گے؟“ وہ رکا تو میں غیظ آلود لہجے میں بولا۔

”بولتے رہو میں سن رہا ہوں۔“

”میری بابا جانی سے بات کراؤ۔“

”ضرور۔۔۔ ضرور۔“

”ہیلو۔۔۔ پٹ افتخار!“

”بابا۔۔۔ بابا جانی!“ ان کی لرزتی آواز سن کر جیسے ہرادل کسی نے ٹٹھی میں بھیج لیا ہو۔

”پٹ افتخار! تو ادھر مت آنا۔۔۔ مت آنا ادھر۔“ وہ بے چین ہو کر بولے۔ میں نے کہنے کے لیے منہ کھولا

فی تھا کہ اچانک سعید رضا احتشام کی آواز ابھری۔

”یقین آگیا اب۔۔۔ میرے آدمیوں کا انتظار کرو۔“ یہ کہہ کر اس نے موبائل آف کر دیا۔

میں نے غضب ناک ہو کر اپنا موبائل دیوار پر دے مارا۔ میری آنکھوں سے غیظ و انتقام کی چنگاریاں بھی پھوٹنے لگیں۔ میری ہاتھیں سائیں سائیں کرنے لگیں۔ یہی سبب تھا کہ جمعہ خان کے بار بار مضطربانہ انداز میں پوچھنے پر میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔

میں غصے سے مٹھیاں بار بار بھیج رہا تھا۔

”آخر جمعہ خان رو دیا اور اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھ سے بولا۔

”سائیں مٹھا! آپ کو اللہ کا واسطہ، کچھ تو بتاؤ۔۔۔ ہوا۔۔۔ ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“

”جمعہ خان! بابا جانی کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔“ میں نے مرتعش آواز میں کہا۔

”سائیں! میں سر لڑا دوں گا۔۔۔ اس کتے احتشام کو اندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ویسے سائیں وڈا بھوتار تو خیریت سے ہے ناں؟“

”جمعہ خان!“ میں نے کہا۔

”میری بات غور سے سنو۔“ وہ ہمہ تن گوش برآواز ہو گیا۔

روبوٹ جیسی بے حسی طاری تھی۔ وہ ایک لمبی سیاہ کار میں آئے تھے۔

”چلیں ہمارے ساتھ۔“ ایک نے بے تاثر آواز سے کہا۔ میں جان گیا۔ یہ سعید رضا احتشام کے پیچھے

ہوئے کار پرداز تھے جو مجھے لینے آئے تھے۔ میں بلا تامل ان کے ساتھ ہولیا۔ مجھے ڈرائیونگ سیٹ

کے برابر والی نشست پر بٹھایا گیا تھا۔ وہ ان دونوں میں سے ایک نے اسٹیرنگ سنبھالا جب کہ دوسرا عقبی نشست پر براجمان ہو گیا۔ کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔

کار کے شیشے پلاسٹڈ تھے۔ کار کے روانہ ہوتے ہی عقبی سیٹ پر بیٹھے شخص نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ کیا سعید رضا احتشام

جیسا گھاگ اور مکار آدمی اتنا ہی بے وقوف تھا یا پھر اسے اپنی طاقت کا کچھ زیادہ ہی گھمنڈ تھا کہ وہ اس

طرح اپنے دو آدمی بھیج کر اپنی کمین گاہ میں مجھے اپنے لیے موت کا فرشتہ بنا کر بلوا رہا تھا؟ میں نے پٹی

باندھنے کے دوران کوئی مزاحمت نہ کی تھی البتہ میں نے ان دونوں سے چند سوال ضرور کیے تھے مگر جواب

ندار۔۔۔ انہیں شاید مجھ سے کسی بھی نوعیت کی گفتگو کرنے یا سننے کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور میرے ہر سوال پر

انہوں نے خاموش رہنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ ناچار میں نے بھی پھر حیرت سا دھ لیا۔ کار خاصی تیز رفتاری کے

ساتھ دوڑ رہی تھی۔ میرے اندر زبردست پکڑ دھکڑ چھی ہوئی تھی۔ میری ہدایت کے مطابق جمعہ خان ضرور ان

کے تعاقب میں لگ گیا ہوگا۔ اب مجھے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں سعید رضا احتشام کے ان دونوں روبوٹ کی

مثل کار پردازوں کو اپنے تعاقب کا شہ نہ ہو جائے کیوں کہ میں جانتا تھا کہ سعید رضا احتشام نے اپنے

ان دونوں ہر کاروں کو خاص طور پر اپنے تعاقب سے محتاط رہنے کی ہدایت ضرور دے رکھی ہوگی۔ بہر طور مجھے

☆

ٹھیک رات دس بجے دو افراد ستارہ مینشن آئے۔ دونوں میرے لیے اجنبی تھے۔ ان کے چہروں پر



جود خان کی کارکردگی پر بھی پورا بھروسہ تھا۔

”میرا خیال ہے ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے؟“ میری عقی سیٹ پر براجمان ایک گماشتے نے اپنے ساتھی سے کہا اور اس کی آواز دھماکے کی طرح میری سماعتوں پر پھٹی تھی اور ذہن سنسناتا لگا تھا۔

”تم غیر محسوس طور پر نظر رکھو۔ میں اسے ٹریپ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ میرے برابر ڈرائیونگ سیٹ پر اسٹیزنگ سنبھالے اس کے دوسرے ساتھی نے کہا۔

یہ دونوں ایک دوسرے کا نام لینے سے کترارہے تھے اور ان کے لہجوں میں ایک عجیب طرح کا سپاٹ پن بھی تھا یعنی چونکنے کے انداز سے یکسر عاری، جیسے انہیں ان سارے حوالے کی توقع پر حتیٰ کہ انہوں نے مجھ سے بھی یہ اگوانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ آیا یہ میری کسی چالاکی یا ہوشیاری کا دخل تھا۔

”اس کے دونوں ہاتھوں کو پشت کی طرف باندھ دو۔ میں نے متعاقب گاڑی کو ٹریپ کر لیا ہے۔“ ڈرائیور کی غیر تاثر آواز ابھری اور میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔

میرے عقب میں براجمان اس کے ساتھی نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر میرے دونوں ہاتھ پشت کی سمت موڑ کر باندھ دیے۔ اب میں نے محسوس کیا تھا کہ کار کو اپنی منزل کی راہ سے ہٹا کر دانستہ ادھر ادھر گھمایا جا رہا تھا، بلکہ متعاقب کو ڈانچ دینا یا پھر گھیرنا ہی ہو سکتا تھا۔ مجھے جود خان کی نااہلی پر سخت غصہ آنے لگا۔ کم بخت نے میرا جال توڑ کر دکھ دیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی۔

”میرا خیال ہے اسے چیف صاحب کے حکم کے مطابق معائنہ کے گھاٹ اتار دیا جائے۔“ عقی سیٹ والے نے کہا۔ لہجہ بدستور سپاٹ اور غیر تاثر ہی تھا۔

کوہل دینے کی بجائے کسی دیرانے میں لے جا کر فلم کرنے کا ارادہ کیے ہوئے ہوں۔“ اسٹیزنگ سنبھالے ہوئے ساتھی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اب تو مجھے واقعی جود خان کی طرف سے تشویش ہونے لگی۔ کم بختوں نے میرے دونوں ہاتھ بھی باندھ دیے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ سعید رضا احتشام کے مجھے لانے کے لیے بھیجے ہوئے یہ دونوں گماشتے معمولی کار پر داز نہ تھے بلکہ تربیت یافتہ تھے اور جود خان میرے خیال کے مطابق ان کے سامنے طفل کتب ہی تھا۔

”گاڑی عاقب ہو گئی ہے۔“ اچانک ڈرائیونگ سیٹ والے ساتھی نے کہا اور میرے اندر طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔

”ہاں۔ مجھے بھی وہ گاڑی نہیں نظر آ رہی۔۔۔ اسے شاید اس بات کا شبہ ہو گیا ہے کہ ہمیں اپنے تعاقب کا علم ہو گیا ہے۔“

”تاہم پھر بھی تم محتاط رہو، میں کار اب منزل کی طرف موڑ رہا ہوں۔“

میں نے دل ہی دل میں جود خان کی ہوشیاری کی داد دی مگر مجھے اب اس بات کی فکر ستانے لگی کہ کہیں جود خان ہلک نہ جائے؟ بہر طور میں اپنی جگہ ساکت اور خاموش بیٹھا رہا تھا۔ کار کی اسپید اب ایک بار پھر بڑھادی گئی تھی۔

پھر لگ بھگ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد کار کی رفتار بہت تیز آہستہ ہونے لگی اور پھر اس نے ایک تیزی سے موڑ کاٹا اور ایک جھٹکے سے رک گئی۔

مجھے نیچے اتارا گیا۔ ایک نے میرا بازو دبوچ لیا۔ میرے قدم پختہ روش پر لگے ہوئے تھے جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں چنداں دیر نہ لگی کہ میں اس وقت کسی کوٹھی کے فرش پر چل رہا تھا پھر مجھے غالباً ایک کمرے میں لایا گیا اور صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد میری آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی جب کہ ہاتھوں

کو ایسے ہی بندھا رہے دیا گیا تھا۔

آنکھوں سے پٹی اترتے ہی چند لمحوں میں تو میری آنکھوں کے سامنے ترمرے سے ناچنے نظر آئے پھر جب میں نے دو تین بار اپنی آنکھوں کو مسلا تو رفتہ رفتہ کچھ دیکھنے کے قابل ہو گیا۔

یہ ایک مستطیل کمرہ تھا۔ آرام وہ اور خاصا کشادہ۔ میرے سامنے دو افراد براجمان تھے۔ ان میں ایک سعید رضا احتشام تھا جب کہ دوسرا اس کا مقرب خاص راجو راکٹ تھا۔ باقی کم دیش دس بارہ مسلح افراد صوفوں کے عقب میں نیم دائرے کی صورت بالکل چوکنا کمرے تھے۔ ان سب کی نظریں مجھ پر ہی مرکوز تھیں۔

اپنے ازلی دشمن سعید رضا احتشام کو بالکل قریب دیکھ کر میرا دماغ مثل آتش فشاں کے اگلنے لگا اور بالکل غیر ارادی عمل کے تحت میں اپنے ہاتھوں کے جکڑ بند کھولنے کی کوششیں کرنے لگا۔

”بابا جانی کدھر ہیں؟“ میں نے قہر آلود نظروں سے سعید رضا احتشام کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ میری آواز غراہٹ سے مشابہ تھی۔

”دھیرج۔۔۔ دھیرج۔۔۔ افتخار علی خان اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ بے فکر رہو۔ وہ جہاں بھی ہیں بالکل خیریت کے ساتھ ہیں۔“ رضا احتشام نے استہزائیہ لہجے میں کہا اور میں ہونٹ چبا کر رہ گیا۔

”جناب ایہ بہت خطرناک شخص ہے اس کا ابھی اور اسی وقت بلا دیر خاتمہ کر ڈالو۔“ راجو راکٹ نے میری طرف خوں ناک نظروں سے گھورتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔ اس کے لقمہ دینے کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ رضا احتشام کا بہت زیادہ قریبی دست راست تھا اور مجھ سے بری طرح خائف بھی نظر آ رہا تھا۔

”تم نے مجھے بہت وق کیا افتخار علی خان!“ رضا احتشام اپنے خاص گماشتے راجو راکٹ کی بات نظر

انداز کرتے ہوئے مجھے مخاطب کر کے غراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

”تم نے میرے بہت قیمتی آدمی بے دردی کے ساتھ قتل کر دیے۔ ان میں شاہ نواز بھی شامل تھا اور راجو راکٹ تو تمہارے ہاتھوں بال بال مرتے بچا۔ تم نے شاہ نواز کو موت کے گھاٹ اتار کے میرا ایک بازو کاٹ ڈالا اور میں تمہارا بازو دکاٹوں گا۔“

اس کے سرسراہٹے لہجے میں چھپی سفاکی سے میں مرعوب ہوئے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”اور تم نے میری اماں جانی اور بہن کا بے گناہ قتل کیا۔ وہ کس گھاتے میں جاتا ہے۔“

”وہ میرا حق تھا۔“ وہ چیخا اور مجھے اس کی ڈھٹائی آمیز سفاکی پر بے تحاشا طیش آیا، کیوں کہ تمہارے بابا جانی نے میرا حق چھین لیا تھا اور اب بھی باز نہیں آ رہا۔ یہ دستور میرے مقابلے میں دوبارہ انکیشن لڑنے کے لیے تازہ دم ہو کر کھڑا ہو گیا ہے۔“

”مجھے بابا جانی سے ملو۔“ میں نے اپنے اندر کے غیظ ناک ابال پر قابو پاتے ہوئے اس کی طرف گھور کر کہا تو وہ بولا۔

”ہم نے اس سے ایک کمیشنٹ کرنی ہے اگر وہ ہماری ذیل پر عمل کرتا ہے تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا پھر یوں سمجھو ہماری تمہاری ازلی دشمنی ختم۔“

میں نے دل میں کہا۔ ”رضا احتشام! تمہیں بڑی خوش فہمی ہے۔ دشمنی تو اب شروع ہوئی ہے۔“ وہ مزید بولا۔ ”میں اب زیادہ خون خرابا نہیں کرنا چاہتا۔ اسے میری ایک سیاسی مجبوری سمجھ لو۔“

”مجھے کم از کم ایک بار بابا جانی سے مل تو لینے دو۔“ میں نے التجا کی۔

اس نے اپنے ایک گماشتے کو مخصوص اشارہ کیا۔ ذرا دیر گزری دو سح گماشتے بابا جان کو لے کر وہاں نمودار



ہوئے۔ وہ مجھے دیکھ کر اور میں انہیں دیکھ کر بری طرح دل مسوس کر رہ گیا۔ مجھے وہاں ان کے درمیان رسن بستہ حالت میں پا کر بابا جانی کے چہرے پر شدید دکھ کے آثار نمودار ہوئے تھے۔ ان کی حالت بہت شکستہ ہو رہی تھی۔ وہ کمزور بھی نظر آ رہے تھے۔

”بابا جانی!“

”ہٹ افتخارا“

میں بے اختیار اٹھنے لگا مگر مجھے بٹھا دیا گیا۔ رضا احتشام نے جتنی بجائی۔ بابا جانی کو واپس لے جایا گیا۔ میرے اندر رضا احتشام کے لیے غیظ و غضب کا طوفان سر اٹھانے لگا۔ نفرت کی سرخ آندھی میری جلتی آنکھوں میں اتر آئی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں بابا جانی سے کچھ کہتا رضا احتشام اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

لگ بھگ نصف گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ میں نے بہ غور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ خاصا سرور نظر آ رہا تھا۔ پھر صوفے پر براجمان ہو کر مجھ سے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مکاری سے بولا۔

”لو بھی افتخار علی خان! ہماری تمہارے بابا جانی کے ساتھ صلح ہو گئی ہے۔ تمہیں بھی اس بات کی مبارک باد دیتا ہوں کہ تمہارے بابا جانی سے ہماری ڈیلنگ کامیاب ثابت ہوئی۔“

مجھے اس کی خوشی اور سکروہ لہجہ بہت زہر لگا تاہم میں اصل بات جاننے کی غرض سے اپنے اندر کے طیش ناک ابال پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے بولا۔

”آخر کیا بات ہوئی ہے..... بابا جانی سے؟“

”تمہارے بابا جانی کے اب سارے کس بل نکل چکے ہیں۔ وہ اب تمہیں بھی کھونا نہیں چاہتے۔“ وہ کہنے لگا۔ ”انہوں نے آئندہ ہونے والے عام انتخابات میں نہ صرف میرے مقابلے میں میدان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے بلکہ سیاست کے میدان ہی سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کش ہونے کا بھی وعدہ کیا ہے۔“

مجھے اس کی بات سن کر صرف اس حد تک خوشی ہوئی تھی کہ بالآخر بابا جانی نے ہمیشہ کے لیے سیاست کو خیر باد کرنے معمم فیصلہ کر لیا تھا لیکن رضا احتشام کی اس خطرناک خوش فہمی پر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ وہ یہ کیوں بھول رہا تھا کہ میں اپنی اماں جانی اور بہن سلٹی کے قاتل کو معاف کر دوں گا۔ اگر وہ بھول رہا تھا تو یہ میرے لیے مفید تھا۔ بہر طور میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اگر تمہاری بابا جانی سے واقعی یہ ڈیلنگ کامیاب رہی ہے تو اس کی مجھے بھی خوشی ہے کیوں کہ میں خود بھی یہی چاہتا تھا بابا جانی سیاست چھوڑ کر اپنی جاگیروں میں واپس چلے جائیں تو پھر اب ہمارے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ ہم دونوں باپ بیٹے واپس جاسکتے ہیں؟“ میری بات پر رضا احتشام کے چہرے پر اسرار بھری مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ بہ غور میرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

”الیکشن تک اور تمہارے بابا جانی کے میدان سیاست چھوڑنے کے اعلان تک تم ادھر ہی رہو گے۔“ میں اس کی بات پر عجیب سی الجھن کا شکار ہو گیا۔ وہ میری الجھن کو سمجھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”آہ..... نہیں..... تم یہاں میرے پاس قیدی کی حیثیت سے نہیں رہو گے۔ بس یوں سمجھو یہاں تم اے کلاس اے کیئیر کی حیثیت سے اور بالکل عزت و احترام سے رہو گے مگر یہ مشروط پیش کش ہوگی کہ تم یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔“

میں نے دل میں کہا۔ ”اے خبیث انسان! میں تو خود بھی چاہتا ہوں کہ ادھر رہ کر تیرے جیسے خونی قاتل کی گردن سروڑ کر یہاں سے نکلوں۔“ میں نے پوچھا۔

”میرے بابا جانی!“

”انہیں میں نے اس وعدے کے ساتھ چھوڑ دیا ہے کہ وہ جس قدر جلد ہم سے کیے گئے معاہدے کو عملی

جامہ پہنائیں گے اتنی ہی جلدی ان کے بیٹے یعنی تمہیں زندہ سلامت چھوڑ دیا جائے گا۔“ میں اس کی بات پر دہل گیا۔ میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔

”سنگ..... کیا..... کیا..... تم نے بابا جانی کو چھوڑ دیا؟“

”ہاں..... کیوں؟ تمہیں اس کی خوشی نہیں ہوئی؟“

رضا احتشام نے قدرے چونک کر پوچھا۔ ادھر میرے دماغ میں ستارہ اور اس کے خبیث پروڈیوسر میاں صاحب اور الف خان کی زہریلی سازش کے وہ گمناؤں نے الفاظ چکرانے لگے۔ میں بری طرح پریشان ہو گیا۔ یہ علاقہ کراچی کا ہی تھا اور ظاہر ہے بابا جانی یہاں سے جانے کے بعد ہو سکتا ہے اپنی کوشی ”ستارہ مینشن“ کا رخ کرتے اور پھر..... اس سے آگے کا تصور بھی میرے لیے سوہان روح تھا کیوں کہ ستارہ اس خبیث پروڈیوسر الف خان کی ترغیب کے مطابق بابا جانی کو زہر دینے کی سازش پر عمل پیرا ہو سکتی تھی۔ مجھے شدید مضطربانہ حالت میں جتلا دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”کیوں..... کیا بات ہے؟ تم پریشان کیوں نظر آنے لگے؟“

میں شدید تذبذب کا شکار ہو گیا اور سوچنے لگا اسے کیا بتاؤں..... کہ بابا جانی کو ان کی تیسری بیوی ستارہ نے زہر دے کر ہلاک کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے؟ پھر میں نے سوچا کہ اسے بتانے میں غار نہیں۔ اب تو یہ خود سمجھ رہا تھا کہ ہمارے درمیان معاہدہ طے پا چکا ہے۔ ویسے بھی بابا جانی کی جان سے بڑھ کر اور کوئی اہم بات نہ تھی۔ میں نے اس سے صرف اتنا کہا۔

”ر..... ر..... رضا احتشام! وہ میرے بابا جانی کی زندگی خطرے میں ہے۔“

اپنے بابا جانی کی جان کو خطرے میں پا کر میرے جیسے مضبوط اعصاب کے مالک شخص کی بھی زبان لڑکھڑا

گئی۔ وہ قدرے چونک کر اپنی نظریں سکیڑ کر میری طرف گھورنے لگا۔ اسے کسی عجیب سوچ میں غلطاں پا کر میں جلدی سے اس کی سنت کرتے ہوئے بولا۔

”رضا احتشام! وہ..... مجھے جانے دو..... مجھے جانے دو پلیز..... بابا جانی کو اس بات کا بالکل علم نہیں کہ اس کا ایک دشمن گھات لگائے بیٹھا ہے ان کی۔“

”تم میری قید سے آزاد ہونے کے لیے یہ بچوں دالی چال نہیں چل سکتے..... افتخار علی خان!“ وہ گھنیر لہجے میں بولا۔ میرے دل کی دھڑکیں بے ترتیب ہو گئیں۔

”نہیں نہیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں.....“

رضا! مجھے چھوڑ دو یا پھر..... یا پھر اگر تم اسے میری چال سمجھ رہے ہو تو پلیز خدا کے لیے میرے بابا جانی کو اپنے آدمیوں کے ذریعے دوبارہ یہاں بلالو۔ ان سے کہہ دینا کہ میں ان سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہرگز نہیں۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔“ وہ اٹل لہجے میں بولا۔

”معاہدے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے پہل تم دونوں باپ بیٹے کی ملاقات تو کیا ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کر سکتا۔“

”رضا احتشام! میری بات کا یقین کرو۔ میرے بابا جانی کی جان خطرے میں ہے۔“ میں فرط غم و غصے سے پاگل ہو کر چلا یا۔

”آہستہ بولو۔“ اس نے گھور کر سخت لہجے میں مجھ سے کہا پھر پوچھا۔

”دیئے تمہارے بابا جانی کو کس دشمن سے اپنی جان کا خطرہ ہے؟“ مجھے اس سے اس سوال کی توقع تھی مگر میں اسے ابھی بتانا نہیں چاہتا تھا، بولا۔

”دیکھو رضا احتشام! میں نے تم سے کہا تھا کہ تم مجھے بے شک نہ چھوڑو مگر بابا جانی کو کسی طرح یہاں بلالو۔ پھر میرا ان سے سو پائل پر رابطہ کر دو..... میں خود.....“



”ہا، ہا، ہا۔۔۔۔۔“ اس نے اچانک ایک طویل شیطانی قہقہہ بلند کر کے میری بات کاٹ دی۔ میں دم بہ خود نظروں سے اس خبیث کما چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی سفاک چمک نمودار ہوئی اور پھر مکروہ لہجے میں بولا۔

”یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا یعنی ادھر۔۔۔۔۔ باب (بابا جانی) اپنے کسی نادیدہ دشمنی کا شکار ہوگا اور ادھر بیٹا (میں) میرے ہاتھوں بھیاںک موت سے دوچار ہوگا۔ قسمت نے تو میرا کام اور بھی آسان کر دیا۔۔۔۔۔ ہا، ہا، ہا۔۔۔۔۔“

میرا دماغ جلنے لگا۔ اس کے اندر کا اصل خبیث درندہ نما انسان بیدار ہو گیا تھا۔

”ذلیل دعو کے باز میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ میں باگل جونیوں کی طرح چلایا اور اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔

”لے جاؤ اسے۔۔۔۔۔ بند کردو، تھرڈ کلاس کیسٹری میں۔“ رضا احتشام نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر حکمانہ لہجے میں بولا اور پھر اس کے چار ہرکاروں نے مجھے دیوچ لیا۔ میرے منہ سے مغلقات کا طوفان اٹھ پڑا مگر میں بے بس تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ رضا احتشام کی یوٹیاں کوچ لوں۔ مجھے ایک کمرے میں لے جا کر پھینک دیا گیا۔

☆

میرے دل و دماغ کی اس وقت جو کیفیات ہو رہی تھیں وہ صرف اور صرف میں ہی جانتا تھا۔ بابا جانی کی طرف سے میرے سینے میں اندیشوں اور دوسووں کے سنپو کھلا رہے تھے۔ میں ستارہ کی خونی سازش سے واقف تھا۔ وہ تو بابا جانی کے ستارہ مینشن میں آنے کی خطر تھی تاکہ انہیں زہر دے کر ہلاک کر سکے جب کہ بابا جانی اس سازش سے لاعلم تھے انہیں کیا معلوم تھا ان کی نوخیز بیوی ستارہ ایک ناگن کی صورت میں ان کی وہاں

خطر تھی۔

میرے اندر زبردست آندھیاں چل رہی تھیں۔ رضا احتشام کے عزائم سے میں پہلے ہی واقف تھا۔ وہ تو چاہتا ہی یہ تھا کہ ہم باپ بیٹوں کو بے دردی سے موت کے کھاٹ اتار دے۔ اب اسے اچھی طرح یہ گل کھلانے کا موقع ہاتھ آیا تو اس کے خونی عزائم بھی مکمل کر سامنے آ گئے تھے جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ معاہدہ کھلا دھوکا تھا۔

مجھے بابا جانی کی جان کی طرف سے بری طرح تشویش لاحق تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں در دیوار توڑتا ہوا ستارہ مینشن جا پہنچوں اور بابا جانی کو اس ناگن (ستارہ) کی زہریلی سازش سے آگاہ کر ڈالوں۔ مجھے بری طرح پچھتاوا بھی ہونے لگا کہ کاش میں اس وقت ہی ستارہ کا گلا دیوچ لیتا جب وہ اس خبیث پروڈیوسر الف خان کے ساتھ مل کر یہ خونی سازش تیار کر رہی تھی۔

”میرے خدا! اب میں کیا کروں؟“ میں پاگل سا ہو گیا۔ میرا جی چاہا دیواروں سے سرکرا دوں۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

”جمہ خان۔۔۔۔۔ ایہ نام اچانک ہی میرے ذہن میں ابھرا تھا اور پھر میرے اندر کی بے چینی اور مضطرب الحالی کو قرار سا ملنے لگا۔

”ہاں۔ جمہ خان اس سازش سے واقف تھا۔ وہ ضرور بابا جانی کو ستارہ کی اس سازش سے آگاہ کر سکتا تھا۔“ میں نے امید بھرے دل کے ساتھ سوچا، مگر ایک بار پھر میرے دل و دماغ میں تشویش آمیز وحشتیں سر اٹھانے لگیں۔ پتا نہیں جمہ خان کہاں تھا۔ اپنے تعاقب کا شک ہوتے ہی وہ کدھر غائب ہو گیا تھا؟ کیا خبر اس کے ملنے سے پہلے ہی بابا جانی ستارہ مینشن پہنچ کر ستارہ کی خونی سازش کا شکار ہو سکتے تھے۔ میں شدید اعصاب زدگی کا شکار ہو رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں

آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ میرے اندر وحشت کی آندھیاں اٹھنے لگیں اور میں زور زور سے چلانے لگا۔

”رضا احتشام! کہتے۔۔۔۔۔ مجھے آزاد کر دے۔“ میرے بابا جانی کو اگر کچھ ہو گیا تو میں تجھے کہتے کی موت ماروں گا۔“ میں بے بسی سے چیختے چلانے لگا لیکن کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ مجھے یوں لگا جیسے انگر میں زیادہ دیر تک اس بیجانی کیفیات کا شکار رہا تو میرا اندر میں بڑیک ڈاؤن ہو جائے گا۔ میرا دم پھولنے لگا تھا اور میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اچانک میرے دماغ میں اندھیاں اترنے لگیں۔ ذہن میں تاریکی سی چھانے لگی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ شاید میں جوتانہ کیفیات کی زدگی کا شکار ہو کر بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆

دوبارہ ہوش آیا تو مجھے اپنے اعصاب ذرا پرسکون محسوس ہوئے لیکن میری پریشانی اور تشویش بجائے کم ہونے کے اس میں اضافہ ہی ہوا چلا جا رہا تھا اور میں تصور میں بابا جانی کو اس حسین ناگن ستارہ کے ہاتھوں سے دودھ کا وہ گلاس پیتے ہوئے دیکھ رہا تھا جس میں اس حرافہ عورت نے زہر ملایا ہوا تھا۔

میرے اعصاب ایک بار پھر شل ہونے لگے تو میں نے اس بار وحشتوں کے بے لگام گھوڑے کی ہانگ تھامی اور خرد کا دامن پکڑا۔ مجھے آرام و سکون کے ساتھ ان نازک اور انتہائی حالات کا مقابلہ کرنا تھا۔ یوں بیجانی اور جنونی کیفیات میں جھلا ہونا الٹا نقصان کا ہی باعث ہوتا۔ چنانچہ میں نے خود کو ذرا پرسکون کرتے ہوئے چند گہرے سانس لیے اور حالات پر غور کرنے لگا۔ میرا یہاں سے نکلنا اشد ضروری تھا۔

میں نے کمرے کا یہ غور جائزہ لیا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہ تھا۔ دس باگی بارہ کا تھا۔ کوئی کمڑکی نہ تھی۔ روشن دان خاصی بلندی پر تھا۔ وہ بھی چار باگی چھ کا جس کے آہنی چوکے پر فولادی سلاخیں نصب تھیں۔ بادی انگھر میں

مجھے یہ کمرہ اسٹوری فرم ہی معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے دروازے کا جائزہ لیا۔ وہ بند تھا بالکل سپاٹ۔ سب سے پہلے مجھے اپنے دونوں ہاتھوں کی بندشیں کھولنے کا سہیجہ پیدا کرنا تھا۔ میں نے ادھر ادھر کسی تیز دھار شے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر یہ کمرہ میرے علاوہ ہر شے سے عاری تھا۔ اچانک میری نظر کمرے کے بند دروازے کے آہنی لیور پر پڑی جس کے نیچے کی فولادی پلیٹ کسی وجہ کے باعث ذرا اکڑی ہوئی تھی اور ایک تیز دھار سا فولادی ٹکڑا ابھرا ہوا تھا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا چون کہ میرے دونوں ہاتھ پشت کی سمت پر بندھے ہوئے تھے اسی لیے میں نے پشت کی سمت گھوم کر ٹائیلوں کی رسیوں کو ابھرنے ہوئے فولادی ٹکڑے پر رگڑنے لگا۔ اس کوشش میں میرے ہاتھوں کی دونوں کلاٹیاں بھی زخمی ہو گئیں مگر میں نے اس کی مطلق پروا نہ کی اور اپنی ہی کوشش میں لگا رہا۔

معا دروازے کے دوسری طرف قدموں کی آہٹ ابھری۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ میں ایک لمحے کو بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔ پھر باہر تالا کھولنے کی کمز بڑا ابھری۔ میں لپک کر جلدی سے اپنی جگہ تنگی دیوار سے پشت نکالے بیٹھ گیا۔

دو گن مین اندر داخل ہوئے۔ ایک ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں سینڈویچ اور کوئلڈ ہائل تھی۔ ایک نے میرے ہاتھ کھولے دوسرا مجھ پر راتقل تالے چوکتا کھڑا رہا۔ پہلے والے نے میری پشت کی طرف بندھے ہوئے ہاتھ کھول کر سامنے کے رخ پر دوبارہ باندھ دیے۔ میں مایوس ہو گیا۔ پھر وہ سیدھے کھڑے ہو کر بولا۔

”اب تم۔۔۔۔۔ یہ کھا سکتے ہو۔“

میں نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ دونوں چلے گئے اور دروازہ باہر سے لاک کر دیا پھر ان کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ میری بھوک پیاس اڑ چکی



تھی۔ میں نے ٹرے کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور مقصد کی تکمیل کی خاطر جلدی سے اٹھا۔ اب ہائیے کی طرف بندھی ہوئی کلائیوں سے مجھے ذرا آسانی ہو گئی تھی۔ یہ تو شکر تھا کہ نیم اندھیرے کے باعث انہیں رسی کے رگڑاؤ کا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ میں نے دوبارہ اپنی کوشش شروع کر دی۔ رسی کم بخت تائیلون کی تھی اور پھلوں بھی اس لیے مجھے اسے لوہے کے کٹڑے پر رگڑنے میں خاصی طاقت صرف کرنا پڑ رہی تھی اور اس پر مستزاد اس جاں کسل کوشش میں میری دونوں کلائیوں بھی چھل گئی تھیں۔

اچانک مجھے دروازے کے باہر دوبارہ کھڑک کا احساس ہوا۔ میں بری طرح چونکا اور ہونٹ بھیچتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ معاذ دروازہ کھلا۔ ایک رکن بستہ شخص کو اندر دھکیل کر باہر سے دروازہ دوبارہ بند کر دیا گیا۔

میں اس نووارد قیدی کو دیکھ کر بری طرح چونکا اور میرے دل کی دھڑکنیں دھڑھڑانے لگیں۔ یہ جمعہ خان تھا۔ اس کے بھی دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ مجھے پہچان کر دم بہ خود رہ گیا۔

”جمعہ خان! حق..... تم.....؟“ میرے منہ سے لرزیدہ الفاظ برآمد ہوئے۔

”تم ان کے ہتھے کس طرح چڑھ گئے؟“ میرے سوال پر جمعہ خان کے چہرے پر خفت کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے جواب دیے بغیر خاموشی سے اپنا سر جھکا لیا۔ میں دانت بھیج کر اس سے بولا۔ ”جمعہ خان!..... جمعہ خان! تمہیں ان کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہیے تھا۔ یہ..... یہ..... بہت برا ہوا..... بہت برا ہوا یہ جمعہ خان..... تم..... تم.....“

”س..... سائیں! وہ..... مجھے معاف کر دو..... میں نے تو بہت کوشش کی کہ آپ.....“

”تمہیں نہیں پتا جمعہ خان! یہ کتنا برا ہوا۔“ میں نے

اس کی بات کاٹ کر کتبہ افسوس ملتے ہوئے کہا اور اسے حقیقت سے آگاہ کر دیا۔ اس نے جب یہ سنا تو بابا جانی کو رضا احتشام نے ایک معاہدے کے تحت چھوڑ دیا ہے۔ نیز اب وہ بھی یہ جان کر کہ بابا جانی کی زندگی کو زبردست خطرہ لاحق ہے تو اس رذیل نے شیطانی قہقہوں کے ساتھ بابا جانی کو خطرے سے آگاہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اب تو جمعہ خان کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو گیا اور وہ کپکپاتی ہوئی روہائی آواز میں بولا۔

”س..... سائیں! یہ تو واقعی بہت برا ہو گیا۔“

”ش..... ش.....“ میں بے بسی اور جھنجھلاہٹ سے بڑبڑایا اور پھر اس سے پہلے کہ میں ایک بار پھر جنون اور ہجانی کیفیات اور اعصاب زدگی کا شکار ہوتا میں نے رسیاں توڑنے کی پھر دوبارہ کوشش شروع کر دی۔

ایک ایک ہل اندیش ناک لمحات کی دھمک دیتے ہوئے جیسے ہماری سل کی طرح گزر رہا تھا۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اس وقت رات کا آخری پہر ہی ہو گا اور میرے اندازے کے مطابق بابا جانی ستارہ سینشن پہنچ گئے ہوں گے۔ میں تصور میں انہیں ستارہ جیسی ناگن کے ہاتھوں زہر ملا دودھ کا گلاس پیتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

میرے سینے میں بے تحاشہ دھڑک پکڑ جاری تھی۔ رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہونے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سینے میں بری طرح دھڑکتا ہوا دل بچر توڑ کر باہر آن گرے گا۔ میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ کوئی انہونی ہو جائے..... کچھ..... ہاں کچھ ایسا ہو جائے کہ بابا جانی ستارہ سینشن نہ جائیں مگر پھر وہ کہاں جا سکتے تھے اور کوئی جگہ بھی فروکش ہونے کی نہ تھی۔ ان کی بستر نگاری کراچی تھی۔

ادھر ہی تھی کہ مسلسل ایک دو گھنٹوں تک کی کوشش

کے باوجود صرف ذرا ہی سی ادھڑی تھی۔ میں سینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ جمعہ خان اور میں باری باری اس کوشش پیہم میں مصروف تھے بلکہ اب تو وہ لوہے کا ذرا سا ٹکڑا بھی لیور کی آہنی پلیٹ سے ڈھیلا ہو کر بار بار سرک جا رہا تھا۔ اس کے اب اپنی جگہ سے نہ رہنے سے ہمیں دو گنی چو گنی کوشش کرنا پڑ رہی تھی۔ مجھ پر اس قدر جھنجھلاہٹ آ میز طیش سوار ہوا کہ میں پاٹلوں اور جنونیوں کی طرح دروازے کو ٹھوکریں مارنے لگا۔ مجھ پر ایک بار پھر وحشتوں اور پاگل پن کا دورہ پڑ گیا تھا۔ جمعہ خان میری حالت زار دیکھ کر رونے لگا۔

میں رضا احتشام کو کالیاں دینے لگا۔ اسے نکارنے لگا۔ اسے دھمکیاں دینے لگا۔ اچانک دروازہ کھلنے کی آواز ابھری۔ میں نے سرسراہٹ سرگوشی میں جمعہ خان سے کہا۔

”جمعہ خان! اب نہیں تو کبھی نہیں۔ آج اپنی جان کی پروا نہیں کرتی ہے۔“

”سائیں میں سمجھ گیا۔“ وہ جوش سے بولا۔ دروازہ کھلا وہی دو گن بردار اندر داخل ہوئے۔ عقب میں دروازہ بند کیا پھر ہماری طرف گھورنے لگے۔ ایک نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”یہ کیا شور مچا رکھا ہے؟“

”میں لہجے میں خوف سموتے ہوئے کپکپاتی آواز میں بولا۔

”وہ..... وہ..... اوپر..... س..... سائیں.....“ انہوں نے غیر ارادی طور پر سر اٹھا کر چھت کی سمت دیکھا اور پھر بہ یک وقت میری اور جمعہ خان کی لاتعلقی حرکت میں آئیں اور دونوں ہرکاروں کے ہاتھوں سے گتیں نکل گئیں۔ میرے اور جمعہ خان کے چوں کہ دونوں ہاتھ آگے کی طرف بندھے ہوئے تھے اس لیے ہم دونوں نے بہ یک وقت اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیانی خلا میں ان کی گرون دیوچ لی۔

رگیدے ہوئے انہیں چاروں شانے چت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب ہماری پوری کوشش دونوں کا گھلا دیونے کی تھی۔ میں اپنے پورے وجود کی طاقت جیسے دونوں ہاتھوں پر مجتمع کر کے مد مقابل کی گرون دیوچ رہا تھا۔ مجھ پر ویسے ہی جنون غالب تھا اس لیے میں نے ہل بھر میں اپنے مد مقابل کی گرون دیوچ کر اسے ختم کر دیا۔ اس کی آنکھیں باہر کو ابل گئیں پھر ذرا دیر بعد جمعہ خان نے اپنے مد مقابل کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔

دونوں کو جہنم واصل کرنے کے بعد ہم بری طرح ہانپنے لگے۔ پھر میں نے جمعہ خان سے ہرکاروں کی لاشوں کی تلاشی لینے کو کہا۔ جلد ہی ایک کی جیب سے خنجر برآمد ہو گیا ہم نے ایک دوسرے کی مدد سے اپنی کلائیوں کی رسیاں کاٹیں پھر جیسے ہی مردہ ہرکاروں کی گنوں پر قبضہ جمایا باہر راہداری میں دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔

”جمعہ خان! جو بھی نظر آئے گولیوں سے بھون کر رکھ دو۔“

میں نے وحشت لہو رنگ لہجے میں غرا کر کہا اور پھر دروازے کی طرف بڑھے۔ پھر اس کے دروازے سے نکلا۔ سامنے دو گن برداروں کو دیکھتے ہی میں نے ٹریگر دبا دیا۔ گولیوں کی سح خراش تڑتڑاہٹ ابھری اور دونوں ہرکارے جھپٹیں مارتے ہوئے زمیں بوس ہوتے چلے گئے۔ اس کے بعد ہم دونوں راہداری میں آ گئے۔ یہ راہداری مختصر تھی۔ کوشی میں یک دم سناٹا چھا گیا۔ اس غیر معمولی اور غیر متوقع خاموشی پر مجھے حیرت ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے ایک خیال کوڑیا لے ناگ کی طرح میرے دماغ میں کلپلایا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دشمن نے ہماری خطرناکی کو بھانپتے ہوئے ہماری گھات میں چپے بیٹھے ہوں۔

”جمعہ خان! احتیاط سے آگے بڑھو۔ دشمن بہت خطرناک چال چلنا چاہتا ہے۔“ یہ کہہ کر ہم گرد و پیش



میں نظریں دوڑاتے آگے بڑھے۔ پھر ایک کمرے سے گزر کر ہم جیسے ہی وسیع برآمدے میں پہنچے ہم پردہ طرفہ گولیوں کے برست داغ دیے گئے۔ میں چشم زدن میں ایک بڑے سنگی ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ جمعہ خان نے بھی میری تقلید کرتے ہوئے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔

پھر جس سمت سے ہم پر فائرنگ داغی گئی تھی ہم نے اس سمت اپنی گتوں کے آہنی دہانے کھول دیے۔ کئی چیخیں ہماری سماعت سے گھرائیں اور پھر سب سے پہلے میں اپنے دائیں بائیں اندھا دھند فائرنگ کرتا ہوا لگا اور سیدھا گیٹ کی طرف دوڑا۔ جمعہ خان بھی میری تقلید کرتا ہوا بڑھا۔ ہم دونوں گیٹ سے باہر تاریکی میں نکلے اور ایک طرف کو دوڑتے چلے گئے، اگر بابا جانی والا مسئلہ نہ ہوتا تو میں یہاں بڑا خون خرابا کر کے لکٹا اور سعید رضا احتشام اور راجو راکٹ کو کتے کی موت مارتا مگر مجھے ہل کے ہل ستارہ مینشن پہنچنا تھا۔

میرے حساب سے وقت گزر چکا تھا اور میرے دل دو ماغ میں ہزاروں قسم کے اندیش ناک دوسو سے جنم لے رہے تھے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اڑ کر ستارہ مینشن جا پہنچوں۔ میری خوں ناک فطرت کو ہی حد نہ رکھتے ہوئے شاید رضا احتشام کہیں کھولی میں جا دیکھا تھا اور ہم دونوں کو دانستہ نکلنے دیتا تھا۔

اب شرق کی سمت سے پو پھٹنے لگی تھی۔ صبح کا ذب کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ میں دیوانہ وار دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ یہ ایک پوش علاقہ تھا مگر ابھی تک مجھے اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ کراچی کا یہ کون سا علاقہ تھا اور نہ ہی مجھے یہ پتا لگانے کا ہوش تھا بلکہ مجھے تو جمعہ خان کا بھی ہوش نہ تھا۔ میں بس بھاگا چلا جا رہا تھا۔ آگے جا کر میں نے گن بھی پھینک دی تھی۔ مین شاہراہ پر آیا تو مجھے اس علاقے کا ادراک ہوا۔ اکا دکا ٹیکسیاں چل رہی تھیں۔ یہ بھی وہ تھیں جو کینٹ اسٹیشن سے صبح سویرے آنے

والی ٹرین کے مسافروں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں بے چینی سے خالی ٹیکسی کا منظر تھا۔ جمعہ خان بہ دستور میرا سایہ بنا ہوا تھا۔

میں شدید مضطرب الحال ہو رہا تھا پھر اچانک ایک ٹیکسی نے کہیں قریب ہی سواری اتاری اور خود ہی ہمیں مطلوبہ سواری بھانپ کر ہارن دیتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ میں اور جمعہ خان غراب سے اس میں جا سوار ہوئے اور میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو اجرت خالص دینے کا وعدہ کرتے ہوئے اسے ستارہ مینشن کا پتہ بتا کر ٹیکسی کو تیز رفتار سے بھاگانے کا کہا۔ ستارہ مینشن کا راستہ یہاں سے ایک کھٹنے کی مسافت پر تھا۔

ٹیکسی تیزی رفتار سے دوڑنے لگی مگر پرانے ماڈل کی وجہ سے اس کی فل اسپید اسی سے زیادہ نہ تھی۔ میں بے چینی سے ہاتھ ملنے لگا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے فل ایکسیلیئر پیرد ہار کھا تھا۔

”اڑے بابا! تیز دوڑاؤ۔۔۔۔۔ تیز دوڑاؤ۔“ میں نے شدید مضطربانہ انداز میں کہا۔ ٹیکسی ڈرائیور میرے لہجے کا اندازہ کرتے ہوئے بولا۔

”سائیں جی اس سے زیادہ نہیں چھٹکتی۔۔۔۔۔ میں بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ پھر ایک گھنٹہ ایک صدی کے صداق تمام ہوا۔ ستارہ مینشن کے سامنے ٹیکسی رکی اور میں اسے کراہیہ دے کر سیدھا گیٹ کی طرف دوڑا۔ میرے دل دو ماغ میں بری طرح سائیں سائیں ہو رہی تھی اور دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا تھا۔ مجھے اپنے اعصاب مضمحل پڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ اندیشوں اور دوسوسوں کی یلغار سے مجھے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

ستارہ مینشن پر ویرانی کا راج تھا۔ میں نے گیٹ کے قریب پہنچ کر شدید مضطربانہ انداز میں کال منل بجائی اور اس وقت تک انگلی نہ ہٹائی جب تک گیٹ مین نے دروازہ نہ کھول دیا۔ وہ چڑھے ہوئے تیوروں

کے ساتھ باہر نکلا مگر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی ایک دم مووب ہو گیا۔

میں یہی دعا مانگنے لگا کہ کاش بابا جانی ادھر نہ آئے ہوتے ہوں۔ کاش! یہ چونکدار میرے سوال پر مجھے یہ مژدہ جانفز اسنادے کہ بابا جانی تو ادھر آئے ہی نہیں۔ میں نے بہ مشکل تھوک نکل کر اس سے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”بابا جانی تو نہیں آئے یہاں۔“ میری دھڑکتی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور بے چینی سے منظر تھیں کہ وہ انگار میں سڑ ہلا دے۔

”جی سائیں! صاحب جی تو کل رات ہی اچانک یہاں آ پہنچے تھے۔“ اس نے جواب دیا اور مجھے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔ میں اندر دوڑا۔

”کاش! اس ناگن (ستارہ) نے ابھی اپنی زہریلی سازش کو عملی جامہ نہیں پہنایا ہو؟ یہ ضروری تو نہیں تھا کہ بابا جانی کل رات آئے اور اس نے کل رات ہی انہیں زہر دے دیا ہو؟“ میں یہ دعائیں مانگتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اندر سناٹا طاری تھا۔

میں پاگلوں کی طرح ”بابا جانی!۔۔۔۔۔ بابا جانی!“ پکارتا ہوا ان کے بیڈ روم کی طرف بڑھا اور تمام اخلاقیات کو بالائے طاق رکھتا ہوا ان کے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ اس اثنا میں تو کر جا کر بھی بیدار ہو چکے تھے پھر اس سے پہلے کہ میں بیڈ روم کے دروازے پر دستک دیتا دروازہ یک دم کھلا۔ سامنے مجھے اس ناگن ستارہ کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ شاید شور سن کر بیدار ہوئی تھی اور اس کے جسم پر شب خوابی کا لباس نظر آ رہا تھا۔ میں نے ہل کے ہل محسوس کیا کہ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اس کے چہرے پر یک دم گہری تشویش اور سراسیمگی کے آثار طاری ہو گئے تھے۔ میرا دل یکبارگی کسی اندیش ناک خیال سے بری طرح دھڑکا۔ میں نے انگار برساتی آنکھوں سے اس کے چہرے کی

طرف دیکھا اور پھر غراہٹ آمیز آواز کے ساتھ اس کی گردن دو بوجتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے حلق سے کھٹی کھٹی چیخ نکل گئی۔ ایک نوکر نے اپنی بی بی جی کی نمک حلائی بھانے کی کوشش کی جسے جمعہ خان نے ایک زور دار تھپڑ کے ساتھ زمین پر لٹا دیا۔ ستارہ بری طرح دہشت زدہ نظر آ رہی تھی۔ میں اندر داخل ہوا اور بیڈ کی طرف دیکھا۔

بابا جانی بیڈ پر بے سدھ لیٹے ہوئے تھے۔ میرے اندر ہول ناک خیالات کوڑیا لے ناگوں کی طرح چھن کاڑھنے لگے۔

”بابا جانی!۔۔۔۔۔ بابا جانی!۔۔۔۔۔“ میں انہیں پکارتا ہوا ان کی جانب بڑھا۔۔۔۔۔ انہیں بری طرح جھنجھوڑ کر جگانے لگا۔ اچانک میری نظر بابا جانی کے چہرے پر پڑی۔ ان کی باجھوں سے مجھے خون کی ایک پتلی لکیر بہتی نظر آئی اور میں ساکت ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے وجود سے روح نکل کر عالم ارواح کی طرف پرواز کر گئی ہو۔ ناگن اپنا کام کر چکی تھی۔ وہ میرے بابا جانی کو ڈس چکی تھی۔ زہر نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ ستارہ کی زہریلی سازش کا سیلاب ہو چکی تھی۔ رضا احتشام نے میرے خاندان کو ختم کرنے کا جو مذموقہ کر رکھا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔

ایکا کی مجھے یوں لگا جیسے میرے ارد گرد ان گنت آتش فشاں پہاڑ لاوا اگل رہے ہوں۔ چاروں طرف سرخ آندھیاں چل رہی ہوں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر کا اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص دم توڑ رہا ہو اور ایک نیا انسان ابھر رہا ہو۔ ایسا انسان جو سربا آگ تھا۔۔۔۔۔ آتش فشاں تھا۔۔۔۔۔ ایک طوفان تھا۔۔۔۔۔ جس نے لندن کے انڈر ورلڈ بد معاشوں کو ناکوں چنے چبا دیے تھے۔۔۔۔۔ جس نے ایف بی آئی کے بد طبیعت ڈائریکٹر مائیکل ٹائیڈل سمیت ان کا ناک میں دم کر ڈالا تھا۔



میں نے دم بہ خود کیفیات میں بابا جانی کا معائنہ کیا۔ وہ ختم ہو چکے تھے۔ حاجی اللہ وراہو خان بالآخر اپنے دیدہ و ناویدہ دشمنوں کی سازشوں کا شکار ہو چکا تھا اور مجھے وہ ختم کر چکے تھے۔ حاجی اللہ وراہو خان کی کہانی ختم ہو چکی تھی مگر اس کے بیٹے افتخار علی خان کی کہانی اب شروع ہوئی تھی۔

جمعہ خان بھی سکتے ہیں آگیا تھا۔ دیگر نوکر چاکر گھبرائے ہوئے وہاں آچکے تھے۔ ستارہ کی ماں تارا بیگم بھی آچکی تھی۔ میں نے پلٹ کر وحشت لہورنگ نظروں سے ستارہ کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ درود پڑ چکا تھا۔ تارہ کی بھی بڑی ہلکی حالت ہو رہی تھی۔ ستارہ سینشن میں کہرام مچ گیا۔

”دودھ کا وہ خالی گلاس کدھر ہے..... تاکن!..... جس میں تو نے میری بابا جانی کوڑھ ملا کر دیا تھا۔“ میں نے ستارہ کی طرف دیکھ کر ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ دونوں ماں بیٹیوں کے چہرے دھواں دھواں ہو گئے۔

”ی..... ی..... یہ..... یہ تم.....“

”تو خاموش رہ بازاری عورت!“ میں نے حلق کے بل دھاڑ کر تارا بیگم کو خوں ناک نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ستارہ کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس سے ایسا غیر متوقع سوال بھی پوچھ سکتا ہوں۔ وہ مجھے یوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے نکلے جا رہی تھی جیسے میں کوئی جادوگر تھا۔ کوئی ماورائی مخلوق تھا۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے مگر آواز برآمد نہیں ہو پا رہی تھی۔

”میں پوچھتا ہوں..... وہ گلاس کدھر ہے؟“

میں نے اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ غش کھا کر گر گئی۔ تارا بیگم میری ہنسی کہہ کر اسے سنبھالنے لگی۔ میں نے نوکروں کو اس کمرے میں اکٹھا کر لیا۔

”مجھے دودھ کا وہ گلاس چاہیے..... ورنہ تم سب لوگوں کو پولیس کے حوالے کر ڈالوں گا۔“

نوکر بری طرح بدحواس ہو رہے تھے۔ میں نے ستارہ

کے چہرے پر پتھروں کی بارش کر دی۔ وہ مکار فوراً ہوش میں آگئی۔ اس کی ماں ڈھٹائی سے روتے ہوئے بولی۔

”یہ ظلم ہے..... میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گی۔ میری پھول سی ہنسی پر تم نے ہاتھ.....“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے اس کی موٹی گردن دبوچ لی۔ میں نے جمعہ خان کو پولیس کو اطلاع کرنے کا کہا۔

چشم زون میں پولیس آن پہنچی۔ میں نے انسپکٹر سے اپنا تعارف کروایا۔ اس نے روزی کے سوائے سب کو موبائل میں ڈالا اور تھانے لے گئے۔ میں نے بوجھل دل کے ساتھ یہ جانکاہ اطلاع گوٹھ حویلی میں پہنچائی۔ بابا جانی کی لاش باقی ایئر لے کر میں خود گوٹھ پہنچا۔ روزی اور جمعہ خان میرے ساتھ تھے۔ حویلی میں کہرام مچ گیا۔

حاجی اللہ وراہو خان کا قتل معمولی بات نہ تھی مگر یہ دنیا ہے..... یہاں نہ جانے ایسی کتنی شخصیات قتل ہو گئیں۔ ماتم ہوا..... اور پھر وہی روز و شب ترے مرے.....

بابا جانی کی آخری رسوم کی ادا نیگی کے بعد میں واپس کراچی آگیا۔ انسپکٹر نواز کو قتل کی تفتیش پر مامور کیا گیا تھا مگر کافی تلاش بسیار اور کوشش کے باوجود کوئی ایسا ثبوت نہ ملا جو ستارہ اور اس کی ماں تارا بیگم کو مجرم ثابت کرنا، البتہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق یہ بات ضرور ثابت ہو چکی تھی کہ بابا جانی کی موت زہر خوانی سے واقع ہوئی تھی اور انہیں یہ زہر دودھ میں ملا کر دیا گیا تھا۔ وقت رات نو اور دس بجے کے درمیان تھا۔ نوکر چاکر رہا ہو چکے تھے مگر ستارہ اور تارا بیگم کو لیڈرز پولیس تھانے منتقل کر دیا جا چکا تھا۔ میں نے اس ایف آئی آر میں پروڈیوسر میاں صاحب اور الف خان کے نام بھی درج کرا لیے تھے۔ عدالت میں مقدمہ بازی کی مہم شروع ہو گئی۔ میں نے بھی شہر کے سب سے اچھے اور چوٹی کے وکیل کو ہائر کیا تھا۔

جج نے کیس کی روداد اور میری کہانی سن کر مجھ سے سب سے پہلا سوال یہ کیا تھا کہ ”اگر میں اس سازش سے واقف ہو چکا تھا تو میں نے پہلے ہی پولیس کو کیوں نہ بتا دیا؟“ ستارہ کے وکیل صفائی نے بھی یہی نکتہ اٹھا کر میرے کیس کو کمزور اور اپنی موکلہ ستارہ کے کیس کو مضبوط کرنے کی کوشش کی۔

اگرچہ میں نے جج صاحب سے بھی کہا تھا کہ میں مجرموں کو رکے ہاتھوں گرفتار کر دانا چاہتا تھا مگر ستارہ کے وکیل نے میری بات بد کرتے ہوئے جج سے کہا کہ ”یور آ زرا کوئی بیٹا اپنے باپ کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کا رسک نہیں لیتا۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ سرے سے ایسی کسی سازش سے واقف ہی نہ تھا۔ وراصل وہ ستارہ کو پسند ہی نہیں کرتا تھا کیوں کہ ستارا اس کی ماں پر سوکن بن کر آئی تھی۔“

الغرض جج بازبان وکیل نے ایسی ایسی تمہیریاں دیں کہ اچھا بھلا سیدھا سبھاؤ کیس ملغوبہ بن کر رہ گیا اور پھر یوں وہ دن میرے لیے ایک بدترین دن ثابت ہوا جب میرے بابا جانی کے قاتلوں کو عدالت نے باعزت بری کر دیا۔

میں ستارا سینشن پہنچا تو ستارا، اس کی ماں تارا بیگم، پروڈیوسر میاں صاحب اور الف خان وہاں جشن رہائی منا رہے تھے۔ میں خوں ناک نظروں سے ایک ایک کے چہروں کو گھورے جا رہا تھا۔ ان سب کے چہروں پر مکروہ مسکراہٹیں اور وہ دونوں ماں بیٹیاں ستارا اور تارا بیگم تو خوشی سے پھولے نہیں سار ہی تھیں۔

”چلو مسٹر! اب یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ کیوں کہ اب یہ کوٹھی میری ملکیت ہے۔“ ستارا نے زہریلے لہجے میں مجھ سے کہا۔ اس کے لہجے میں کوٹ کوٹ کر رعونت اور تضحیک آمیزی تھی۔

”ہاں..... ستارا..... تم ٹھیک کہتی ہو۔“ میں اپنے اندر کے ابال پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے بولا۔ پھر ان

چار دیو سبازشی عناصر کے چہروں پر باری باری نظرس ڈالتے ہوئے مزید کہا۔ ”تم چاروں جی بھر کر خوشیاں مناؤ کیوں کہ اس کے بعد تم لوگوں کو اپنے اوپر ماتم کرنے کا بھی موقع نہیں مل سکے گا۔“ میں نے کہا۔ ستارا اور تارا بیگم کے چہروں پر خوشی کے اندازے ہوئے تاثرات چشم زون میں فرو ہو گئے۔

☆

اتنے طوفان اور آندھیاں گزرنے کے باوجود معمولات لگے بندھے اوقات میں بیٹنے لگے۔ میں اور روزی چوں کہ کراچی میں ہی بہ طور ریسرچ اسکالریونی درسی جوائن کر چکے تھے اور وہیں ہماری رہائش بھی تھی۔ جمعہ خان میرے ہمراہ تھا۔ میں نے اور روزی نے سادہ سی تقریب میں شادی کر لی تھی۔

میں نے خود کو پرسکون کرنے اور نئے سرے سے، نئے دلوں اور جوش..... عقل و خرد سے اپنے دشمنوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی منصوبہ بندی کرنے کے لیے چار چھ ماہ تک بالکل خاموشی اختیار کر لی۔ یہ بھی میری ایک مصلحت تھی۔ میں چاہتا تھا ذرا حالات پر وقت کی دھول جم جائے مگر میں جانتا تھا کہ میرے دشمن میری اس طویل خاموشی کو کسی بڑے طوفان سے ہی تعبیر کیے اپنی اپنی کمین گا ہوں میں ٹھنک لیے دیکھے بیٹھے ہوں گے۔

روزی حیران تھی کہ میں یوں اچانک کیوں کر خاموش ہو کر بیٹھ رہا تھا؟ وہ مجھے جانتی تھی میں اپنے دشمنوں کو ذرا بھی موقع دیے بغیر ان کا صفایا کر دیا کرتا تھا، مگر جمعہ خان کو میری اس طویل خاموشی پر ذرا بھی حیرت نہ تھی، کیوں کہ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ میرے لیے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ جمعہ خان جانتا تھا کہ میں بہ ظاہر خاموش ہوں مگر میرے اندر دشمنوں سے انتقام لینے کی ایک ایسی منصوبہ بندی جنم لے رہی ہے جو اپنے بدترین دشمنوں کو موت سے بڑھ کر سزا سے دوچار



کرنے والی تھی۔ ایک ایسی انوکھی سزا ایسا انوکھا انتقام کہ دشمن اپنی آنکھوں سے اپنی موت کا منظر دیکھے اور بار بار جی کر بار بار مرے حتیٰ کہ خود ہی میرے سپاہی ہاتھ جوڑ کر اپنی موت کی مجھ سے بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائے۔

☆

”جمعہ خان! حرکت میں آ جاؤ۔“

ایک روز میں نے اس سے بڑے سرسرا تے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی ایک دم آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”اللہ سائیں! کا شکر ہے۔۔۔۔۔ آپ بولے تو سہی۔ حکم کرو سائیں! مثلاً! میں اپنے خون کی گری نکالنے کے لیے بہت بری طرح بے چین ہوں۔“ اس کے جاں نثارانہ لہجے میں انتقام کا سمندر موجزن تھا۔

”مجھے دو روز کے اندر اندر پروڈیوسر میاں صاحب کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔ ہر قسم کی معلومات سمجھ رہے ہوں؟“ میں نے کہا۔

”حاضر سائیں! سمجھ رہا ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“

”اور۔۔۔۔۔ الف خان کے بارے میں بھی؟“ ”ہاؤ سائیں! یہ کام بھی ہو جائے گا۔۔۔۔۔ اور حکم؟“ ”بس۔۔۔۔۔ پہلے یہ کام کر کے مجھے بتاؤ۔“ میں نے گیسٹر سچیدگی سے کہا۔

”ٹھیک ہے سائیں!“ اس نے سر ہلایا۔ دو دن بعد جمعہ خان نے مجھے سب سے پہلے میاں جی کے بارے میں تفصیلاً اور سوالا جواباً معلومات بہم پہنچائیں۔

”اس کا اصل ٹھکانا؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ کلکشن کے ایک بنگلے میں رہتا ہے۔“ جمعہ خان جواباً بولا۔

”اس کے بیوی بچے؟“ ”پہلی بیوی وفات پا چکی ہے۔ دوسری زینت کے

تایم سے حیات ہے۔ اس سے دو بچے ہیں۔ بڑا لڑکا کبھی کالج میں پڑھتا ہے۔ لڑکی میٹرک میں۔“

”آپ اس پاس اور کوئی عزیز رشتے دار؟“ ”کسی سے کوئی تعلق نہیں۔“

”گھر آنے جانے کے معمولات؟“ ”قلم کے سلسلے میں وہ راتوں کو دیر سے گھر آتا ہے۔ عموماً دو بجے تک آ جاتا ہے۔“

”اس کا دفتر؟“ ”اس کا بڑا شاندار اسٹوڈیو۔“

”تعریف نہیں جمعہ خان۔۔۔۔۔ تعریف نہیں۔۔۔۔۔ صرف کام کی بات!“

”بب۔۔۔۔۔ بب۔۔۔۔۔ برابر سائیں۔۔۔۔۔ برابر۔۔۔۔۔ اس کا دفتر بھی کلکشن میں ہی ایک کثیر المخر لہ عمارت میں ہے، لیکن آج کل قلم کی شوٹنگ وغیرہ کے سلسلے میں وہ ساحل سمندر کے قریب رہتا ہے۔“

”جگہ کا نام؟“ ”سینڈز پٹ۔“

”کل۔۔۔۔۔ کب اور کہاں ملے گا؟“ ”صبح دس بجے کے بعد وہیں سینڈز پٹ کے مٹ

میں۔“ ”کل ہم نے لکھا ہے۔“

”برابر سائیں!“ ”ایک بات کا خاص خیال رہے۔“

”جی سائیں!“ ”اپنے ساتھ کوئی ہتھیار حتیٰ کہ چاقو تک بھی نہیں لے کر جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے سائیں!“ وہ میری اس بات پر ذرا تحیر تو ہوا تھا مگر اس میں کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ ہو سکا۔ اگلے روز صبح دس بجے میں اور جمعہ خان اپنی نئی زیرو میٹر کار میں سینڈز پٹ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

☆

ساحل سمندر پر شوٹنگ جاری تھی۔ دو گھنٹہ شائقین بھی یہ شوٹنگ دیکھنے میں محو تھے۔ پروڈیوسر میاں جی اپنے کام میں منہمک تھا اور ڈائریکٹر ہیڈ عین عین نظر آ رہا تھا۔ فلم کی ہیروئن ستارا تھی۔ ایک ہیرو بھی تھا۔ دونوں پر چوتھینٹو کے مطابق ایک گانا گایا جا رہا تھا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں، مگر میں بالکل سپاٹ چہرے کے ساتھ کار سے اتر۔

شوٹنگ کے دوران سب سے پہلے ستارا کی نگاہ مجھ پر پڑی اور اس کے چہرے کی رنگت یک دم پیلی پڑ گئی۔ میں نے دانستہ سگریٹ سلگائی اور شائقین کے ساتھ مل کر کھڑا ہوا۔ ظاہر شوٹنگ دیکھ رہا تھا مگر درحقیقت میں ستارا کو ہی گھورے جا رہا تھا۔ میری نظروں کی خوں ناک چمک کو محسوس کر کے اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اس کا دھیان شوٹنگ سے ہٹ گیا۔ سب پریشان ہو گئے۔

ایک آپ کر دیا گیا۔ وہ سیدھی میاں جی کے پاس پہنچی اور میں نے دیکھا اس نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ میاں جی نے میری طرف چونک کر دیکھا۔ میں اور جمعہ خان بہ ظاہر بے پروا اور چہل قدمی کے انداز میں جھوم سے ذرا پرے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اچانک میرے ہونٹوں پر ذہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی کیوں کہ میری توقع کے عین مطابق میاں جی دانت پیستا ہوا میری طرف ہی بڑھا چلا آ رہا تھا۔

”تم اگر سمجھتے ہو کہ اس طرح ستارا کو اپنی جھلک دکھا کر خوف زدہ کر دو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔۔۔۔۔ مسٹر افتخار علی خان!“ وہ میرے قریب آ کر مجھ سے دانت بچھنج کر بولا۔

”جمعہ خان نے میری ہدایت کے عین مطابق ایک ہولائی مکالمہ اچھالا۔“

”زہر کو زہر کاٹتا ہے۔ زہر سے مارا ہے تو زہر سے ہی نرو گے۔“ میاں جی نے گھور کر جمعہ خان کی طرف دیکھا۔ ”میاں جی! عن قریب تمہاری حسین و جمیل بیوی

زینت تمہیں دودھ میں زہر ملا کر دینے والی ہے۔“ میں نے لہجہ بھرتے لہجے میں اس سے کہا۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر لڑکھائے جانے خوف کا ارتعاش سا ابھرا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اپنے نادیدہ خوف پر قابو پاتے ہوئے نفرت انگیز لہجے میں بولا۔

”بکو اس بند کرو اپنی اور دفع ہو جاؤ۔“

”ناہ، ناہ، ناہ۔۔۔۔۔ میاں جی! میں تو تمہاری اتنے بڑے بھٹ والی فلم کی شوٹنگ دیکھنے آیا ہوں۔ بھلا میں بے چارہ اکیلا تمہارا کیا بکاڑوں کا؟“

میں نے اسرار بھری بے نیازی سے کہا اور سگریٹ کا طویل کش لے کر دھواں فضا میں اگلا اور دوبارہ بولا۔ ”اور ہاں بس تم ذرا ایک بات کا خیال رکھنا کہ کھانے پینے کی ذرا ذرا سی اشیا کو بھی دیکھ بھال کے کھانا کیوں کہ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا میں ایک فارن ریٹرن سائنسٹ ہوں بڑے ہی عجیب و غریب اور سرخی الاثر چمک زہروں کی قسمیں ہیں میرے پاس۔ کم بخت پتا بھی نہیں لگنے دیتے کہ محدے میں زہر پہنچا ہے یا کھانا۔“

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“ وہ بولا۔ میں نے دیکھا اس کی پیشانی پر غمی بونے میں چمکنے لگی تھیں۔

”نا بابا نا۔۔۔۔۔ دھمکی دینا تو بزدلوں کا کام ہے۔ میں تو بے چارہ ایک ایسا بہادر شخص ہوں جو اپنے دشمنوں کو نہ بھولتا ہے اور نہ ہی معاف کرتا ہے۔“ یہ کہہ کر میں کار کی طرف بڑھ گیا۔ جمعہ خان میرے ساتھ تھا۔ میں نے کار آگے بڑھادی۔ میاں جی کو میں نے کم کم کھڑے پایا تھا۔ میں نے بھی کھڑکی سے ہاتھ ہلا کر اسے بائی کیا۔

”واہ سائیں! مثلاً! آپ نے تو میاں جی کا سکون ہی چھین لیا۔ اب تو وہ بڑا وہی بن جائے گا۔“ سڑک پر آتے ہی کار کی میں نے رفتار بڑھائی تو جمعہ خان نے چمک کر مجھ سے کہا۔

”ہاں، کیوں کہ وہ اچھی طرح جان گیا ہے یہ بات







گوجرانوالہ کی رہنے والی تھی۔ ماں باپ اس کے غریب تھے۔ اس کی ایک خالہ یہاں کراچی میں رہتی تھی۔ اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ پرویز نام تھا اس کا۔ ماں باپ کے انتقال سے چند روز پہلے ہی شاہدہ کی شادی خالہ کے بیٹے پرویز سے کر دی گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ پرویز اچھی فطرت کا انسان نہ تھا۔ وہ پرلے درجے کا گھٹو شخص تھا اور اس کے جذبات پیشہ لوگوں سے بھی تعلقات تھے۔ شاہدہ نے سوچا تھا کہ شادی کے بعد اس کی حسرت الخالی سے جان چھوٹ جائے گی مگر یہاں بھی ہر سے پیٹ کے لالے پڑے رہتے تھے۔ پھر خالہ کا بھی انتقال ہو گیا تو پرویز کے اوباش دوستوں کا گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ وہ لوگ رات گئے بیٹھے ناش کی بازی سجاتے رہتے تھے۔

شاہدہ ان کے لیے چائے بنا بنا کر چمکتی جاتی۔ بلا خر رفتہ رفتہ شاہدہ کو اپنے شوہر پرویز کی بد طبیعتی کا اندازہ ہونے لگا مگر تب تک پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا کیوں کہ پرویز نے شاہدہ کو بھی اپنے ساتھ رنگ لیا تھا اس نے اسے راہ بدر لگا دیا۔ پھر کچھ عرصے بعد اس کا بھی لڑائی جھگڑوں میں مل ہو گیا اور یوں شاہدہ دنیا میں تنہا رہ گئی۔

”تم نے اس راہ بدر کو پرویز کے انتقال کے بعد چھوڑا کیوں نہیں؟“ ساری کھانسنے کے بعد وہ ایک سنجے سکراہٹ کے ساتھ بولی۔

”میں اب اس دلدل میں بہت آگے تک جا چکی ہوں۔ ویسے میں نے ملازمت کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہ مل سکی جہاں ملی بھی تو وہاں بھی دردناک خانہ بچی و حندہ ہو رہا تھا پھر میں نے چھوڑ دی۔“ میں چند لمحے کچھ سوچتا رہا اس کے بعد بولا۔

”تم میرا ایک کام کرو گی؟“

”ہاں بولو۔“

”جہیں ایک شخص کے ساتھ کچھ تصویریں اتارنا ہوں گی۔۔۔۔۔ بالکل ننڈ۔“

”کیا مطلب؟“ وہ نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں بولی۔

وہ شاید ننڈ کا مطلب نہیں سمجھی تھی۔ میں نے اسے آسان لفظوں میں سمجھایا تو حسب توقع اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری اور وہ فوراً ہی پیشہ وارانہ دائی بیچ میں اتر آئی لہذا بولی۔

”مجھے اس کام میں کوئی اعتراض نہیں لیکن چوں کہ یہ ایک طرح کی بلیک میلنگ والا کام ہے اور خود میری بھی اس میں عریاں تصاویر ہوں گی اس لیے اس کام کی مناسبت سے پیسے بھی اتنے ہی ہونے چاہئیں؟“ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر بولا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ کیا لوگی؟“

”تمیں ہزار۔“ اس نے اپنا معاوضہ بتایا۔

”میں جہیں چالیس ہزار دوں گا۔“

”چالیس ہزار؟“ اس کی آنکھیں یک دم چمکنے لگیں۔

”ہاں مگر یہ کام بہت محتاط ہو کر کرنا پڑے گا تمہیں۔“

”تم میرے ساتھ تو ہو گے ناں؟“

”ہاں۔ ظاہر ہے تصویریں پھر کون بنائے گا؟“ میں نے کہا۔

”لیکن اس کام کو کر چکنے کے بعد تمہیں یہ شہر ہمیشہ کے لیے چھوڑنا ہو گا۔“ میں نے آخر میں اسے شرط بیان کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ مجھے منظور ہے۔ میں ویسے بھی لاہور جانا چاہتی ہوں۔ یہاں میرا حندہ کچھ خاص نہیں ہے، پھر وہاں میری سہیلیاں بھی ہیں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”تمہارے ہاں رابطے کے لیے کوئی نمبر وغیرہ؟“

”ہاں۔“ وہ بولی پھر اس نے اپنا موبائل نمبر مجھے دے دیا۔ میں نے وہ نمبر اپنے موبائل کی ٹیلی فونک ڈائری میں نوٹ کیا پھر اسے ایک بڑا نیلا نوٹ لٹکایا تو اچانک میرے موبائل کی دنگ گنگنائی۔ میں نے اپنے

موبائل کی اسکرین پر نمبر دیکھا۔ جمعہ خان مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔

”ہیلو۔ جمعہ خان اتم مجھے دس منٹ بعد فون کرنا۔“

یہ کہہ کر میں نے موبائل آف کر دیا۔ اس کے بعد میں نے شاہدہ سے مزید چند منٹ باتیں کیں اور پھر اس کے فلیٹ سے نکل آیا۔ کار میں بیٹھا اسے اشارت کیا پھر آگے بڑھا دی۔ میں آہستہ روی کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ مقصد جمعہ خان کی کال کا انتظار کرنا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی کال آ گئی۔

”ہاں۔ ہیلو اب بتاؤ کیا خبریں ہیں؟“ میں نے موبائل آن کر کے کان سے لگاتے ہی پوچھا۔

”سائیں مٹھا! کام بڑے زبردست طریقے سے پورا کیا ہے۔“

”تفصیل بتاؤں؟“ دوسری طرف سے اس کی جوش میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

”جہیں تم گھر پہنچو، وہیں تفصیل سے بات کرنا۔“

میں نے یہ کہہ کر موبائل آف کر دیا۔ کار سست رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہاتھ میرے اسٹیرنگ پر جھے ہوئے تھے۔ میں نے رست واپس میں وقت دیکھا۔

دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ بالآخر میں نے کار یونی ورسی روڈ کی طرف موڑ کر اس کی رفتار بڑھا دی۔

☆

اگلے ایک گھنٹے میں گھر پہنچا تو روزی ڈیوٹی سے گھر آ چکی تھی۔ میرا آج کام نہیں تھا جو تھوڑا بہت تھادہ میں نے روزی سے کرنے کا کہہ دیا تھا۔

”کن معروفیات میں رہے آج آپ؟“ روزی نے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں۔ بس سڑک گردی کرتا رہا۔“ میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

”خیر ایسی بات بھی نہیں تم بلا وجہ سڑک گردی نہیں کرتے۔ بائی دے دے اپنے پار قار جمعہ خان کو کہاں چھوڑ آئے؟“ اس نے آخر میں مسکرا کر پوچھا۔

”آ رہا ہے۔ اسے میں نے ضروری کام سے بھیجا ہے۔ کھانا لگا دو، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

وہ اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کھانا لگا دیا۔ ہم دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد ہم ذرا قیلولہ کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ روزی کا موڈ اٹھکیلیاں کرنے کا ہو رہا تھا۔ میں جان بوجھ کر سوتا بن گیا۔ وہ بھی سو گئی۔ میں اسے سوتا چھوڑ کر ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے موبائل نکال کر جمعہ خان کے موبائل کا نمبر سچ کیا۔ اس نے بتایا وہ آ رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ وہ چہرے سے ہی خاصا پر جوش نظر آ رہا تھا۔

”پہلے کھانا کھا لو۔“

”نہیں سائیں! میں نے فاسٹ فوڈ کھا لیا تھا۔“

”ارے تو یہاں آ کر ماڈرن ہو گیا ہے؟“

”ہاؤ سائیں مٹھا! یہ شہر ہی ایسا زبردست ہے۔“

”شہر زبردست ہے یا شہر والیاں؟“

”دونوں۔“

”چل فالو باتیں نہ کر۔ کام کی باتیں بتا۔ کیا ہوا آج کی مہم کا؟“

”سائیں مٹھا! پورے سو فی صد مہم کامیاب رہی۔“

”گڈ!۔۔۔۔۔ چل اب آگے بڑھ۔“

”میں نے سب سے پہلے آپ کی دی ہوئی بوتل سے اس کی کولڈ ڈرنک میں دوٹی انڈیل دی۔“ وہ بتانے لگا۔

”وہ سالامیاں صاحب الٹیاں کر کے بے حال ہو گیا۔ طبیعت ذرا سنبھلی تو میں نے آپ کی ہدایات کے مطابق ایک پبلک کال آفس سے اس کے موبائل کا نمبر کھڑکا کر اسے بتایا کہ زہر کی یہ تھوڑی سی مقدار کیسی گئی؟ وہ تو ایک لمحے کوسن ہو کر رہ گیا۔ میں نے فون بند کر دیا۔“

”ابے وہ پی سی او والا تیری باتیں تو نہیں سن رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ابے وہ پی سی او والا تیری باتیں تو نہیں سن رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ابے وہ پی سی او والا تیری باتیں تو نہیں سن رہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔



”نہیں سائیں! میں نے آپ والا خفیہ پولیس کا حربہ استعمال کیا تھا۔ اس نے الگ انتظام کر دیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ آگے بتاؤ۔ دوسرے ٹرپ کا کیا ہوا؟“

”دوسرے ٹرپ میں جب وہ اپنی چھول داری میں بند ڈبے والی خوراک نکالے چرنے بیٹھا تو میں نے ایک پیش کار چھوکرے کے بہروپ میں اس کی چھول داری پہنچ کر اس کے منزل و اثر کی بوتل میں دوبارہ آپ کی دی ہوئی بوتل سے تھوڑی دوائی اغیل دی اور باہر نکل آیا۔ پھر ڈرادر جا کر تماشا دیکھنے کھڑا ہو گیا۔ ایک بار پھر اودم مچ گئی۔ اس پر دوبارہ الٹیوں کا دورہ پڑا۔ میں نے دوبارہ اس کا موبائل کھڑکا دیا۔“

”ایک منٹ۔“ میں نے قطع کلائی کی۔ ”تم نے پھر اس پی سی او سے فون کیا تھا میاں صاحب کو؟“

”نہیں سائیں! دوسرے پی سی او سے فون کیا تھا اور اسے یہی بتایا تھا کہ میں اپنی محبوبہ سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے بات کرنے کے لیے مجھے مستورات والے کمرے میں بھیج دیا مگر مجھے شک تھا کہ کہیں وہ دوسرے سیٹ سے میری باتیں نہ سن لے۔ اس لیے میں نے اسے اجرت خاص دے کر ڈرادر کو باہر ہی کھڑا کر دیا۔ اس بار جب میں نے میاں صاحب کو دوسری کال کر کے دھمکی دی تو اس کی بولتی بند ہو گئی۔ وہ پھر گھر کی طرف بھاگا مگر میں اس سے پہلے ہی اس کے گھر جا پہنچا۔ وہاں میں ٹوہ لینے کے لیے کھڑا ہو گیا پھر تھوڑی سی ہوشیاری کے ساتھ میں اس کے بچکے میں کود گیا۔ اس کی بیوی اپنے دو بچوں اور ایک ملازمہ کے ساتھ موجود تھی۔ وہیں اس کی بیوی نے اپنے شوہر میاں صاحب کا فون ریسیو کیا۔ اس نے شاید اپنی بیوی کو اس کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی کھانا لگا دینے کا کہا تھا کیوں کہ الٹیاں کر کے اس موٹے میاں صاحب کا معدہ خالی ہو چکا تھا مگر اس نے اپنی طبیعت کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا کہ کہیں وہ پریشان نہ ہو

جائے۔ بہر طور یہ میرے لیے بہت اچھا موقع تھا۔ میں اب موقع کی تاک میں تھا۔ بیوی اور ملازمہ کی باتوں سے میں نے فوراً اندازہ لگا لیا تھا کہ صاحب کی پسندیدہ ڈش کون سی تھی؟ پھر میں نے موقع تاک کر بڑی ہی ہوشیاری کے ساتھ صاحب کی پسندیدہ ڈش میں دوائی کی تھوڑی مقدار ڈال دی۔ تھوڑی دیر بعد میاں صاحب اندر داخل ہوئے۔ اس کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔ بیگم نے پریشان ہو کر وجہ پوچھی تو اس نے کام کی زیادتی کا بہانہ بنا دیا۔ تھوڑی دیر بعد یہ سب لوگ کھانے میں مصروف ہو گئے اور میں نے پردے کے عقب سے میاں صاحب کے چہرے پر ایک ایسی زلزلے کے آثار نمودار ہوتے دیکھے تو میں سمجھ گیا دوائی نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ وہ پیٹ پکڑے دورے میں مبتلا ہو گیا۔ جیسے ہی بھگکڑ بگی میں وہاں سے نظریں ہچا کر نکل آیا۔“

جمعہ خان نے اپنی آج کی کارگزاری کی رپورٹ دی جو بھرپور طور پر کامیاب ثابت ہوئی۔ میں نے فرط جوش سے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔ میری شرباشی پر اس کا سینہ فخر سے پھول جایا کرتا تھا۔ میں نے واپس اپنی جگہ بیٹھ کر اس سے کہا۔

”ابھی میاں صاحب کے لیے اتنی ڈوز کافی ہے۔ اب ذرا الف خان کے ساتھ بھی تمہیں ہی ٹوپی ڈراما کرنا ہوگا۔ ٹھیک۔“

”حاضر سائیں! آپ بے فکر رہو۔“ وہ سعادت مند مستعدی سے بولا۔

☆

گلے روز میں نے یونیورسٹی اینڈ کرنے کے بعد اپنی رہائش گاہ پر آیا۔ سب سے پہلے اپنا ڈتالیس بور والا ریوالور اٹھایا پھر ایک زوم لینس والا کیمرا اٹھا کر کار میں بیٹھا اور سیدھا شاہدہ کے قلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ جمعہ خان صبح ہی الف خان کے پیچھے ہاتھ دھو کر

پڑنے کے لیے نکل چکا تھا۔

میں نے دوران ڈرائیونگ شاہدہ سے موبائل پر بات کی۔ وہ اپنے قلیٹ پر ہی موجود تھی۔ میں نے اسے آج سارا دن اور رات تک الرٹ رہنے کو کہا۔ اس کے بعد موبائل آف کر دیا اور کار خیابان سوسائٹی کی طرف موڑ دی۔ میں نے رستہ و اج میں وقت دیکھا۔ سب پہرے کے تین بج رہے تھے۔ خیابان کے قریب پہنچ کر میں نے سب سے پہلے اریب قریب کا ایک معروف اور نسبتاً اچھا ریستورنٹ تلاش کیا۔ اس کے بعد اس کے پارکنگ شیڈ میں کار کھڑی کر کے نیچے اتر آیا۔

دیٹر کو میں نے کوئلہ ڈریک اور سینڈوچ لانے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ یہ دونوں اشیائے خوردونوش میری میز پر سرود کرنے کے بعد چلا گیا۔ میں کھانے میں مشغول ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے موبائل پر جمعہ خان سے رابطہ کرنے کا ارادہ کیا مگر پھر یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ جانے وہ کسی جگہ اور کسی موقع پر الف خان کی گھات لگائے بیٹھا ہو؟ موبائل کی رنگ ٹون معاملہ ہی نہ خراب کر دے۔ یوں تو میں نے اسے ہدایت کر رکھی تھی کہ ایسے کسی حساس موقع پر اپنا موبائل آف ہی رکھے اور بعد میں خود ہی مجھ سے رابطہ کر کے صورت حال سے آگاہ کرتا رہے۔

اتنے میں دیٹر آیا تو میں نے اسے بل کے ساتھ بھاری ٹپ سے نوازا تو وہ چاروں شانے چت ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا۔

”اگر میں چند گھنٹوں کے لیے اپنی کار اوپر ہی چھوڑ جاؤں تو.....“ میری بات پر دیٹر ڈرادر کو کچھ سوچتا بن کر بولا۔

”کون سی کار ہے آپ کی؟“

میں نے کھڑکی کے شیشے سے پار اپنی نیا لے رنگ کی کرولا کی طرف اشارہ کیا اور اسے کار کا نمبر بھی بتا دیا۔ جب وہ سر ہلا کر موڈ بانہ انداز میں بولا۔

”ٹھیک ہے جناب! آپ جائیں، ویسے کار نہ لے جانے کی کوئی خاص وجہ؟“ اس نے اچانک آخر میں پوچھا تو میں کھسیانی سی مسکراہٹ سے بولا۔

”میں اپنے جس دوست سے ملنے جا رہا ہوں وہ ذرا لپچڑ قسم کا ہے۔ میری کار دیکھ کر سیر سپاٹے کی خواہش کا اظہار کر ڈالے گا۔“

”اچھا اچھا۔ سمجھ گیا جی۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں خیال رکھوں گا۔“ دیٹر نے موڈ بانہ لہجے میں کہا اور میں مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد پیدل ہی مسجد رضا احتشام کی کوشی تک چل پڑا۔ میں نے نقلی داڑھی مونچھیں لگا کر کسی حد تک اپنا چہرہ بدل لیا تھا۔

مجھے رضا احتشام کے خلاف جو چال چلنا تھی اسے میں ایکشن سے پہلے پہلے انجام تک پہنچانے کا محکم ارادہ کر رکھا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ میں اسے جسمانی موت سے پہلے سیاسی موت مارنا چاہتا تھا۔ میرے مرحوم بابا جانی کے ساتھ بھی اس خبیث نے ایسا ہی کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ رضا احتشام جیسے بے ضمیر انسانوں کے لیے سیاسی موت کس قدر گھناؤنی ہوتی ہے، چنانچہ مجھے آج اپنے مشن کو ہر حال میں پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا۔

دشمنوں کے معاملے میں انہیں زیادہ ڈھیل دینے کا قائل نہ تھا، اس لیے میں نے بہ یک وقت ان کے خلاف خفیہ محاذ شروع کر رکھا تھا۔ ایک طرف میں رضا احتشام کی بیخ کنی کے لیے جتا ہوا تھا تو دوسری طرف جمعہ خان اس خبیث پروڈیوسر میاں صاحب اور الف خان کے خلاف مصروف کار تھا۔ میرا ارادہ ان دونوں کو جہنم واصل کرنے کے بعد ستارہ اور تارا بیگم سے بھی نمٹنے کا تھا مگر میں سب سے پہلے اس ناگن کے ان دونوں مذکورہ زہر مہروں کو نابود کرنا چاہتا تھا۔

بہر طور میں یہ ظاہر مٹر گشت کے انداز میں ٹھٹھا ہوا رضا احتشام کی عالی شان کوشی کے قریب سے گزرنے لگا۔



اپنے خاندان کے قاتل اور اڑی دشمن کی کمین گاہ کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک میری رگوں میں دوڑتا ہوا لہو مسل لاوے کی طرح اچھالیں مارنے لگا۔ میں نے اپنی ابلتی کھولتی کیفیات آتش فشانی پر بہ مشکل قابو پایا اور کوشی کے گرد و پیش کا کن انکھیوں سے جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

کوشی کے آس پاس ویرانی کا راج تھا۔ مجھے مایوسی ہونے لگی۔ میں سوچنے لگا کہیں یہ مردود رضا احتشام کوٹھ تو نہیں چلا گیا، مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ بہ یک وقت کئی حلقوں سے پارٹی کے لیے ایکشن لڑ رہا تھا۔ اخبارات اور دیگر تجزیہ نگاروں کی تازہ ترین رپورٹس کے مطابق رضا احتشام نے اپنے خاص الحاس آدمیوں کو پارٹی ٹکٹ دلو کر اپنے چند مخصوص حلقوں پر کھڑا کر دیا تھا۔ انتخابی مہم کے دوران وہ ان حلقوں میں جا کر جلے جلوس منعقد کرتا رہتا تھا، مگر اس بار وہ خود کراچی ہی کے ایک بڑے حلقے سے کھڑا ہوا تھا۔ یہاں اس کی کامیابی یقینی تھی بلکہ اس کی کیا اس کی پارٹی کی کامیابی بھی سو فی صد تھی۔ رضا احتشام تو ابھی سے ہی خود کو مسید اقتدار دیکھنے لگا تھا۔ اس بار وہ سی ایم بننے کا خواب دیکھ رہا تھا جس کا اسے پورا یقین بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب مستقل طور پر کراچی میں ہی رہنے لگا تھا، لیکن اس وقت میں نے اس کی کوشی پر ویرانی کا راج دیکھا تو یہی سمجھا کہ ہو سکتا ہے وہ کہیں باہر اپنی سیاسی مہم پر نکلا ہو۔ میں وہیں سے پلٹنے کی بجائے ایک طویل چکر کاٹ کر دوبارہ اسی ریسٹورنٹ کے قریب آ گیا جدھر میری کار کھڑی تھی۔ میں اپنی کار میں بیٹھا اسے اشارت کیا اور باہر سڑک پر آ گیا۔ اسی اثنا میں جمعہ خان کا فون آ گیا۔ ”ہاں، کہو کیا رپورٹ ہے؟“ میں نے کار کی رفتار ہلکی کرتے ہی پوچھا۔

”سائیں مٹھا! میں تھانے میں ہوں۔“ دوسری

طرف سے جمعہ خان کی سنسناتی ہوئی آواز لہجہ بھری۔ ”دھت تیرے کی۔“ میرے منہ سے کچھ بھلا ہٹ آ میرا انداز میں نکلا تھا۔

”کس تھانے میں ہو؟“ میں نے پوچھا۔ اس نے مجھے تھانے کا بتایا۔

”تو عیت کیا ہے؟ کیوں گرفتار کیا؟“

”سائیں مٹھا! بس ایک پولیس والے سے منہ ماری ہو گئی تھی۔“ اس نے بتایا۔

”الف خان والا معاملہ تو نہیں؟“

”نہیں سائیں!“ دوسرا معاملہ تھا۔ اس نے بتایا اور بے اختیار میں نے اطمینان کی سانس لی۔

”اچھا میں پہنچ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے کار آگے بڑھا دی۔ متعلقہ تھانے پہنچا تو جمعہ خان کو تھانہ انچارج نے مرعابہ رکھا تھا۔ جمعہ خان کی یہ مجھ تک خیر حالت دیکھ کر میں نے بڑی مشکلوں سے اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔ تھانے دار بڑی بڑی مونچھوں والا بڑا خزانہ آدی نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر سنجیدگی امنڈاتے ہوئے سب سے پہلے جمعہ خان کو سیدھے کھڑے ہونے کا کہا۔ وہاں دو سپاہی بھی الرٹ پوزیشن میں موجود تھے۔

”تم کون ہوتے ہو یہاں حکم دینے والے؟“ تھانے دار نے میری وضع قطع سے مرعوب ہوئے بغیر غصیلے لہجے میں مجھ سے کہا۔

میں نے اپنا سر دس کارڈ نکال کر اسے دکھایا اور اپنا تعارف بھی کر دیا، تب کہیں جا کر اس کے کرسٹ چہرے کے تاثرات ذرا ماند پڑے تو اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا کہا۔

”کیا قصور کیا ہے اس نے؟“ میں نے تھانے دار کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے پرمٹانت لہجے میں پوچھا۔

”اس نے ایک راہ چلتی عورت کو چھیڑنے کی کوشش

”الف خان مردود نے ستارہ سے تعلقات بنار کھے ہیں۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”تو نے اتنے کم وقت میں کیسے یہ اندازہ لگالیا؟“

وہ اتراتے ہوئے فلسفیانہ لہجے میں بلالا۔

”سائیں مٹھا! جس طرح ایک چاول سے پوری دیک کا پتا چل جاتا ہے بالکل اسی طرح۔“

”ابے فلسفہ چھوڑ کام کی بات کر۔“

”جی، جی۔۔۔۔۔ سائیں مٹھا! وہ دراصل میں جب الف خان کی سون لینے اس کی رہائش گاہ پہنچا تو میں نے دونوں کوسنگل ڈور بجیر دے اترتے دیکھا تھا پھر وہ اندر چلے گئے۔ الف خان دولت مند ضرور ہے مگر حیرت کی بات ہے اس نے صرف ایک پٹھان چوکیدار رکھا ہے جو بہ یک وقت کن مین بھی ہے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور میں نے سوچا کہ پہلے آپ کو یہ تازہ صورت حال سے آگاہ کر دوں۔ ابھی میں ذرا پرے کھڑا اس شش دہج میں جھلا تھا کہ اچانک ان دونوں کے بیچلے میں جاتے ہی ذرا ہی دیر بعد ایک فیشن اہل مگر موٹی تازی عورت کو لمبے منکاتی ہوئی ہاتھ لگی۔“

”اور تو اس کے تھل تھل کرتے کولہوں کو تازہ اس کے پیچھے ہولیا اور تجھے پولیس نے گردن سے پکڑ لیا۔“

”جی ناں؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر طنز یہ لہجے میں کہا تو وہ کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”نہیں سائیں مٹھا! اب آپ مجھے کیا ایسا سمجھتے ہو۔“

خیر میرا مقصد اس کی ٹوہ لیتا تھا جو ظاہر ہے اس سے ملے بغیر ممکن نہ تھی چنانچہ جب میں نے اس سے ہم کلام ہونے کی کوشش کی تو قریب سے گزرتے ہوئے دو شہنشی پولیس والوں کو اس حرام زادی نے مدد کے لیے بلا لیا۔ ”جمعہ خان نے آخر میں بڑبڑاتے ہوئے اسے دانت پیس کر کوسا۔“

وہ اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو میں کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ تب پھر اچانک ایک سنسناتا

ہوا خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے دماغ میں آن وارد ہوا اور میں نے اس سے پوچھا۔

”جمعہ خان! تیرے پاس میری دی ہوئی بوتل ہے؟“

”ہاؤ سائیں!“ اس نے فوراً Emetic کے محلول والی بوتل اپنی جیب سے نکال کر مجھے دکھائی۔

”میں اس کی بات نہیں کر رہا۔۔۔۔۔ وہ سائینڈ والی؟“

”ہاؤ سائیں! وہ تو میرے پاس موجود ہے، مگر وہ تو ویسے ہی سیل پیکٹ ہے اس کی ابھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“

”اب اس کی ضرورت پڑے گی ہمیں۔“ میں اسٹیرنگ پر ہاتھ جماتے ہوئے اسرار بھرے لہجے میں بولا اور جمعہ خان ہونقوں کی طرح میرا چہرہ ٹکنے لگا۔ میں نے کار کی رفتار یک دم بڑھا دی۔

ٹھیک گھنٹے بھر بعد ہم الف خان کے بیچلے والے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہ ایک پوش علاقہ تھا۔ جدھر زیادہ تر متمول لوگ رہائش پذیر تھے۔ میں نے جمعہ خان سے الف خان کے بیچلے کا مکمل وقوع پوچھا اور پھر کار اس کے بیچلے کے عقبی گوشے میں کھڑی کر کے نیچے اتر آیا۔ جمعہ خان نے بھی فوراً میری تھلید کی تھی۔ میں نے کار کو لاک کیا اور پھر جمعہ خان کو مختصر اپنے لائحہ عمل کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ میں اب کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

بہر طور ہم دونوں چلتے ہوئے بالآخر الف خان کے بیچلے کے سامنے والے حصے کی طرف آ گئے۔ وہ بنگلہ خاصے وسیع قطعہ اراضی پر محیط تھا اور مجھے حیرت تھی کہ اتنے وسیع و عریض بنگلے میں الف خان یوں تنہا کس طرح اپنی لعنتی زندگی بسر کیے ہوئے تھا؟ بنگلے کے گیٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے گیٹ کی طرف دیکھا۔ خان ٹائپ کا چوکیدار ڈبل ہیرل بندوق سنہالے کھدو کے ملایشیا کی شلوار قمیص



کی تھی۔“ تھانے دار نے بھیگی ملی بنے کھڑے جمعہ خان پر ایک غصیلی نگاہ ڈال کر مجھ سے کہا۔  
 ”یہ ایسا ہے تو نہیں لیکن آپ کہہ رہے ہیں تو جی ہی ہوگا۔“ میں نے گوگو سے لہجے میں اس سے کہا۔  
 ”بہر حال میں اس کی طرف سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ اسے چھوڑ دیں۔“  
 ”او جی آپ کون ہوتے ہیں ہمیں حکم دینے والے؟“ میری بات پر موٹے تھانے دار کی خراٹ مزاجی دوبارہ ناک کی پھنک پر آدھری۔  
 ”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ میں نے ہولے سے کھنکھار کر کہا۔ ”میں تو آپ سے درخواست کر رہا تھا۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب سے والٹ نکالا اور اندر موجود بڑے نیلے نوٹ گننے لگا پھر دزدیدہ نظروں سے تھانے دار کی طرف دیکھا۔ اس کی حریصانہ نظریں میرے والٹ پر جمی گئی تھیں۔  
 ”آپ اتنے مہربان ہیں تھانے دار صاحب کہ جی چاہتا ہے آپ کے ساتھ بھرپور لٹچ کیا جائے۔ ویسے بھی یہ کھانے کا وقت ہے۔ ذرا اچھی سی مرغ بریانی، ٹکے اور کولڈ ڈرنک منگو لیجیے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے ایک ہزار کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ نوٹ جھپٹتے ہوئے ندیدے پن سے چھینیں نکالتے ہوئے بولا۔  
 ”ابھی اس کی کیا ضرورت ہے، آپ اپنا بندہ لے جائیں۔“  
 پھر وہ اپنی موٹی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میرے والٹ کو گھور کر بولا۔  
 ”ویسے یہ ہزار کا نوٹ تو مجھے ہی کافی ہو جائے گا میرے ساتھ دو سوا ہی بھی ہیں۔“  
 میں نے دانستہ شروع میں ہی ہاتھ ہلکا رکھا تھا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ یہ اور کا بھی تقاضا کرے گا لہذا میں نے ایک دوسرا بڑا نیلا نوٹ بھی نکال کر اسے تھما دیا اور جمعہ خان کو لیے باہر آ گیا۔

”ابے تو یہاں آ کر لچر کب سے بن گیا ہے۔“ بول!“  
 میں نے تھانے کے احاطے میں کھڑی اپنی کار کے قریب آ کر جمعہ خان کو دانت پیستے ہوئے گھر کا۔ وہ سخت شرمندہ نظر آ رہا تھا تاہم پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔  
 ”سس..... سائیں مٹھا! میں ایسا ہرگز نہیں ہوں۔ وہ تو..... وہ عورت ہی حرافہ تھی۔“  
 ”وہ حرافہ تھی تو تو کیوں اس کے ساتھ ذرا ذہن کر اپنی لمبی گردن کے ساتھ گلے کو آگیا۔“ میں نے ذانت بچھنچ کر کہا۔ وہ سخت خفت محسوس کر رہا تھا۔  
 ”بس سائیں! غلطی ہو گئی۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ پھر ہم دونوں کار میں بیٹھ گئے۔  
 ”جمعہ خان! اب کام کی بات کر..... کیا ہوا..... الف خان کا؟“  
 ”سائیں مٹھا! الف خان تو رٹو وا ہے، اس کی کوئی اولاد بھی نہیں۔ وہ اپنے بچکے میں تہا رہتا ہے۔ بہت عیاش فطرت انسان ہے۔ فلم کے لیے سرمایہ دیتا ہے اور..... اور.....“ وہ کچھ کہتے کہتے اچانک رک گیا۔ اس کی پھر کی طرح چلتی ہوئی زبان کو اچانک بڑیک لگ گئے تو میں نے اس سے کہا۔  
 ”آگے بکو، رک کیوں گئے؟“ میں نے اسے گھر کا۔ میں کار تھانے کے احاطے سے باہر لے آیا تھا۔  
 ”سائیں مٹھا!..... آگے بتانے کی ہمت نہیں ہو رہی۔“ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا اور زہریلے لہجے میں بولا۔  
 ”دیکھو جمعہ خان! ستارہ جیسی ناگن سے نہ ہمارا پہلے کوئی تعلق تھا نہ اب ہے، پھر وہ اب ہماری دشمن ہے۔ بتاؤ کیا اس کے الف خان کے تعلقات.....“  
 ”جی سائیں! یہی بات ہے۔“ اس کی جیسے میں نے مشکل آسان کر دی۔  
 ”تفصیل بتاؤ۔“

میں ملفوف بیٹھا اور گھر ہاتھا۔  
 ”سائیں مٹھا! لگتا ہے اس پٹھان بھائی نے زیادہ ہی نسوار کی چنگی بھری ہے۔“  
 جمعہ خان نے ہولے سے میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اپنے چلنے کی رفتار دہمی کرتے ہوئے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ آس پاس کسی ذی نفس کو موجود نہ پا کر میں نے جمعہ خان سے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔  
 ”جمعہ خان! تمہیں پورا یقین ہے ناں کہ اندر الف خان اور ستارہ ہی ہیں؟“  
 ”ہاؤ سائیں! تھوڑی دیر پہلے کی یہ بات ہے۔ اب کام میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ وہ جوابا بولا۔  
 ”اچھا ٹھیک ہے۔ اب ذرا احتیاط رہنا۔ ہم نے بچکے کے اندر داخل ہونا ہے۔“  
 ”برابر سائیں! میں تیار ہوں۔“ وہ مستعدی سے بولا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے مطلوبہ گیٹ کے بچکے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ خان چوکیدار شاید کھٹکے کی نیند سویا تھا۔ آہٹ پاتے ہی اس نے فوراً ہڑبوا کر آنکھیں کھول دیں۔  
 ”ادے خوچہ کس سے ملتا ہے تم لوگوں کا؟“  
 ”خان چاچا! تمہارے ہی خان صاحب (الف خان) سے ملتا ہے۔ کیا وہ اندر موجود ہیں۔“ میں نے کہا۔ وہ بڑی خراٹ نظروں سے ہم دونوں کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔  
 ”تم کو صیب سے کس سلسلے میں ملتا ہے؟“  
 ”ہم فلم بنانے والے ہیں خان صاحب اور ستارہ بی بی نے ہمیں مشترکہ طور پر اس بچکے میں ملاقات کا وقت دے رکھا تھا۔ اگر وہ دونوں اندر دوسرے لوگوں کے ساتھ مصروف ہیں تو پھر ہم کسی اور وقت آ جائیں گے؟“ میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑتے ہوئے کہا اور دایہ کی لیے پلٹنے کا تو یک دم بولا۔

”خوچہ! ٹیرو ذرا..... اندر ویسے تو ستارہ بی بی اور خان صیب کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ میں ابھی اندر بتا کر آتا ہوں۔ تم ادھر ہی.....“  
 میں جو جانا چاہتا تھا وہ جان چکا تھا اس لیے میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی اس کی رگ حساس مسل ڈالی۔ اسے ایک کونے کی گھٹی جھاڑی میں لمبا ڈال کر ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔  
 سامنے مرکزی دروازہ تھا جو حسب توقع اندر سے کھلا ہوا تھا۔ ہم دونوں آگے آگے سے کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ سامنے ہی ایک ڈرائنگ روم کے طرز کا سچا سجایا کمر تھا۔ میں نے اور جمعہ خان نے اپنی اپنی پستولیں نکال لی تھیں۔  
 دوسرے کمرے سے کھٹکناقی ہنسی کی آوازیں اور شیم غنودہ باتیں ابھر رہی تھیں۔ ان شناسا آوازوں پر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ دونوں لعین دلعون الف خان اور ستارہ اندر رنگ رلیوں میں مشغول تھے۔ میں اور جمعہ خان مذکورہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ میں نے بہ آہستگی دروازے کو اندر کی طرف دھکیلتا چاہا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے جمعہ خان کو اپنی آنکھیں اچکا کر مخصوص اشارہ کیا اور پھر دروازے پر ہلکی سی دستک دے ڈالی۔  
 ”کون ہے؟“ اندر سے شیم غنودہ ہی آواز ابھر رہی تھی۔  
 ”صیب جی! میں ہوں..... باہر کوئی خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں۔“  
 میں نے حتی المقدور خان چوکیدار کے لہجے جیسی آواز میں کہا اور الف خان جیسے عیاش طبع شخص کے لیے دانستہ خاتون کا لفظ استعمال کیا تھا۔  
 ”کون ہے وہ عورت!“  
 ”صیب جی! اگر آپ حکم کریں تو اسے اندر ہی بھیج دوں؟“  
 ”بھیج دو۔“ میری آنکھیں چمک اٹھیں پھر لمحہ بیتنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اندر سے دروازے کی



پھانسی

فرانس کے بادشاہ لوئی دہم نے اپنے دلیر مال کو اس کی موت کے بعد اس جرم میں پھانسی کی سزا دی تھی کہ اس نے سرکاری خزانے کی رقم خود برد کی تھی موت کے چار روز بعد مجرم وزیر مال کی لاش قبر سے نکال کر اس کو پھانسی دی گئی تھی۔

الف خان کی آنکھیں حلقوں سے باہر اٹھ آئی تھیں۔ اس کے چہرے پر آن کی آن میں موت کی دروی کھل آئی تھی۔ وہ اپنا گلا پکڑے اٹھ کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے کی طرف دوڑا مگر زہریلے اثرات نے اسے دروازے تک پہنچنے ہی نہ دیا۔ وہ قالین پر جا گرا۔ اس پر شدید جان کنی طاری تھی پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا وجود بری طرح اٹھنے لگا اور وہ ساکت ہو گیا۔

ستارہ پر بری طرح دہشت طاری تھی۔ الف خان جو میرے بابا جانی کے قتل کی سازش کا ماسٹر مائنڈ تھا بلا آخر جہنم واصل ہو چکا تھا۔

”سائیں مشا! اب اس ناگن کا بھی کام تمام کر دیا جائے۔“ معاً جمعہ خان نے ڈری سبھی ستارہ کو گھورتے ہوئے مجھ سے کہا اور ستارہ ہراساں لگا ہوں سے میرے چہرے کی طرف ہنسنے لگی۔

اچانک باہر دوڑتے قدموں کی آواز ابھری۔ میں بری طرح چونک گیا پھر ابھی میں سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ دروازہ دھڑ سے کھلا۔ اندر داخل ہونے والے شخص کو دیکھ کر میں ایک لمحے کو سناٹے میں آ گیا۔ وہ بھی مجھے وہاں پا کر اپنی پھٹی پھٹی اور غیر یقینی نظروں سے میرے چہرے کو تنگے جا رہا تھا۔ گویا ہم دونوں کو ہی اس بات کی توقع نہ تھی کہ ہم دونوں کا اس طرح اور بالکل غیر متوقع طور پر بھی سامنا ہو سکتا ہے۔

(جاری ہے)

لگتے زدہ لہجے میں ستارہ کو گھورتے ہوئے بولا۔  
”س..... ستارہ!..... یہ..... یہ..... یہ تو کیا کر رہی ہے؟ ت..... ت..... ت..... تو تم..... مجھے نہ ہر نہیں دے سکتی؟“

”کیوں رہے ذلیل انسان! جب تو نے اسے میرے بابا جانی کو زہر دینے کی ترغیب دی تھی اس وقت تو نے یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ ہاتھ تجھے بھی زہر پینے پر مجبور کر سکتے ہیں؟“ میں نے آتش غیظ میں چلتے ہوئے اس سے کہا اور پھر پھر جمعہ خان کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ تو جیسے پہلے ہی میرے حکم کا منتظر تھا۔ فوراً حرکت میں آیا اور الف خان کے ہل بھر میں کس بل ایک کر دیے۔ ستارہ کو میں نے پھر خوں ناک نظروں سے گھورا۔ وہ تو پہلے ہی مجھ سے بری طرح خائف رہتی تھی اور پھر اس زہریلی سازش کے بے نقاب ہوتے ہی اس کی حالت اور بھی غیر ہونے لگی تھی۔ وہ فوراً آگے بڑھی۔ جمعہ خان اپنے ایک ہاتھ کا آہنی پنجہ الف خان کے جبروں میں گاڑ کر اس کا منہ کھولے ہوئے تھا۔ ستارہ نے آگے بڑھ کر پیگ الف خان کے کھلے دہن سے لگا کر الٹ دیا۔ الف خان نے مچلنے کی کوشش کی مگر وہ جمعہ خان جیسے گوشت اور مضبوط پہاڑ کے زیرِ دبا تھا۔ ایک انچ بھی ہلنے جلنے سے قاصر.....

الف خان کو غوطے بھی لگے اور ٹھکے بھی۔ کچھ شراب باجھوں سے باہر بھی گری مگر میری یہ غور نظروں نے دیکھا اور مجھے طمانیت ہوئی کہ زہریلی شراب کی کافی مقدار اس کے معدے میں پہنچ چکی تھی۔

”اسے چھوڑ دو اور اب اس کے تڑپنے کا منظر دیکھ۔“ میں سرد اور سفاک لہجے میں بولا تو جمعہ خان نے اسے چھوڑ دیا۔ ستارہ غر حال سی ہو کر صوفے پر گر گئی تھی۔ الف خان اپنا گلا پکڑے دہرا ہو گیا۔ سائنائیڈ زہر کا ایک قطرہ ہی انسان کو ہل بھر میں کسی سانپ کی طرح ڈس کر لگوں میں موت سے ہمکنار کر ڈالتا ہے۔

دھرے ریفریجریٹر کی طرف بڑھنے لگی تو اچانک میں نے کسی خیال کے تحت اسے روک دیا۔ دودھ جیسی چیز میں زہر ملانا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ سامنے ایک شیشے کی ٹاپ والی میز پر شراب کی ادھ بھری بوتل اور دو پیگ دھرے ہوئے تھے۔ میں نے ستارہ کو ایک پیگ بنانے کا حکم دیا۔ اس نے فوراً سوڈا واٹر اور آئس کیوب پیگ میں ڈال کر شراب کی بوتل انڈیل دی۔

اس کے بعد میں نے جمعہ خان کو اشارہ کیا اس نے اشارہ بھانپتے ہی فوراً اپنی جیب سے سائنائیڈ (زہر) کی چھوٹی شیشی نکال کر مجھے تھمائی۔ میں نے بہ احتیاط اس کی سیل کھولی اور چند قطرے پیگ میں انڈیل دیے۔ الف خان پھٹی پھٹی نظروں سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کے سیاہ بدبخت ہونٹ کپکپا رہے تھے مگر اس میں کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔ پھر میں نے غیظ آلود لہجے میں ستارہ کو گھورتے ہوئے تھکنا نہ کہا۔

”چل اے ناگن! جس طرح تو نے اس غبیٹ کتے کے کہنے پر میرے بابا جانی کو زہر دیا تھا۔ اب تو اسے بھی زہر دے..... چل.....!“  
میرے اس لرزہ خیز حکم پر ستارہ ایک لمحے کو سن ہو کر رہ گئی۔ الف خان چلا اٹھا۔

”ی..... ی..... ی..... یہ..... ت..... تم..... کک..... کیا..... کر رہے ہو؟“  
میں نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر غصیلے لہجے میں گم صم کھڑی ستارہ سے کہا۔  
”تو نے سنا نہیں میرا حکم ناگن! ورنہ یہ زہر تجھے پینا ہوگا۔ اب اگر تو نے ایک لمحے کی بھی تاخیر کی تو.....“  
میری قطعیت بھری تہدید پر ستارہ جیسے چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آئی اور اس نے وہ شراب کا زہریلا پیگ اٹھا لیا اور الف خان کی طرف بڑھی۔ الف خان کے چہرے پر پیلا ہٹ پھیل گئی اور

چٹکی کھانے کی آواز ابھری۔ دروازہ ذرا ہی کھلا تھا کہ میں نے اسے زور سے دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے الف خان ہی تھا جسے میں نے گردن سے دبوچ لیا۔ اس نے شراب پی رکھی تھی۔ وہ کچھ نہیں سمجھ پایا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ حتیٰ کہ وہ مجھے پہچان بھی نہ پایا تھا، البتہ سامنے فیملی صوفے پر براجمان ستارہ کے حلق سے ضرور ایک تیزی اضطرابی چیخ خارج ہوئی تھی۔ وہ دہشت زدہ ہو کر انہی تو میں نے چلا کر جمعہ خان سے اسے دبوچنے کو کہا۔ جمعہ خان تو جیسے حکم کا منتظر تھا۔ اس نے کسی شکاری بازی کی طرح ستارہ کو دبوچ لیا۔ الف خان بالکل ہی نشے میں ٹن ہو رہا تھا۔ اس کا نشہ اس وقت ہرن ہوا تھا جب میں نے اس کی کپٹی پر گھونسا رسید کیا تھا۔ وہ بھینس کی طرح ڈکراتا ہوا صوفے پر جا گرا تھا۔ ستارہ کو جمعہ خان چھوڑ چکا تھا کیوں کہ وہ بے ہوش ہو چکی تھی

الف خان اب صوفے پر پڑا ہانپ رہا تھا اور وہ اب مجھے پہچاننے کے بعد خاصا خوف زدہ بھی نظر آ رہا تھا۔ رہی سہی کسر میرے اور جمعہ خان کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خوف ناک پستولوں نے پوری کر دی تھی۔ میں نے اس کی پیشانی پر اپنے پستول کی سرد نال رکھ دی اور غیظ جنوں والے لہجے میں غرا کر بولا۔

”کتے! مجھے پہچان لے اچھی طرح میں اس بلفصیب باپ کا بیٹا ہوں جسے تو نے ستارہ کے ذریعے زہر دلو کر مار ڈالا۔ اب دیکھ میں تجھ سے کیسا انوکھا انتقام لیتا ہوں۔“  
اس اثنا میں ستارہ کو ہوش آچکا تھا کیوں کہ وہ مکمل طور پر بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ وہ صرف نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ میں نے ستارہ کو خوں ناک نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”دودھ کا گلاس لاؤ..... جلدی!“ میری خونی نظروں اور غضب ناک لہجے نے اسے بری طرح سراپیمہ کر رکھا تھا۔ وہ جلدی سے انہی اور قریب